اکتوبر 2017

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ



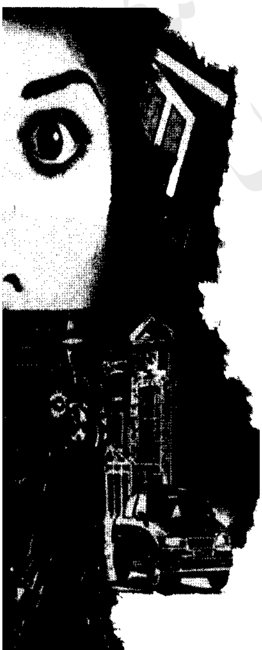
دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

بانی: محمود ریاض
مدیر اعلیٰ: عامر محمود
منتظم: محمد شفیع

MEMBER APNS | رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
CPNE | رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز





۞ 2017 ۞ قیمت -/40 روپے ۞ جلد 47 ۞ شمارہ 06

142 — رفعت رضا
گڑیا
ایک جوڑے کے کشیدہ تعلقات کے
معمول پر آنے کا دلچسپ قصہ

152 — ساحل علی
اے ارض وطن
وطن کے لیے جان قربان کرنے
والوں کی ایک دل گداز تحریر

160 — شگفتہ پروین
مقدر کا سکندر
اس کہانی کو پڑھ کر آپ قہقہہ لگانے
پر مجبور ہو جائیں گے

174 — کاشف زبیر
شہزادہ بد بخت
آپ کے جانے پہچانے مشہور کردار جلیل
کے ساتھ پیش آنے والا دلچسپ واقعہ

186 — غلام قادر
جرم وفا
دل کا خون کرنے والے اس مجرم کا
قصہ جو دھرتی کا بھی مجرم تھا

208 — محمود عالم
آنکھ مچولی
ایک شخص کو قتل کرنے کی کوشش
کا دلچسپ اقوال

214 — نشو ہادی
مقدس راز
دو دوستوں کے درمیان دوری اور نزدیکی
کے خفیہ معاملات پر ایک سبق آموز تحریر



آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 - اردو بازار، کراچی

زندہ مورتی

ایم۔اے۔ راحت

چوتھی قسط

ایم اے راحت اردو ادب کے چند بڑے ناموں میں سے ایک نام ہیں، آٹھ سو سے زائد ناولوں کے لکھاری، کالا جادو، ناگ دیوتا، کمند، کالے گھاٹ والی کفن پوش، صندل کے تابوت ان کی دیو مالائی تخلیقات ہیں۔

انہوں نے بچوں کے لیے بھی بے شمار کہانیاں لکھیں۔ جب کہ تلفظ اور املا کے ساتھ ایسی لفاظی کی کہ بچے باآسانی پڑھ کر ان کے گرویدہ ہوئے۔

عمران ڈائجسٹ کے لیے بطور خاص انہوں نے ایک اچھوتی تحریر لکھی ہے جو وہ اپنی زندگی میں مکمل کر کے گئے تھے جو یقینا عمران ڈائجسٹ ایک اچھا اضافہ ثابت ہوگی۔

قارئین عمران کے لیے ایم اے راحت کی طرف سے ایک خاص تحفہ





کلب تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ پارکنگ کا احاطہ بہت بڑا تھا۔ آگے خوب صورت دروازے لگے ہوئے تھے۔ میں ان دروازوں میں سے ایک میں داخل ہو گیا۔ استقبالیہ پر ایک خوب صورت سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں آگے بڑھا تو لڑکی نے مجھ سے کہا۔

"جی سر۔۔۔ کیا خدمت کر سکتی ہوں میں آپ کی۔۔۔"

"تمبولا اینڈ فلیش کلب۔۔۔" میں نے کلی رومزکی لسٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا اور اس لڑکی نے ایک جانب میری رہنمائی کی۔۔۔ اور میں اس کی رہنمائی میں اس کلب میں داخل ہو گیا۔ اندر ایک بڑا ہال تھا' اس ہال میں دو کاؤنٹر بنے ہوئے تھے' دائیں جانب کاؤنٹر کے پیچھے شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔۔۔ دوسری جانب کے کاؤنٹر پر دو خوب صورت لڑکیاں کھڑی تھیں' لوگ نقد پیسے دیتے اور بدلے میں وہ پلاسٹک کے ٹوکن ان کو تھما دیتی۔۔۔ میں اسی کاؤنٹر کی جانب بڑھا۔۔۔ ایک صاحب میرے سامنے وہ ٹوکن لے رہے تھے۔

"ہزار کے پچاس۔۔۔" اس آدمی نے کہا اور نقد رقم ایک لڑکی کو تھمائی۔۔۔ لڑکی نے ایک ٹرے میں پچاس ٹوکن جن کا رنگ ہرا تھا۔۔۔ اور ٹرے اس آدمی کو دے دی' آدمی ٹرے لے کر آگے بڑھ گیا۔۔۔ پھر میں نے ایک اور شخص کو دیکھا۔

اس شخص نے اپنی ٹرے میں سے ٹوکن نکال کر لڑکی کو دیے۔ اور لڑکی نے پیسے گن کر اسے واپس کر دیے۔۔۔ وہ آدمی پیسے گن کر لے گیا تھا۔۔۔ میں اس جگہ کا طریقہ کار سمجھ گیا تھا۔۔۔ میں ٹوکن خریدے بنا آگے بڑھ گیا۔ پھر میں مختلف میزوں کا جائزہ لینے لگا۔ کسی جگہ تاش کی بازی لگی تھی۔ یہاں نقد پیسے استعمال ہو رہے تھے۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک میز کے گرد جمع ہیں' اس پر ایک گول سی پلیٹ لگی تھی۔ جس پر مختلف نمبر تھے۔ اس میں ایک گیند نظر آ رہی تھی۔ ایک شخص وہ پلیٹ گھماتا اور لوگ اپنی اپنی مرضی کے نمبر بولتے' ہرے' نیلے اور پیلے ٹوکن' پھر پلیٹ رک جاتی اور اس میں موجود گیند کسی ایک خانے میں جا کر رک جاتی اور جس نے وہ نمبر بولا ہوتا وہ سب کے سامنے سے ٹرے سمیٹ لیتا۔ پھر میں نے تاش کے کھیل کا جائزہ لیا۔ ایک میز پر چھ افراد بیٹھے تھے۔ اور چھ افراد کے سامنے ٹوکنوں کے ڈھیر لگے تھے۔۔۔ میں غیر محسوس طریقے سے ان کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ایک آدمی کے پاس تین بادشاہ آئے اور اس نے سارے ٹوکن سمیٹنا شروع کر دیے۔ کافی حد تک میری سمجھ میں یہ دونوں کھیل آ گئے تھے۔ چنانچہ میں نے ٹوکن خریدنے کا فیصلہ کیا اور کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔

"جی سر۔۔۔ کتنے اسٹیکر چاہییں۔"

"پچیس ہزار والے۔۔۔" اس نے مودبانہ انداز میں پچیس ٹوکن ٹرے میں رکھ کر مجھے پکڑا دی۔ میں ٹرے لے کر اس گول پلیٹ والی ٹیبل کے پاس گیا۔۔۔ میں نے دس اسٹیکر نکال کر میز پر رکھ دیے۔

"جی سر۔۔۔" ایک آدمی نے کہا۔

"دس اسٹیکرز۔۔۔"

"سر نمبر کون سا۔۔۔؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"نو۔۔۔" میں نے بے اختیار کہا۔

"جی سر۔۔۔" پھر وہ باقی لوگوں سے نمبر پوچھنے لگا۔۔۔ میں نے نظر بچا کر مورتی کو ہاتھ میں پکڑا اور دل میں خیال کیا نو نمبر' اس شخص نے پلیٹ گھمانی شروع کی۔ اور پھر وہی ہوا گیند نو کے خانے میں جا کر رو کی۔۔۔ میں نے باقی سب کے سامنے سے اسٹیکر سمیٹنے شروع کیے۔ پھر میں نے پندرہ اسٹیکرز لگائے' ہر بار میں ہی جیتا' اب سب مجھے حسد سے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ یہاں سے ہٹ جایا جائے' اور اس کے بعد وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ دو ہی بازیوں میں اچھے خاصے اسٹیکرز جمع ہو گئے تھے۔۔۔ میں کاؤنٹر پر گیا اور ٹوکن کے بدلے لڑکی نے نقد رقم میرے حوالے کر دی۔۔۔ رقم لے کر میں بڑھ گیا۔ مختلف میزوں کے درمیان گھومتا رہا۔ پھر ایک میز پر ایک نشست خالی دیکھی اور میں وہاں پہنچ گیا۔۔۔

"معاف کیجیے گا' اگر آپ لوگوں کی اجازت ہو تو میں

یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔" ان پانچوں نے ایک نظر مجھے دیکھا اور ایک آدمی بولا۔

"ہاں' ہاں.... کیوں نہیں تشریف رکھیں۔" میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا.... یہ لوگ اپنی چال چلتے رہے 'بلائنڈ چال.... 'ڈبل چال.... سب چیزیں میں غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ان لوگوں کی بازی ختم ہو گئی اور ایک آدمی جیت گیا تھا۔ پھر وہ پیسے سمیٹ کر اور تاش پھینٹنے لگا۔ پھر اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"آپ کے لیے...."

"جی پلیز...." میں نے کہا اور اس شخص نے میرے سامنے ہی تین کارڈ ڈال دیے۔ میری دوسری باری تھی.... اپنی باری پر میں نے بلائنڈ چال چلی۔ دو 'اکے اور ایک نہلا تھا' نہیں میرے پاس تین اکے ہونے چاہیے۔ میں نے دل میں سوچا اور اطمینان سے ایک اور چال چل دی' باقی لوگ حیران ہو گئے تھے۔ اس نے کہا۔

"آپ نئے کھیلنے والے ہیں...."

"جی کیوں...."

"نہیں بس ایسے ہی پوچھ لیا' آپ کا اندازہ بالکل نئے کھلاڑیوں جیسا ہی ہے۔" میں خاموش رہا.... پھر مورتی ہاتھ میں لے کر میں نے خیال کیا 'تین اکے' پھر چال پر چال دیتا رہا اور سب ایک ایک کر کے بھاگنے لگے۔ آخر میں میرا ایک حریف رہ گیا۔ اس نے ڈبل چال کے پیسے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"شو...." اور میں نے اطمینان سے تینوں پتے ان سب کے سامنے کھول دیے.... تین اکے ہی تھے۔ میرا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ پہلی ہی دفعہ میں 'میں نے زبردست ہاتھ مارا تھا اور اب میرے پاس اتنے پیسے تھے کہ میں کافی دیر تک کھیل سکتا تھا۔

پھر میں نے دوسری بازی میں اچھے خاصے پیسے لگائے تھے۔ لیکن یہ بازی میں جان بوجھ کر ہار گیا۔ ان لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنا نہیں چاہتا تھا.... پھر میں ہارتا جیتتا رہا' لیکن زیادہ تر جیتتا رہا تھا۔

اس کے بعد تین چار گھنٹے میں کھیلتا رہا اور اچھے خاصے پیسے اکٹھے ہو گئے تھے.... بڑی مشکلوں سے وہ پیسے میں نے اپنی جیب میں ٹھونسے تھے اور پھر باقی کے ہاتھ میں پکڑ لیے۔ کاؤنٹر والی لڑکی نے مجھ سے کہا۔

"ایکسکیوز می سر...."

"جی...." میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہمارے پاس یہ بریف کیس فالتو ہے اگر آپ چاہیں تو...."

"تھینک یو' مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔" میں تے بریف کیس ان کے ہاتھ سے لے لیا اور اس میں پیسے ڈال لیے۔ مجھے تعجب تھا کہ ان کے پاس یہ بریف کیس کہاں سے آیا۔

"منیجے' یہ بریف کیس آپ کے کام کا تو نہیں۔"

"ارے نہیں سر' یہاں اکثر لوگ بریف کیس چھوڑ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ بس گھر پہنچ جائیں تو بڑی بات ہو گی۔"

"کیوں...."

"لاکھوں روپے ہارنے کے بعد ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ ان کو کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔"

"خیر اس کے لیے تھینک یو...." میں نے کہا اور باہر نکل گیا۔ یہاں سے نکل تو آیا تھا اور اب سوچ رہا تھا کہ سنبل کو کیا بتاؤں گا' پھر ایک خیال میرے ذہن میں آیا.... میں نے محسوس کیا کہ جب سے مورتی میرے پاس آئی تھی۔ میرے سوچنے سمجھنے کی حسیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ مورتی سے کہوں کہ یہ بریف کیس سنبل کو نظر نہ آئے صرف مجھے نظر آئے اور میں نے ایسا ہی کیا۔ سنبل ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا۔

"شاہو' کیسی رہی رات کی ڈیوٹی۔"

"بہت اچھی' اور زیادہ کام بھی نہیں ہے' جیسے ہی کام ختم ہوا چھٹی' یہاں یہ اچھی بات ہے کہ واپس آنے کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے..."

"تمہیں آگے مشکل نہیں ہوگی۔" میں نے کہا اور وہ شرما گئی۔

"اچھا اب کپڑے بدل لوں۔

"تمہارے کپڑے تو صاف ستھرے ہیں؟" ان کی وردی ہے۔ کام کرتے وقت وردی پہنو، پھر اپنے کپڑے پہن لو..."

"اچھا، یہ بھی ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور پھر مطمئن ہو گئی۔ میں نے بریف کیس ایک کونے میں چھپا دیا۔

☼ ☼ ☼

اب میں مستقل ہوٹلوں اور کلبوں میں جانے لگا۔ میں ہمیشہ بڑے نوٹ رکھنے لگا... میں ایک جگہ نہیں کھیلتا تھا۔ دوسری اہم بات میں صرف جیتتا نہیں تھا۔ اچھے خاصے پیسے ہار بھی جاتا تھا۔ اس لیے لوگ مجھ پر دھیان نہیں دیتے تھے۔ ایک دن میں ایک کلب میں فلیش کھیل رہا تھا۔ اور اچھی خاصی رقم جیت گیا تھا۔ لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے اور اکا دکا لوگ میزوں پر رہ گئے۔ اچانک ہی ایک طرف سے ایک عورت میرے پاس آئی اور میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ یقیناً" بے حد خوب صورت تھی۔ اس نے کہا۔

"ہیلو نوجوان..."

"ہیلو..." میں جواباً" بولا۔

"تم جب سے اس کلب میں ہو تمہیں جیتتے ہوئے دیکھ رہی ہوں، تم قسمت کے دھنی ہو۔"

"جی شکریہ..."

"نام کیا ہے تمہارا..."

"شاہو..."

"شاہو' اس کھیل میں قسمت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ... ت ایک ہی رات میں انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا ... بڑے بڑے لوگ قلاش ہو جاتے ہیں، لیکن اس ... میں تم جتنا جیتتے ہو اور جس طرح جیتتے ہو وہ باعث حیرانی ہے۔"

"کیا مطلب..."

"مطلب خود سمجھ جاؤ نہ شاہو' اب ہر بات سمجھانی پڑتی ہے تمہیں۔" اس بار اس عورت کی آواز تبدیل تھی اور میں حیرانی سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا... پھر اس عورت کی شکل بھی تبدیل ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے رانی کرشنا کا روپ دھار لیا... میں حیرت سے گنگ رہ گیا۔ کرشنا نے کہا۔

"شاہو' میں ہوں کرشنا تمہاری میڈم' تمہاری دوست..." لیکن میرے منہ میں زبان کہاں تھی میں تو خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"شاہو' بہت مزا ہے زندگی کے اس انداز میں' ہر طرف دولت ہی دولت' اور تم جانتے ہو کہ یہ سب تم کیسے حاصل کر رہے ہو۔"

"جی میڈم..."

"یہ ہوئی نا بات' تو شاہو ہم بات کر رہے تھے ذریعہ کی' تو وہ ذریعہ میں تھی۔ میں نے تمہیں سمپورنی دی' اور اس کے بدلے ایک وچن لیا تھا کہ مجھے ان پانچ دشمنوں کا خون چاہیے' ان کا خون ابھی تک ان کی رگوں میں ہے اور میری زبان ان کا خون چاٹنے کو بے تاب ہے' مجھے بس ان کا خون چاہیے اور تم نے یہ مجھ سے وچن کیا تھا۔ اپنا وچن مت بھولنا' تم نے ہر حالت میں اپنا وچن پورا کرنا ہے اور خبردار اپنا وچن مت بھولنا۔ ورنہ اپنی حالت کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔ سڑکوں پر پلنے والے کتوں سی حالت کر دوں گی تمہاری' تمہارے بدن سے کوڑھ ٹپکے گا۔ اور لوگ تمہارے قریب بھی نہیں آئیں گے' دنیا کا ہر آرام تم پر حرام کر دوں گی زندگی تم پر حرام ہو جائے گی اور موت تمہیں ملے گی نہیں' اگر تم میرا کام کرو گے تو تم مہان شکتیوں کے مالک بن جاؤ گے' تمہیں یاد دلانا میرا کام تھا' میں چلتی ہوں اور جلد ہی واپس آؤں گی۔"

پھر اس کے خدوخال بدلنے لگے۔ اور وہ واپس اس عورت کی شکل میں آ گئی جو یہاں پہلے تھی۔ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"ہائے شاہو۔۔۔" آواز رانی کرشنا کی تھی۔

میں کافی دیر ہال کے دروازے کو دیکھتا رہا۔۔۔ بڑی سنسنی خیز صورت حال تھی۔۔۔ رانی کرشنا نے اپنا وعدہ یاد دلایا تھا۔ اسے ہر حال میں پانچ لوگوں کا خون چاہیے تھا۔ میں بری طرح سہم گیا۔۔۔ میں کافی دیر یوں ہی بیٹھا سوچتا رہا پھر ہوٹل جانے کے لیے اٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆

سنبل کا ساتھ اور یہ عیش کی زندگی، میں اپنے آپ کو بھول گیا یاد ہی نہیں رہا تھا۔ کہ میں ایک بھکاری تھا۔ لوگوں کے سامنے درد بھری آواز سے صدا لگاتا تھا۔ آج قدرت کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کچھ لکھنا پڑھنا بھی آ گیا دنیا کو سمجھنے لگا تھا۔

"لیکن۔۔۔ اچانک کرشنا کے مل جانے سے دل دہل گیا تھا۔ میں تو سکون کی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ پانچ لوگوں کا خون کر کے کیا میرا سکون باقی رہے گا۔

رات کو سنبل نے کہا۔ "کیا بات ہے شاہو پریشان ہو؟"

"ایں بھلا مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔"

"لگ رہے ہو۔۔۔"

"غلط فہمی ہے تمہاری۔۔۔"

"ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں کہو۔۔۔"

"کیا ہم ہوٹل میں ہی پڑے رہیں گے۔۔۔؟"

"نہیں کوئی تکلیف ہے تمہیں یہاں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔"

"کیا۔۔۔" میں چونک پڑا۔

"آج ہوٹل میں پولیس کا چھاپہ پڑا ہے۔۔۔"

"چھاپہ۔۔۔"

"ہاں تم ایک لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ پکڑی گئی، لوگ مجھے بھی مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے، شاہو ایک کام کرو۔۔۔"

"ہاں بولو۔۔۔"

"اگر ابھی کوئی گھر نہ خرید سکو تو کرائے پر لے لو۔"

"ہوں، فکر نہ کرو کل پہلا کام یہ ہی کروں گا۔"

دوسرے دن میں گیارہ بجے ہوٹل سے نکلا۔ کافی دور پیدل چلنے کے بعد میں ایک بازار میں پہنچا۔ یہاں اسٹیٹ ایجنسیوں کی دو تین دوکانیں تھیں پھر میں ایک اسٹیٹ ایجنٹ کی دوکان میں گھس گیا۔ دوکان پر بیٹھا شخص بڑے تپاک سے ملا۔

"جی سر کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی۔۔۔"

"مجھے ایک مکان چاہیے۔۔۔"

"جناب، آپ کو مکان کرائے پر چاہیے یا اپنا۔۔۔"

"مجھے مکان خریدنا ہے۔۔۔"

"کس علاقے میں چاہیے۔۔۔"

"کوئی بھی قریبی علاقہ بس صاف ستھرا ہو۔۔۔"

"جناب میرے پاس دو اچھے مکان ہیں، ابھی میرا آدمی آپ کو مکان دکھا دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور تقریباً بیس منٹ بعد ایک آدمی وہاں پہنچ گیا۔

"احمد۔۔۔ ان صاحب کو وہ مکان دکھا دو جو برائے فروخت ہیں، چابیاں لے جاؤ۔"

"آئیں سر۔۔۔" احمد نے کہا اور ہم دونوں اس کی موٹر سائیکل پر چل پڑے، ہم دونوں کے لیے یہ مکان بہت اچھا تھا۔

"یہ تو دو لوگوں کے لیے بہت بڑا ہے۔"

"سر دوسرا مکان اس سے بھی بڑا ہے اگر آپ دیکھنا چاہیں تو۔۔۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ بس ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے سر پھر واپس چلتے ہیں۔۔۔" اور پھر ہم واپس آ گئے۔

اس کے بعد میں دو، تین ایجنٹوں کے پاس گیا، سب ہی مکان تقریباً دو افراد کے لیے بڑے تھے۔ پھر ایک ایجنٹ نے مجھے ایک مکان دکھایا۔ جو میرے اور سنبل کے لیے انتہائی مناسب تھا۔ صاف ستھرا علاقہ تھا۔ بہر حال تمام معاملات طے ہو گئے۔ پھر میں نے ضرورت کی ہر چیز اس میں رکھوا دی۔ غرض یہ کہ ہر

لحاظ سے یہ سجا سجایا گھر لگتا تھا' ہر چیز اپنی جگہ تھی۔ پھر میں ہر کام کر کے ہوٹل سنبل کو خوش خبری سنانے چلا گیا۔

"چلو سامان سمیٹو۔۔۔"

"کیا۔۔۔"

"سامان سمیٹو' میں نے گھر خرید لیا ہے۔"

"کیسے' اتنے پیسے کہاں سے آئے۔"

"بس بندوبست ہو گیا تھا تمہارے لیے تو ابھی میں نے بہت کچھ کرنا ہے۔" سنبل کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے جھٹ پٹ سامان سمیٹا اور تیار ہو گئی۔ نیچے جا کر ہم نے بل ادا کیا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔

گھر دیکھ کر سنبل کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"اتنا خوب صورت اور پیارا گھر۔۔۔ اس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔"

"میڈم' یہ خواب نہیں حقیقت ہے اور یہ لیں سنبھال لیں اسے۔" میں نے گھر کی چابیاں اسے تھما دیں۔ سنبل ہر چیز دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی میں اسے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ پھر اچانک کال بیل ہوئی اور ہم دونوں چونک پڑے۔ پھر میں نے کہا۔

"ارے یہ کون آ گیا۔۔۔؟"

"دیکھ لیں' اب مہمان بھی آنا شروع ہو گئے۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ سامنے ہی ایک بزرگ کو کھڑے پایا' سفید داڑھی' سر پر سفید ٹوپی' شیروانی پہنے ہوئے انتہائی پر رعب شخصیت کے مالک نظر آ رہے تھے۔

"جی فرمائیے۔۔۔"

"میاں' میرا نام صوفی عنایت اللہ ہے' آپ کے سامنے والے گھر میں رہتا ہوں' کافی دنوں بعد اس گھر میں چہل پہل دیکھی تو رہا نہ گیا۔ سوچا آپ سے تعارف حاصل کر لیا جائے۔ کیا نام ہے برخوردار۔"

"شاہو' ارے آپ باہر کیوں ہیں اندر آئیے۔" میں ان کو اندر لے آیا۔

"معاف کیجئے گا۔ ایک بات پوچھنی ہے۔"

"جی جی فرمائیے۔۔۔"

"آپ اکیلے رہیں گے۔۔۔"

"نہیں میرے ساتھ سنبل بھی ہے۔۔۔" میں نے کہا اور سنبل کو آواز دی۔ وہ شرماتی ہوئی باہر آئی اور سلام کیا۔

"زوجہ ہیں آپ کی۔۔۔"

"جی نہیں۔۔۔"

"تو پھر بہن۔۔۔"

"ارے نہیں۔۔۔ ہم لوگ شادی کرنے والے ہیں۔"

"اچھا' اچھا۔۔۔ ماشاء اللہ۔"

"معاف کرنا میاں' مجھے تمہارے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن شادی سے پہلے اس کا تمہارے ساتھ رہنا بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔"

مجھے یہ بزرگ اچھے لگے' دل چاہا ان کو ساری حقیقت بتا دوں' چنانچہ میں نے ان کو ساری بات بتا دی کہ کس طرح ہم شیر خان کے چنگل سے نکل کر بھاگے۔ پھر ہم کچھ دن ہوٹل میں رہے اور اب یہ گھر لیا ہے۔ میں نے نوکری تلاش کی اور مالکان سے قرض لے کر یہ جگہ لی ہے۔ اب ہم جلد شادی کر لیں گے۔"

"میاں یہ تو تو واقعی نیک کام ہے۔ خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔"

"آپ کے گھر میں کون کون ہے۔" اس بار سنبل نے پوچھا۔

"میں اور میری بیوی' ہمارے رشتے دار بھی مختلف شہروں میں رہتے ہیں۔ اولاد کوئی نہیں ہے۔۔۔ ساری زندگی جو کمایا دو گھروں پر لگا دیا۔۔۔ ایک گھر میں ہم خود رہتے ہیں اور دوسرے کو کرائے پر اٹھا رکھا ہے۔ گزر بسر بڑے عیش سے ہو رہی ہے۔" ان بزرگ نے بڑی سادگی سے اپنے تمام حالات بیان کر دیے۔ پھر وہ کہنے لگے۔

"کیا ہم تمہیں اپنا بیٹا بنا سکتے ہیں۔"

"ہاں، ہاں بھائی......"

"ہمارا اولاد [illegible] اور آج [illegible] تو تمہارے [illegible] اور نہیں دل سے چاہتا [illegible] ہمارا بیٹا بن جاؤ۔"

"[illegible] ہم دونوں کو ماں باپ دیکھنا [illegible] کی بات سے سکون ہوا کہ [illegible] رشتے سے ملا ہے۔ ہم پوری [illegible] کہ آپ کے حقوق کی ادائیگی میں [illegible] نہ کریں۔" میں بھی جذباتی ہو گیا۔

"شکریہ بچے' اب یہ بتاؤ' رات کے کھانے میں کیا [illegible] گے۔"

"ارے نہیں' اس تکلف کی ضرورت نہیں [illegible]"

"[illegible] بات' بچے تو اپنے والدین سے فرمائش [illegible] ہیں اور تم تکلف کی بات کرتے ہو' اچھا ایسا [illegible] ہیں..... مرغی کی بریانی پکوا لیتے ہیں اور ساتھ [illegible]..... اس کے علاوہ کچھ کھانا ہو تو بتا دو۔"

"نہیں بابا' بس اتنا ہی بہت ہے۔"

"[illegible] ہوئی نا بات' اب میں تمہارا بابا ہوں' کسی اور [illegible] کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دینا۔"

"جی بالکل....."

"اچھا' اب میں چلتا ہوں اور آپ کے کھانے کا [illegible] کرتا ہوں اور بانو بیگم کو بھی خوش خبری سناؤں [illegible] اللہ نے ہمیں اتنی سعادت مند اولاد دے دی [illegible]" وہ اٹھ کر چل پڑے..... مین گیٹ پر پہنچ کر [illegible]

"ایک بات محسوس کر رہا ہوں اس گھر میں....."

"کیسی بات....."

"بیٹا' پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا تھا لیکن اب [illegible] یقین ہو گیا ہے کہ کوئی نا کوئی گڑبڑ ہے۔"

"محترم' آپ کی بات ہماری سمجھ نہیں آ رہی' آپ [illegible] وضاحت فرمائیں گے۔"

"بیٹا! جب میں تمہارے گھر میں داخل ہوا تو ایک [illegible] بو میرے ناک سے ٹکرائی۔ پہلے میں سمجھا کہ ہو سکتا ہے یہ بو باہر سے آ رہی ہو لیکن کمرے میں بیٹھ کر میں نے مسلسل یہ بو محسوس کی ہے' مجھے لگتا ہے کہ اس گھر میں کوئی آسیبی سایہ ہے....."

"آسیبی سایہ' لیکن ہمیں تو کوئی بدبو محسوس نہیں ہوئی۔"

"بس بیٹا' اپنی اپنی پرکھ ہے' سب سے بڑی ذات وہی ہے جو سب کچھ جانتی ہے اور اپنے بندوں کو بھی علم دے رکھا ہے..... اور اسی سمجھ بوجھ کی وجہ سے ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ اس گھر میں کوئی آسیب ہے۔" میں ان کی باتوں سے پریشان ہو گیا تھا۔ پھر میں نے کہا۔

"ہم کیا کریں' کوئی مشورہ دیں۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو' پہلے ہم اپنے بیٹے کا نکاح کروا دیں گے' سنبل کے ساتھ وقت گزارو' اور اسے کچھ مت بتانا۔ بچی پریشان ہو جائے گی۔ ہاں اور نکاح کی تیاریاں کرو۔ ہم جلد تمہارا نکاح پڑھا دیں گے۔"

پھر وہ چلے گئے تھے۔ لیکن مجھے پریشان کر گئے تھے۔ چنانچہ میں نے خود پر قابو پایا اور مسکراتا ہوا اندر گیا۔

"کیا کہہ رہے تھے بابا....."

"پتا ہے کیا کہہ رہے تھے۔"

"کہہ رہے تھے کہ نکاح کی تیاریاں کرو۔" میں نے کہا تو سنبل کا چہرہ سرخ ہو گیا اور سر جھکا لیا' میں اس کے قریب گیا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے اٹھایا اور کہا۔

"ایک شوہر کی حیثیت سے میں تمہیں دنیا کی ہر خوشی دینے کی کوشش کروں گا۔"

"تم میرے ساتھ ہو' میرے لیے یہ ہی بڑی خوشی ہے۔"

"اچھا میڈم....." میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔ پھر ہم کافی دیر بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ رات نو بجے وہ دونوں میاں بیوی پھر ہمارے گھر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں کھانے کے برتن تھے۔

"ارے یہ ہیں ہماری زوجہ محترمہ..... بانو بیگم' ہمارا سب کچھ۔"

"آیئے ماں جی' اندر تشریف لائیں۔" میں انہیں لے کر اندر چلا گیا۔ انہوں نے برتن ٹرے میں رکھے اور سنبل کو پیار کیا۔

"ماشاء اللہ بڑی پیاری بچی ہے۔" انہوں نے سنبل کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بالکل آپ جیسی ....." بزرگ شرارت سے بولے۔

"آپ شروع ہو گئے....."

"ہاں تو اور کیا' ہمارے بچے ہیں' ان کے سامنے ہم کچھ بھی کریں گے۔"

"اچھا پہلے کام کی بات کر لیں' انہوں نے بتایا کہ آپ شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"جی....."

"دلہن کے لیے زیور' کپڑے ہیں آپ کے پاس۔"

"جی فی الحال نہیں' لیکن انتظام ہو جائے گا۔"

"جی نہیں' انتظام ہم دونوں کریں گے' آپ دونوں صبح ہمارے ساتھ بازار جانا۔"

"بابا....."

"نہیں کچھ نہیں' بابا کہا ہے تو بابا کو حق تو جتانے دو....."

"ہاں بالکل' تم دونوں بچے ہو ہمارے۔" اس بار خاتون نے کہا۔

"لیکن امی....."

"بیٹی' اس طرح تم غیرت کا ثبوت دے رہی ہو' بس یوں سمجھو کہ یہ سب ہم اپنی خوشی کے لیے کر رہے ہیں۔"

"آئیں آپ بھی ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔" میں نے انہیں کھانے کی دعوت دی۔

"نہیں بھئی ہم تو مغرب کے بعد کھانا کھا لیتے ہیں' تم لوگ کھاؤ' بلکہ اب ہم لوگ چلتے ہیں۔ تم دونوں آرام سے کھانا کھاؤ' صبح گیارہ بجے ہم لوگ آجائیں گے' بازار چلنا ہے۔"

"ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی۔" پھر وہ دونوں چلے گئے۔ میں نے اور سنبل نے کھانا کھایا۔ ہم دونوں گہری خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ پھر سنبل نے کہا۔

"اس دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں شاہو' اب ان کو دیکھو' ان کا ہم سے کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بھی یہ اپنوں کی طرح ہمارے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔"

"ہاں' دنیا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے تو چہرے نمایاں ہو رہے ہیں۔"

"ایک بات بتاؤ شاہو....."

"ہاں پوچھو....."

"کیا ہماری زندگی میں اسی طرح خوشیاں قائم رہیں گی....."

"ہر انسان یہی چاہتا ہے' باقی یہ قسمت کے کھیل ہیں کس کو کیا ملے۔ دعا مانگا کرو۔"

"جانے کیوں' کبھی کبھی میرا دل ڈرنے لگتا ہے۔"

"کیوں.....؟"

"بس شاہو' میں سوچتی ہوں کہ....." سنبل نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بتاؤ نا کیا سوچتی ہو....."

"نہیں شاہو چھوڑو جانے دو' یہ سب بلاوجہ کی باتیں ہیں۔"

"بری باتیں نہ سوچا کرو....."

✲ ✲ ✲

صوفی عنایت در حقیقت فرشتہ صفت انسان تھے۔ ہم سے زیادہ وہ ہمارے لیے مضطرب ہو گئے تھے۔ دنیا کی ہر خوشی ہمیں دینا چاہتے تھے۔ ان کے احسانات کا کوئی بدل نہیں تھا ہمارے پاس' تین چار دن گزر گئے تھے۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتے ان کے چہرے پر عجیب سی کیفیت چھا جاتی۔ اس دن میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے بابا..... آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں۔"

"بس بیٹا دعائیں مانگتے ہیں۔ تمہارے لیے کہ اللہ تمہیں زندگی کی ہر خوشی نصیب کرے' تمہارے اوپر

...اں اہلائل جائے۔ اصل میں یہ جو بدبو تمہارے کمرے سے آتی ہے یہ مناسب نہیں ہے۔ جو تھوڑا بہت علم میرے پاس ہے وہ یہ کہتا ہے کہ کوئی دشمن تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اب اس دشمنی کی کیا بنیاد ہے مجھے نہیں پتا' اگر یہاں کوئی آسیبی قوت ہے تو وہ یہاں تمہارے ساتھ لگ کے تو نہیں پہنچ گئی۔"

بارہا میرا دل چاہا کہ میں صوفی صاحب کو بتا دوں' لیکن ہمت نہ پڑی' بہرحال دوسرے دن انہوں نے آ کر کہا۔

"بانو کہہ رہی ہے کہ سنبل کو میرے ساتھ بھیج دو' آج شام کو میں نے کچھ لوگوں کو مدعو کیا ہے اور سنبل کے ولی کی حیثیت سے میں موجود ہوں' تمہارے کچھ دوست احباب ہیں یہاں پر....."

"جی نہیں....."

"خیر کوئی بات نہیں' یہ تو صرف باتیں ہوتی ہیں۔ اصل مسئلہ تو نکاح کا ہوتا ہے۔"

"لیکن صوفی صاحب....."

"لیکن ویکن کچھ نہیں' جو میں کہہ رہا ہوں کیا تم میری وہ بات نہیں مانو گے....."

"بھلا میری مجال کہ انکار کر سکوں....." میں مسکرایا۔

"تو پھر ٹھیک ہے' ہماری بیٹی کو بلاؤ۔" میں نے جا کر اسے بتایا تو وہ شرما گئی۔ پھر ان کے ساتھ ان کے گھر چلی گئی۔ اور میں سوچوں میں ڈوب گیا' آہ کاش میری زندگی سے ہر مشکل کٹ جائے اور کوئی پریشان کن بات نہ ہو..... پھر شام کو تمام رسومات ہوئیں۔ دلہے کے لباس میں صوفی صاحب مجھے لے گئے اور پھر ان کے شناساؤں کی موجودگی میں ہمارا نکاح ہو گیا..... رات کا کھانا بھی ان کی طرف تھا' رخصتی کے وقت کچھ سامان انہوں نے دلہن کو تحفے کے طور پر دیا' کمال کے آدمی تھے۔ بے مقصد اور بے غرض' رات کو سنبل دلہن کی حیثیت سے میرے گھر آ گئی۔ ماں جی نے اسے ... کمرے میں پہنچا دیا۔ میری زندگی کو اک نیا سہارا مل گیا تھا۔

بقیہ وقت جس طرح گزرا میں ہی جانتا ہوں' سنبل کمرے میں دلہن بنی بیٹھی تھی' یہ بھی انوکھی شادی تھی۔ اماں حلیمہ کی گاڑی گھسیٹتے ہوئے میں نے نہیں سوچا تھا کہ میری یہ زندگی بھی ہو گی' کرشنا کے چنگل میں پھنسنے میں میری کوئی کوشش شامل نہیں تھی۔ یہ سب قسمت کے کھیل تھے۔ اگر دیکھا جائے تو قسمت کے اس کھیل میں مجھے بے تحاشا فائدے ملے۔ جو عام زندگی میں ممکن نہ ہو سکتے تھے..... اب سوچتا ہوں کہ سنبل میری زندگی میں شامل نہ ہوتی تو میں دو' دو پیسے کا فقیر ہی رہتا۔ پتا نہیں کرشنا مجھ سے کون سے کام اور لینا چاہتی ہے۔

اچانک مجھے سنبل کا خیال آیا' مجھے خود ہی شرم محسوس ہوئی۔ حالانکہ وہ اتنے عرصے سے میرے ساتھ تھی۔ ہر طرح کی بے تکلفی تھی۔ لیکن اب اس کے کمرے میں جاتے ہوئے اک جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ زندگی یہ ہی ہے نا..... یہی سوچ کر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ سیج پر سنبل کو دیکھا۔ وہ بالکل گڑیا سی لگ رہی تھی' لمبا سا گھونگھٹ نکالا ہوا تھا..... اس کے کان یقیناً" میرے قدموں کی آہٹ پر لگے ہوں گے' دھڑکتے دل کے ساتھ میں آگے بڑھا اور مسہری کے قریب پہنچا۔ وہ اسی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ کچھ لمحے میں سوچتا رہا پھر جذباتی لہجے میں کہا۔

"میں جو کچھ بھی ہوں۔ تم اس سے اچھی طرح واقف ہو۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مجھے سمجھ دار بنانے میں تمہاری محنت کا دخل ہے' دنیا نے بہت کچھ سکھایا لیکن جو تم نے سکھایا وہ بہت زیادہ ہے' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم سے کیا باتیں کروں' اب مجھے اپنا چہرہ دیکھنے دو' کیا تم مجھے اس کی اجازت دو گی۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا' میں نے سوچا بھلا نئی دلہن پٹر پٹر بولتی اچھی لگتی ہے۔ پھر میں نے لرزتے ہاتھوں سے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ لیکن اس کے بعد میری کیفیت ایسی تھی جیسے کسی نے قریب سے دھماکے کی آواز سنی ہو' جو چہرہ گھونگھٹ سے نمودار ہوا وہ سنبل کا نہیں رانی کرشنا کا تھا۔

اس کے چہرے پر بڑی بھیانک مسکراہٹ تھی۔۔۔ میرا دل لرز کر رہ گیا تھا۔ سنبل، سنبل، سنبل۔۔۔ کرشنا مسکرائی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

"کس سوچ میں ڈوب گئے شاہو۔۔۔"

"تم۔۔۔ تم۔"

"ہاں، تم جیون کے مزے لو اور میں نرکھ کی آگ میں جلوں، اپنے تو سارے کام کرنے بیٹھ گئے یہ نہیں سوچا رانی سے بھی پوچھ لوں کوئی کام تو نہیں۔"

"صرف ایک بات مجھے بتاؤ، کیا سنبل کے روپ میں تم تھیں۔"

"چھی۔۔۔ چھی۔۔۔ چھی کیسی باتیں کرتے ہو۔۔۔ وہ منحوس لڑکی میں کیسے ہو سکتی ہوں۔"

"وہ منحوس ہے۔۔۔؟"

"وہ۔۔۔" اس کے چہرے پر آگ برسنے لگی۔

"پھر بتاؤ، سنبل کہاں ہے۔"

"دوسرے کمرے میں ہے بے ہوش پڑی ہے۔"

"وہ کیسے بے ہوش ہو گئی۔"

"میں نے کیا۔۔۔"

"کیوں۔۔۔"

"اس لیے کہ میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔"

"بات کرنے کے لیے یہ وقت ضروری تھا۔۔۔"

"بہت ضروری۔۔۔"

"کیوں۔۔۔"

"یہ میں تمہیں بتائے دیتی ہوں۔" میں انتہائی غصہ کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ اس وقت آئی تھی۔ جب میں اپنی زندگی کے سب سے حسین لمحے سے دوچار ہونے والا تھا۔ وہ غصے سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ نیچے اتر آئی اور میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

"تمہیں یاد ہے تم نے مجھ سے وچن کیا تھا۔۔۔"

"اس وقت مجھے کچھ یاد نہیں۔۔۔"

"سوچ لو شاہو، سوچ لو، انسان جب سب کچھ گنواتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے کیا گنوایا۔۔۔"

"تم جو کہنے آئی ہو وہ کہو، اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"تو میرے ساتھ اس انداز سے پیش آرہا ہے، تو جانتا نہیں میں کون ہوں، احسان فراموش، پاپی، کمینے۔"

"دیکھو، میرے جذبات کو سمجھو میں اس وقت۔۔۔"

"ہاں، ہاں جانتی ہوں۔۔۔ لیکن تو نے پانچ دشمنوں کے خون کا وچن دیا تھا اور اب وہ سمے آگیا ہے کہ تو مجھے پہلے دشمن کا خون دے۔"

"کب۔۔۔"

"آج، اب سے تھوڑی دیر بعد تجھے کل صبح مجھے خون کا پیالہ دینا ہوگا۔"

"کون ہے تیرا دشمن۔۔۔"

"وہ لڑکی جو تیری بیوی بنی ہے۔" یہ دوسرا دھماکا تھا جو اس نے مجھ پر کیا اور میرا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

"کیا بکواس ہے یہ۔۔۔"

"سن۔۔۔ وہ دوسرے کمرے میں بے ہوش پڑی ہے، اس کے قریب تانبے کا پیالہ اور خنجر رکھا ہے۔ تو اس کے خون سے وہ پیالہ بھر دے، میں کل جس سورج سوا نیزے پر ہوگا تو وہ پیالہ لینے آؤں گی۔"

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔۔۔"

"پاگل تو، تو ہو گیا ہے لڑکے، یاد رکھ، جب تک تو مجھے پانچ لوگوں کا خون نہیں دے گا چین سے نہیں بیٹھے گا اور اگر تو نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو سنسار میں تیرا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔ جا رہی ہوں، جو کہہ رہی ہوں وہی ہو، اس سے الگ نہ ہو" پھر وہ دروازے کی جانب مڑی اور پھر رک کر مجھے دیکھا اور بولی۔

"ارے غلطی تیری ہے، بڑا پریمی بنا پھرتا ہے پہلے اپنی ذات کو تو مکمل کر لے۔ ابھی تو، تو صرف ایک لونڈا ہے۔ میرے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے، ورنہ تو کیا اور تیری اوقات کیا، پہلے پانچ لوگوں کی بھینٹ تو دے مجھے، اس کے بعد پریم کرنا، پھر تیرے راستے میں نہیں آؤں گی۔" وہ دروازہ کھول کر چلی گئی اور میں پتھرایا ہوا وہیں

وہیں کھڑا رہ گیا۔

کچھ دیر کے لیے سوچنے سمجھنے کی قوتیں ختم ہوگئی تھیں، یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی جو کچھ ہوا ہے وہ حقیقت ہے یا خواب، میں اپنی جگہ پتھرایا ہوا کھڑا تھا، سنبل کا کمرہ ہے اور وہ پھولوں کی سیج جس میں میرے ارمان میرا انتظار کر رہے تھے.... اب وہ کہتی ہے کہ سنبل دوسرے کمرے میں بے ہوش پڑی ہے۔ آہ! کیا خوشیاں اتنی ناپائیدار ہوتی ہیں۔ ایک لمحہ نہیں لگتا انسان کو خوشی سے غم کی جانب جاتے ہوئے.... وہ بدبخت کہتی ہے کہ میں سنبل کی گردن پر چھری پھیر دوں، وہ سنبل جس کے علاوہ اب میری زندگی میں اور کچھ نہیں ہے، ناممکن، میں سو بار سنبل کے لیے اپنی زندگی برباد کر سکتا ہوں۔ دوسرے لمحہ میں دیوانہ وار اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ اور اس کمرے میں گیا جہاں سنبل بے ہوش پڑی تھی۔ میں پاگلوں کی طرح اس پر جھک کر اسے ہوش میں لانے لگا۔ میں نے اسے لاتعداد آوازیں دیں لیکن وہ نہیں جاگی، البتہ مجھے تھوڑے فاصلے پر وہ بدرنگ پیالہ اور خنجر نظر آئے.... میری آنکھوں میں نفرت سی بھر گئی۔ میں نے اسے بازوؤں میں اٹھایا اور کمرے میں لیے واپس آگیا۔ اسے مسہری پر لٹایا اور اس کے بعد اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن سنبل ہوش میں نہ آئی.... عجیب سہاگ رات تھی۔ کہ ایک دولہا دلہن کو آغوش میں لیے بیٹھا تھا۔ ذہن میں لاتعداد خدشات تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے میں سنبل کو نقصان پہنچنے نہیں دوں گا۔ پھر میرے دل میں صوفی صاحب کا خیال آیا۔ اس سلسلے میں ان کو اطلاع دینا ضروری ہے۔ کل دوپہر تک کا وقت تھا میرے پاس ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی بہتر مشورہ دیں، سنبل کو چھوڑ کر جانا میرا دل نہ مانتا، کہیں وہ ہوش میں نہ آجائے اور کرشنا اسے نقصان نہ پہنچا دے میں کرشنا کے کہنے پر کوئی کام نہیں کروں گا چاہے اس کی مجھے کتنی بڑی سزا کیوں نہ ملے، یہ میرا آخری فیصلہ تھا۔ پھر میں نے صبح صوفی صاحب کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔

میں ساری رات آنکھوں میں کاٹنے کے بعد صبح اٹھا، منہ ہاتھ دھویا سنبل مسلسل بے ہوش تھی۔ اب اس کی طویل بے ہوشی سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ میں باہر نکلا تو میں نے صوفی صاحب کو اپنے گھر کی طرف آتے دیکھا۔ ان کے ساتھ ایک بزرگ بھی تھے۔ عجیب سا جلال ان کے چہرے پر چھایا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا تو وہ بولے۔

"کہاں جا رہے تھے شاہو...."

"آپ کے پاس آ رہا تھا...."

"آؤ میں تم کو ان سے ملواتا ہوں۔"

"صوفی صاحب میں...."

"باتیں اندر جا کر کرنا۔" انہوں نے کہا اور میں الٹے قدموں واپس پلٹ آیا۔ وہ دونوں اندر آئے تو میں ان کو باہر والے کمرے میں لے کر بیٹھ گیا۔

"سنبل کیسی ہے...."

"آپ سے کچھ کہنا ہے مجھے...."

"پہلے میرے مرشد سے ملو، یہ مرشد شاہ حسین ہیں، بس یوں سمجھ لو کہ فقیر منش ہیں، اللہ نے ان کو کیا کیا عطا کر دیا ہے میں بھی نہیں جانتا، اصل میں، میں نے ان سے بدبو کا ذکر کیا۔ تو مرشد نے کہا کہ مجھے اس گھر میں لے چلو، یہ رات ہی میرے پاس آگئے تھے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو برخوردار...."

"مرشد میں ایک پریشان حال انسان ہوں، انسان جب برائیوں کی طرف جاتا ہے تو اسے لاتعداد جھوٹ بولنے پڑتے ہیں جن پر دل ہمیشہ ملامت کرتا ہے۔"

"بولتے رہو...." مرشد نے کہا۔

"مرشد، اصل میں، میں بڑی عجیب زندگی گزار رہا ہوں، شاید کوشش کے باوجود آپ کو نہ بتا سکوں۔ واقعہ میں وہاں سے بتاؤں گا جب مجھے وہ بدبخت عورت ملی، جو مجھے دھوکے سے لے گئی تھی۔ اس کے بعد اس نے ایسے ایسے کھیل کھیلے کہ عقل خبط ہوگئی۔"

"تفصیل بتاؤ...." بزرگ نے آنکھیں بند کر کے کہا اور میری زبان کسی قلم کی طرح چلنے لگی۔ صوفی صاحب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ جب میں

خاموش ہوا تو مرشد نے کہا۔
”وہ مورتی کہاں ہے۔“
”میرے پاس۔“
”لے کر آؤ۔“ میں اندر گیا اور موتی لے آیا۔
”اسے تھوڑے فاصلے پر رکھ دو‘ دیکھا تم نے عنایت اللہ پتا چل گیا نا کہ بدبو کہاں سے آتی تھی۔“
انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
شاہ حسین کچھ دیر مورتی کو دیکھتے رہے کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔
”تو وہ کیا کہہ گئی ہے۔“
”کہہ گئی ہے کہ جب دوپہر کو سورج سوا نیزے پر ہوگا تو وہ خون سے بھرا پیالہ اور خنجر لینے آئے گی۔“
”ہوں لڑکی کی کیا حالت ہے۔“
”بے ہوش پڑی ہے‘ رات بھر ہوش میں نہیں آئی۔“
فکر مت کرو‘ میں جانتا ہوں کہ وہ ہوش میں کیوں نہیں آئی‘ اصل میں بیٹے برائی تو تم نے خود اپنے اندر پیدا کرلی ہے‘ انسان کو نیک اور بد میں تمیز کرنے میں دقت محسوس نہیں کرنی چاہیے‘ جتنے واقعات تمہیں پیش آئے۔ ان سے تو یہ بات ظاہر ہے کہ وہ کوئی بری روح ہے اور وہ تمہیں اپنے گندے مقاصد کے لیے استعمال کررہی ہے‘ تمہیں یہ مورتی اس سے لینی ہی نہیں چاہیے تھی۔ مگر انسان دولت کی چمک دمک میں اندھا ہوجاتا ہے۔ تم نے یہ وچن دیا تھا کہ تم اسے پانچ لوگوں کا خون دو گے۔“
”جی مرشد۔۔۔“
”بہت ہی برا کیا تم نے‘ انسانوں کو زندگی دینے والا کون ہے۔“
”اللہ۔۔۔“
”تو پھر تم نے ایک ایسے کام کی حامی کیوں بھری جو اصل میں تمہارا تھا ہی نہیں۔ شیطان کو قوتیں دی گئی ہیں کہ وہ انسان کو بہکائے اور ان کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے‘ شیطان بس اتنا ہی کرسکتا ہے‘ یہ الگ بات ہے کہ تم وہ گناہ اپنے سر لے لیتے ہو‘ بس یہ حساب ہے اور یہ ہی حساب دینا ہوتا ہے۔ تم اگر اس سے یہ کہہ دیتے کہ تم یہ کام نہیں کرسکتے تو زیادہ بہتر تھا۔“
”شرمندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے میرے پاس۔“
”خیریات اگر تمہاری ہی ہوتی تو معاف کرنا مجھے۔ شاید میں کچھ کرتا لیکن وہ ایک معصوم بے گناہ جان کے درپہ ہے یہ میرے لیے قابل برداشت نہیں۔ صوفی اس لڑکی کو اپنے گھر لے جاسکتے ہو۔“
”جی مرشد جی۔۔۔“
”تو ٹھیک ہے اسے اپنے گھر لے جانے کا انتظام کرو۔ وہ آرام سے ہوش میں آجائے گی۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں باقی دیکھتے ہیں اللہ کیا کرتا ہے۔ ویسے میاں نام کیا ہے تمہارا۔“
”شاہو۔۔۔“
”ہاں شاہو‘ اگر تم یہ پانچ قتل کردو گے تو پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اس کے بدلے تمہیں وہ سب مل جائے گا۔ یہ معمولی بات نہیں تم کروڑپتی بن جاؤ گے۔ ایسی ایسی درجنوں لڑکیوں سے شادی کرسکتے ہو پھر تم یہ کیوں کررہے ہو۔“
”نہیں مرشد‘ میں فطرتاً ”برا آدمی“ نہیں ہوں‘ میں ساری دنیا چھوڑ سکتا ہوں لیکن سنبل کو نقصان پہنچانا میرے بس کی بات نہیں۔“
”دیکھو عزیزی‘ زندگی میں اپنی خوشی حاصل کرنے کے لیے بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں‘ تم بلاوجہ ایک لڑکی کی زندگی بچانے کی کوشش کررہے ہو۔“
”مرشد میں جانتا ہوں کہ آپ میرا امتحان لے رہے ہو‘ مرشد میں بھکاری بننے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن سنبل کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“
”حق کہتے ہو۔“
”جی مرشد۔۔۔“
”تو پھر سنو سب سے پہلے اس مورتی کو اٹھا کر کسی گندی جگہ پھینک آؤ‘ جہاں یہ تمہارے ہاتھ نہ لگ سکے۔“

"جی مرشد' میں یہ کرنے کو تیار ہوں۔"

"اس کے بعد یہ گھر اور اس کی زندگی پر لعنت بھیج کر مزدوری کی زندگی کا عہد کرو۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔"

"یہ صرف ایک جذباتی بات ہے' بعد میں تم نہیں سوچو گے کہ زندگی کے آرام تم پر حرام ہو گئے۔"

"نہیں سوچوں گا۔۔۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔"

"حکم مرشد۔۔۔"

"مورتی کو کسی گٹر میں ڈال آؤ۔"

"گھر کے باہر ایک گٹر ہے میں اسے وہاں ڈال دیتا ہوں۔"

"جاؤ' پہلے یہ کر کے آؤ" میں خوشی کے ساتھ وہ مورتی اٹھائی اور اسے لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اور اسے گٹر میں پھینک آیا۔ واپس آیا تو مرشد مسکرا رہے تھے۔

"خوب' اب تم بازار جاؤ اور ایک بکرا خرید لاؤ بکرا کالے رنگ کا ہو' اور صوفی تم اس لڑکے کو جیسے بھی ہو اپنے گھر لے جاؤ' بکرے کا خون پیالے میں بھر کر تم اسے پیش کرو گے' اس کے بعد جو کچھ ہو گا مجھے بتاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے مرشد۔"

"ڈرو گے تو نہیں۔۔۔"

"نہیں مرشد۔۔۔"

"چلو پھر ٹھیک ہے۔ تمہیں نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا ہو گا اچھی طرح سمجھ لو۔"

"آپ فکر نہ کریں' سب کچھ آپ کے حکم کے مطابق ہو گا۔"

"پھر اٹھو صوفی۔"

پھر تھوڑی دیر کے بعد قاضی صاحب نے میری اور مرشد کی مدد سے بے ہوش سنبل کو اپنے گھر پہنچایا' بانو سنبل کو بے ہوش دیکھ حیران رہ گئی۔

"کیوں اسے کیا ہوا۔"

"بس بے ہوش ہو گئی ہے' لیکن سنو ہوش میں آئے تو اس سے کوئی سوال نہ کرنا' خود ہی جو کچھ بتائے سن لینا۔" صوفی صاحب نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔"

"بس تو جو کچھ میں نے کہا وہ کرو' اس کے بعد وقت کا انتظار کرو۔"

پھر میں نے بکرا ذبح کیا اور اس کا خون ایک پیالے میں بھرا اب میرا دل لرز رہا تھا۔ وہ دونوں چلے گئے تھے۔ کرشنا کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں آسمان کی طرف دیکھتا تھا اور میرے دل میں شدید کپکپاہٹیں اٹھتی تھیں۔

✡ ✡ ✡

یہ وقت جس طرح گزرا تھا میرا دل ہی جانتا تھا۔ زندگی میں اس زیادہ خوف کبھی محسوس نہیں کیا تھا' میں اس بڑے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا جہاں خون کا پیالہ اور خنجر رکھا تھا۔ یہ کمرہ میرے گھر کا سب سے بڑا کمرہ تھا اور اس میں کوئی خاص چیز نہیں رکھی تھی۔۔۔۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا' میں نے خلوص دل کے ساتھ اس دولت سے توبہ کر لی تھی۔ جو مجھ سے سنبل کو چھین رہی تھی۔

بجائے اس کے کہ دل کی دنیا اپنے ہاتھوں سے برباد کر لوں اور گندگی میں ہی ڈوبتا چلا جاؤں' یہ تو میری تقدیر اچھی تھی کہ شاہ حسین اور عنایت اللہ جیسی عظیم ہستیاں مجھے مل گئیں۔ ورنہ میرا کیا حشر ہوتا وہ تو مجھے۔۔۔ اس کے بعد اچانک میری سوچوں کا سلسلہ ختم ہو گیا باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور کرشنا نے پاؤں اندر رکھا۔ میں نے اس کا پاؤں ہی دیکھا تھا اس وقت میں نے جو کچھ دیکھا اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ آہ! کبھی غور ہی نہیں کیا کرشنا رانی کا چہرہ سامنے تھا۔ لیکن اس کے دونوں پاؤں پیچھے کو مڑے ہوئے تھے۔ ایڑھیاں آگے تھیں اور پاؤں پیچھے کو تھے' میں نے فقیروں کے محلے بھوتوں' چڑیلوں اور بچھل پیری کا ذکر سنا تھا۔ لیکن زندگی میں کبھی بھوت دیکھا نہیں تھا۔ لیکن اس وقت جو عورت سامنے آئی وہ

بچھل پیری تھی۔ وہ رانی کرشنا تھی' وہ بیگم صاحبہ جو گاڑی میں مجھے لینے آئی تھی کبھی ایک بار اس کے پیروں پر نظر ڈال لیتا تو جان جاتا کہ وہ کیا شے ہے' وہ تو بچھل پیری تھی کمبخت' لیکن دیکھا بھی تو کب' جب سب کچھ میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا' میرا دل دہشت سے کانپنے لگا وہ اندر آگئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی عجیب سا لباس' مڑے ہوئے پیروں میں چاندی کے زیورات' جو چھن چھن کر کے بج رہے تھے۔ اندر آکر اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور کہا۔

''کر دیا میرا کام.....''

''ہاں' ہاں۔'' جانے کیسے میرے منہ سے نکلا۔

اس کی نگاہیں خون سے بھرے ہوئے پیالے پر پڑیں۔ جس کی اوپری سطح اب جم کر کالی ہو چکی تھی..... وہ آگے بڑھی اور پیالہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا..... پھر وہ زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر خوشی تھی پھر اس نے کہا۔

''تو نے جو کچھ کیا۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ ملے گا تو سوچ بھی نہیں سکتا' آج میرے من کی سب سے بڑی خوشی پوری ہو رہی ہے۔ میرے پہلے دشمن کا خون' مگر اس کے بعد' تجھے بعد میں بتاؤں گی۔'' اس نے کہا اور منہ سے پیالہ لگا لیا۔ اس نے ایک گھونٹ بھرا اور دوسرے لمحے وہ اچھل پڑی۔ وہ خون کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں عجیب سی بجلیاں تڑپنے لگیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اس نے مجھے دیکھا اور میں ان چمکدار آنکھوں سے آنکھیں نہ ملا سکا تو وہ بولی۔

''پاپی' ذلیل' کمینے یہ میری دشمن کا خون ہے۔ مجھے دھوکا دیا تو نے' میں نے تجھ پر بڑا اعتبار کیا تھا۔ تجھے سنسار کی ساری خوشیاں دے دی تھیں۔ تجھ سے کچھ لیے بنا اور تو نے دھوکا کیا میرے ساتھ تو جانتا ہے میں کون ہوں۔''

میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی پھر وہ بولی۔

''اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ ایک معمولی سی لڑکی کے لیے مجھے دھوکا دیا ہے۔ تو یہ بھول ہے تیری' میں تیرا وہ حشر کروں گی کہ تو یاد رکھے گا..... اگر تجھے لگتا ہے کہ وہ لڑکی بچ جائے گی تو یہ بھی بھول ہے تیری' میں اسے پاتال سے بھی تلاش کر لوں گی..... اور پھر اس کام کے لیے کسی اور کو تیار کروں گی۔ تجھ پر میں نے اپنا وقت برباد کیا بتا کہاں ہے وہ۔''

''نہیں بتاؤں گا میں تجھے۔ اس کا خون نہیں دے سکتا تو مجھ سے کچھ اور مانگ' لیکن اب تو کچھ اور بھی مانگے گی تو بے کار ہے' مجھے اب وہ نہیں چاہیے جو تو مجھے دینا چاہتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تو بچھل پیری ہے' بھٹنی ہے یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔''

''اور کچھ..... اور کچھ۔'' وہ مسکرائی۔

''اور کچھ نہیں۔ خبردار! اس کے بعد میرے سامنے مت آنا۔ سمجھ رہی ہو نا جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب میرے سامنے مت آنا' میں تیرے فریب میں نہیں آؤں گا۔'' جواب میں اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

''تو کیا میرے فریب میں آئے گا پاگل کتے' تجھے کیا فریب دوں گی' یہ چھوٹا سا دھوکا دے کر سمجھتا ہے بڑا کام کر لیا' ارے پاگل' اب جو ہو گا تو وہ دیکھے گا۔''

میں نے دیکھا کہ دونوں بزرگ اندر آئے ہیں' اس کا چہرہ میری طرف تھا اس لیے اس نے پیچھے نا دیکھا۔ پھر شاہ حسین نے کہا۔

''عنایت اللہ دروازہ بند کر دو۔'' اس نے چونک کر دیکھا۔

''تم کون ہو بیوقوفوں کسی کے گھر میں کیوں گھسے آ رہے ہو۔''

''تو اتنا بھی نہیں جانتی بچھل پیری' تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔'' شاہ حسین نے کہا تو وہ چونک کر اپنے پیر دیکھنے لگی تھی۔

''ہوں تو تم دھرماتما ہو..... مہان آتما ہو تم۔ تم ملاہو' مجھے نقصان پہنچاؤ گے بیوقوفوں' اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں بچھل پیری ہوں تو یہ تمہاری بیوقوفی ہے' میں صرف بچھل پیری نہیں' اپنی آتما کو امر کرنا چاہتی

اوں نہیں والی مائی کی پجارن بننا چاہتی ہوں گونا چمارن اور، لینا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھے اپنے پانچ دشمنوں کا خون چاہیے۔ مگر تم کیوں مجھ سے دشمنی لے رہے ہو' یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے بھاگ جاؤ یہاں سے۔۔۔"

"صوفی تم شاہو کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں یہ کون مہان آتما ہے۔ کالی کی پجارن' اسے اور اس کی کالی کو تو میں ٹھکانے لگاتا ہوں۔"

شاہ حسین کے لہجے میں ایک چیلنج چھپا ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں وہ اور زیادہ غضب ناک ہو گئی کہ میں جس پر اس نے "اتنا سمے صرف کیا اور اس نے مجھے دھوکا دے دیا۔

"اب تو اس کی طرف سے میں ہی وکالت کر رہا ہوں' سمجھ رہی ہے نا۔۔۔ اسے کوئی نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ تو پھر مجھ سے مقابلہ کرنا ہو گا تجھے۔"

"ارے جا جا' کیوں اپنی بوڑھی ہڈیوں کو دکھ دے رہا ہے' جا چلا جا' اب بھی مجھے تجھ پہ غصہ نہیں آیا' چلا جا ہم دونوں کے بیچ میں ٹانگ نہ اڑا۔ اسے وہ کرنا پڑے گا جو میں کہہ رہی ہوں۔"

"ایک بات ہے۔۔۔ کیا نام ہے تیرا۔۔۔"

"میرا نام رانی کرشنا ہے۔۔۔"

"ایک بات بتائے گی مجھے کرشنا' آخر سنبل تیری دشمن کیسے بن گئی۔"

"کیوں تیرے باپ کی نوکر ہوں میں کہ تجھے اپنے من کی بات بتاؤں' یہ میرا معاملہ ہے۔"

"اب یہ تیرا اپنا معاملہ نہیں ہے۔"

"تو بس ٹھیک ہے' اب تو آجا ذرا میرے مقابلے پر اس نے کہا اور شاہ حسین مسکرانے لگے۔

"آتو گئے ہیں تو شروع کر۔۔۔" اور وہ شروع ہو گئی اچانک ہی اس کی شکل بدلنے لگی۔ اس کا چہرہ بہت خوب صورت تھا اور میں نے یہ بات کئی بار تسلیم کی تھی۔۔۔ لیکن اب بار بار اس کا چہرہ بدلتا جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ نیچے لٹکنے لگے تھے' اوپری ہونٹ مڑ کر دانت سے جا لگا تھا دانتوں کی لمبائی بڑھتی جا رہی تھی۔ آنکھیں بھیانک انداز میں پھٹنے لگی تھیں' پھر وہ گہری سرخ ہو گئی۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا چہرہ نہیں گوشت ہے۔" آنکھیں دہک رہی تھیں اور پھر اس کے منہ سے آواز نکلی۔

"پاپی بڈھے۔" تیری موت ہی تجھے یہاں گھیر لائی ہے۔ تو کیا کر سکتا تھا۔"

"بھئی ہم لوگ موت کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے' بلکہ ہمارے لیے بہترین موت وہی ہوتی ہے جو کسی بھلائی میں کام آئے' ویسے یہ جگہ بہت چھوٹی سی ہے۔ دل یہ چاہتا ہے کہ کسی کھلے میدان میں تم سے مقابلہ ہو۔ مگر چل ٹھیک ہے ایسے ہی سہی' کیا فرق پڑتا ہے' اب تو ایسا کر پہلے خود کوشش کر پھر ہم کچھ کریں گے۔"

"ہوں تو پھر یہ لے۔۔۔" اس نے اچانک ہی منہ بلند کر کے ایک زور کی آواز نکالی۔ اور اس کے منہ سے لا تعداد لمبے لمبے کیڑے نکل پڑے۔ ان کی لمبائی ڈیڑھ سے دو انچ تھی' وہ مکھیوں کی طرح بھنبھناتے ہوئے چاروں طرف پھیل گئے اور مرشد کی جانب بڑھنے لگے' وہ مسلسل اپنے منہ سے آوازیں نکال رہی تھی۔ پھر وہ کیڑے مرشد کی طرف بڑھے' ہم دونوں کانپ رہے تھے لیکن شاہ حسین اطمینان سے کھڑے تھے۔ اچانک ہی انہوں نے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے' اور فضا میں ایک دھوئیں کا غبار پھیلتا چلا گیا۔ وہ تمام کیڑے اس غبار میں روپوش ہو گئے۔۔۔ پھر اچانک ہی وہ کرشنا کے جسم سے لپٹ گئے۔ وہ ان کو خود سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگی پھر اس نے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اس کے پورے بدن سے روشنی سی پھوٹنے لگی۔ یہ آگ جیسی روشنی تھی جس میں تپش تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام کیڑے جل کر راکھ ہو گئے تو کرشنا نے کہا۔

"اور بول اور بول بڈھے اب کیا کرے گا یہ سب تو جل کر راکھ ہو گئے۔"

"تو نے ہی پیدا کیا تھا اور تو نے ہی ختم کیا' اب میری طرف سے وار کا انتظار کر کیا سمجھی۔"

میرا تیرا کھیل تو شروع ہو چکا ہے بڈھے' اب ذرا

مزے کا کھیل ہو گا' تو سمجھتا ہے کہ تو کامیاب ہو گا' لیکن میں اس کے لیے تیار ہو کر نہیں آئی تھی۔ اب تجھ سے باقاعدہ مقابلہ ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بھاگی۔ اور شاہ صاحب کا قہقہہ فضا میں گونجا۔

"بھاگ گئی سسری کہیں کی' ارے تیرا جب دل چاہے آجانا....." مرشد نے کہا اور پھر عنایت اللہ سے بولے۔ "شیطان بھاگا ہے فنا نہیں ہوا خطرہ قائم ہے کچھ سوچنا پڑے گا' بے خبری مناسب نہیں آؤ بیٹھ کر بات کریں۔"

میرے ہوش خراب تھے۔ اگر تقدیر میں ان لوگوں کا سہارا نہ حاصل ہوتا تو بھلا اس بھتنی کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ ہم سب ایک کمرے میں پہنچ کر بیٹھ گئے۔

"میاں شاہو' اب تمہیں سوچ سمجھ کر سب سوالوں کا جواب دینا ہو گا۔"

"جی شاہ صاحب....." میں سہمے ہوئے انداز میں بولا۔

"پہلی بات کہ میں تمہیں بتادوں کہ یہ عام چھل پیری نہیں ہے' عام چھل پیری انسانوں کو نقصان پہنچانے کے درپہ ہوتی ہیں' انہیں ڈراتی ہیں' خوف زدہ کرتی ہیں' لیکن یہ کالی دیوی کی پجارن ہے' ان کے ہاں کالی دیوی شیطان کے نائب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کالی دیوی کے پجاری امرشکتی کے لیے جادو سیکھتے ہیں۔ اس دوران ان کو لوگوں کا خون بھی پینا ہوتا ہے' خون پینے کے بعد وہ کالی دیوی کو ایک بھینٹ دیتے ہیں اور یہ بھینٹ بھی بے حد عجیب ہے۔ پجاری اپنے جسم کے پانچ مختلف حصوں کو زخم لگاتے ہیں اور پھر ان کا خون جمع کر کے کالی دیوی کو تلک لگاتے ہیں..... اور پھر یہ پجاری امرشکتیوں کے مالک بن جاتے ہیں' کالی دیوی کی طرف سے یہ ایک تحفہ ہوتا ہے' اور پھر یہ پجاری اگر کرشنا کی کیفیت میں ہوں تو انہیں اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے' ایک ایسا سہارا جو ان کے لیے خون فراہم کر سکے' اس کے بدلے میں وہ ان کو وہ دنیاوی آشائشیں تو دے دیتے ہیں لیکن خود ان پجاریوں کو جو طاقت حاصل ہوتی ہے وہ بہت ہی اعلا ہوتی ہے۔ لیکن بیٹے اس طاقت کے سامنے خدائے بزرگ کی طاقت کے سامنے سب ہیچ ہے۔ اس نے نیکی بدی ہمارے سامنے رکھی ہے اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم کون سی زندگی کا انتخاب کریں۔ اسی لیے تم سے پوچھ رہا ہوں۔ عیش و آرام چاہتے ہو یا سنبل کی زندگی۔"

"مرشد میں ہر حال میں سنبل کی زندگی چاہتا ہوں۔"

"ہوں' تو پھر اسی وقت اس جگہ کو چھوڑ دو' اس حرام کی کمائی سے خریدی ہوئی ہر چیز۔ حتی کہ یہ کپڑے بھی۔ صوفی صاحب کا کوئی جوڑا پہن لو لیکن یہ اتار دو کیونکہ یہ موروثی کی کمائی ہے..... اگر مناسب سمجھو تو ان کے ہاں ہی قیام کرو' کیوں قاضی صاحب۔"

"مرشد یہ میرے اپنے ہی بچے ہیں سنبل اتنے پیار سے مجھے بابا کہتی ہے اور خود شاہو بھی وہ میرا احترام کرتا ہے۔ یہ دونوں مجھے بے حد عزیز ہیں' میرا پورا گھر حاضر ہے ان دونوں کے لیے۔"

"شاہو' ایک بار پھر سوچ لو۔"

"مرشد اب میرے فیصلے آپ لوگوں نے کرنے ہیں۔ اس کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں۔"

پھر ہم لوگ وہاں سے اٹھے اور اس گھر کو چھوڑ کر صوفی صاحب کے گھر آگئے' شاہ صاحب نے سب سے پہلے سنبل کا جائزہ لیا پھر بولے۔

"یہ صبح تک ہوش میں آجائے گی' اسے صرف بے ہوش کیا گیا تھا تاکہ یہ تمہارے کام میں مزاحمت نہ کرے' اس جادو کا اثر صرف آج رات تک کا ہے۔ صبح یہ ہوش میں آجائے گی اور خبردار اسے کچھ مت بتانا۔"

"لیکن مرشد اسے ہوا کیا ہے۔" بانو جو اب تک خاموش کھڑی تھی اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بہن' بس بے چارے بچے آسیب کا شکار ہیں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" مرشد نے کہا۔

"ہاں بیگم' بس وہ گھر کچھ ٹھیک نہیں ہے' بچے ہمارے پاس ہی رہیں گے۔ بس تم سے درخواست ہے

ا۔ سنبل کو کچھ نہ بتانا۔ اس میں ان بچوں کی بھلائی ہے۔"

"میرے لیے ان بچوں کی زندگی سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے' جیسا آپ چاہیں۔"

"چائے کا انتظام کردیں پھر۔" صوفی صاحب نے کہا۔

"ابھی لائی۔" وہ کہہ کر کچن میں چلی گئیں۔ ہم تینوں ڈرائنگ میں آبیٹھے۔

"صوفی' وہ بدبخت اتنی آسانی سے نہیں مانے گی۔ وہ اس لیے بھاگی ہے کہ اسے مقابلے کی امید نہ تھی۔ اب وہ زیادہ غضب ناک ہو جائے گی۔ اس کے لیے کوئی مناسب انتظام کرنا پڑے گا تاکہ وہ فنا ہو جائے۔ کیونکہ شاہو کے علاوہ وہ کسی اور کو بھی اس مقابلے کے لیے استعمال کر سکتی ہے لیکن ایک بات جو ہمارے حق میں جاتی ہے کہ شاہو نے مورتی کے لیے بڑی ہمت اور دلیری کا ثبوت دیا اور اتنی ہی دلیری سے اس سے پیچھا چھڑالیا۔ اور کوئی دوسرا جاپ کے دوران ڈگمگا گیا تو گیا' کرشنا کے پاس کوئی دوسرا طریقہ نہیں لالچ دینے کا' اس طرح کرشنا کا منصوبہ ادھورا ہی رہے گا' اس دوران ہم ان شاء اللہ کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے اور اسے فنا کردیں۔"

"جی مرشد یقیناً۔۔۔"

"اس دوران تم لوگوں کو صبر سے کام لینا ہوگا' اس دوران لڑکی کو بے خبر رکھا جائے اور ہاں صوفی میں کچھ دنوں کے لیے جارہا ہوں۔"

"کہاں مرشد۔۔۔"

"بس کچھ کام ہیں اور کچھ عمل بھی کرنے ہیں تم لوگ اطمینان رکھو ہمت اور صبر سے کام لینا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ میں تھوڑے دنوں میں واپس آجاؤں گا۔"

"جی بہتر۔" صوفی صاحب نے کہا۔

"اور سنو لڑکے' اللہ کے نزدیک بہتر کمائی حلال اور محنت کی ہے' ہاتھ سے کمانے والا اللہ کا دوست ہے' چنانچہ تم محنت کر کے کماؤ' اس میں برکت بھی ہے اور خیر بھی۔"

"جی مرشد۔۔۔" پھر چائے آگئی چائے پینے کے بعد شاہ حسین کھڑے ہو گئے۔

"اچھا صوفی اجازت دو' جلد ہی ملاقات ہوگی۔"

"مرشد کھانا تو کھالیں۔"

"میرا اپنا ہی گھر ہے صوفی' کھانا پھر سہی۔" پھر وہ چلے گئے' صوفی صاحب نے کہا۔

"میاں شاہو کچھ دیر آرام کرلو پھر کھانا کھائیں گے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں شاہ صاحب ہمارے ساتھ ہیں اللہ نے بالکل مناسب وقت میں ان کو ہماری مدد کے لیے بھیجا ہے۔"

"جی صوفی صاحب۔" پھر میں ان کے بتائے ہوئے کمرے میں مسہری پر جا کر لیٹ گیا۔ "شکر ہے اللہ تو نے بچالیا' پہلے ہی مرحلے میں بچالیا اور کرشنا کے ناپاک عزائم خاک میں مل گئے' اللہ کی طرف سے رہنمائی ہوئی تھی ورنہ جانے کس کس کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑتے' وہ لوگ میری سنبل کی طرح بے گناہ ہوتے۔ لیکن شکر کرتا ہوں کہ میں بچ گیا پھر ایسے نیک لوگ ملے تھے کہ ان کی مہربانیاں ہی ختم نہیں ہو رہی تھیں' ہر طرح سے تعاون کیا تھا انہوں نے میرے ساتھ' بڑی مدد کی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اے کاش ہمیں بھی ان کی خدمت کا موقع مل جائے۔

انہی سوچوں میں گم میں کافی دیر لیٹا رہا پھر قاضی صاحب آگئے۔

"چلو بھئی کھانا تیار ہے منہ ہاتھ دھو کر آجاؤ۔" میں منہ ہاتھ دھو کران کے ساتھ کمرے میں آگیا۔ بڑا ہی پرتکلف کھانا تھا' میں صوفی صاحب کے ساتھ والی کرسی پر جا بیٹھا' انہوں نے میرے لیے سالن ڈالا اور ایک پلیٹ میں روٹی رکھی' پھر اپنے لیے سالن ڈالنے لگے۔ ماں جی بھی وہیں موجود تھیں۔

"کھانا شروع کرو بیٹا۔" صوفی صاحب نے کہا لیکن میں اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔

"شروع کرو شاہو۔" انہوں نے پھر کہا اور میں سر جھکا کر رونے لگا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"میں تمہارے دل کی کیفیت سے بخوبی واقف ہوں' پہلی بات یہ کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ ہم تم پر احسان کر رہے ہیں اور تم ہمارے احسان کے بوجھ تلے دب رہے ہو تو یہ بات بھول جاؤ' ہم تم کو اپنا بیٹا بیٹی مانتے ہیں۔ اور اولاد کے لیے کچھ کرنا احسان نہیں۔۔۔ دوسرا تم سنبل کے لیے پریشان ہو تو اگر اللہ نے چاہا تو وہ کل صبح تک ہوش میں آجائے گی۔ اور یہ بھی اطمینان رکھو کہ کرشنا اسے کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ان شاء اللہ وہ اپنے انجام کو پہنچے گی اور فنا ہو جائے گی۔ چنانچہ جسم کی ضرورت کی خاطر کچھ کھالو۔ خود کو سنبھالو' تم ہمت ہار گئے تو سنبل کا کیا ہو گا' جس کے لیے تم نے سارے عیش ٹھکرا دیے ہیں' اب کیا اسے دوبارہ ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا چاہتے ہو۔"

"نہیں صوفی صاحب۔۔۔"

"تو پھر خود کو سنبھالو بھی اور تھوڑا سا صبر بھی کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ' چلو اب کھانا شروع کرو۔" وہ اتنی محبت سے بولے کہ میں نے اپنے آنسو صاف کیے اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

دوسری صبح سنبل ہوش میں آگئی تھی۔ اس وقت بانو بیگم اس کے قریب ہی تھیں' انہوں نے آکر بتایا کہ سنبل ہوش میں آگئی ہے اور مجھے پکار رہی ہے' میں پھرتی سے اٹھا تو صوفی صاحب نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔

"صبر' تحمل۔۔۔"

"جی جناب' میں سمجھتا ہوں۔" پھر ہم سب اس کے پاس پہنچ گئے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔۔۔ بانو بیگم نے کہا۔

"لیٹی رہو بیٹی۔"

"میں اس وقت کہاں ہوں۔۔۔"

"تم اپنے بابا کے گھر میں ہو۔۔۔"

"لیکن بابا ہم اپنے گھر میں تھے' پھر یہاں کیسے اور شاہو کہاں ہے۔" پھر اس نے مجھے دیکھ لیا۔

"اچھا آپ یہیں پر ہیں۔"

"اصل میں تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی اور تم بے ہوش ہو گئی تھیں ہم تمہیں یہاں لے آئے اور اب تم یہاں رہو گی۔"

"مگر بابا۔۔۔"

"ماں باپ کے ساتھ ضد نہیں کرے' اگر تم ہمارے پاس رہو گی تو کیا حرج ہے' پھر شاہو بھی یہیں ہے۔" اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں کوئی ہرج نہیں آج سے ہم یہیں رہیں گے' اچھا ہے تمہارا بھی دل لگا رہے گا اور ان لوگوں کا بھی اور پھر تمہارا بھی کچھ فرض بنتا ہے کہ ان لوگوں کی خدمت کرو۔"

"جی بالکل۔۔۔" سنبل نے کہا بہرحال وہ نارمل حالت میں تھی' اس بات پر ہم لوگوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

"پھر دو تین دن اسی طرح گزر گئے۔" چوتھے دن میں نے صوفی صاحب سے کہا۔

"صوفی صاحب۔"

"ہوں۔۔۔"

"قاضی صاحب میں کوئی محنت مزدوری کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔"

"آپ سے ایک مشورہ کرنا چاہتا ہوں کہ کیا کام کروں۔"

"ہوں' کام کب سے شروع کرنا ہے۔"

"آج سے۔۔۔"

"ایک دو دن اور رک جاتے۔۔۔"

"نہیں صوفی صاحب' اب میں کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔" صوفی صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے پھر کہنے لگے۔

"میاں۔۔۔ کام کیا کرو گے۔۔۔"

"کچھ بھی' کسی بھی طرح کا کام ہو۔"

"لکھنا پڑھنا آتا ہے۔"

"جی بالکل۔۔۔"

"ہمارے ایک دوست ہیں ریاض الدین ایک کمپنی میں منیجر ہیں۔ ان کے پاس لے جاؤ' وہ کچھ نہ کچھ کام دے دیں گے۔"

"جی ٹھیک ہے۔۔۔"

"یہ ان کا پتا ہے۔۔۔" صوفی نے ایک کارڈ نکال کر مجھے دیا' جس پر اس کمپنی کا پورا پتا لکھا تھا۔ "ان سے میرا نام لینا' ان شاء اللہ وہ تمہیں کوئی نہ کوئی کام دیں گے۔"

"جی صوفی صاحب۔۔۔" میں نے کہا۔

پھر میں نے خود ہی صوفی صاحب کا ایک سوٹ نکال کر پہن لیا۔۔۔ یہ ضروری تھا اور اس پر انہوں نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔

"لو یہ کچھ پیسے رکھ لو اور واپسی پر اپنے لیے کپڑے خرید لینا۔" میں نے وہ پیسے بھی جیب میں رکھ لیے۔ پھر میں باہر نکل گیا۔ اس پتے پر پہنچنے پر مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ریاض الدین بہت اچھی طرح پیش آئے تھے' انہوں نے مجھ سے چند سوال کیے۔ پھر کہنے لگے

"آپ کو ڈرائیونگ آتی ہے۔۔۔"

"جی نہیں سر۔۔۔"

"اگر میں آپ کو ڈرائیونگ سکھانے کی کوشش کروں اور ساتھ ہی میرے ذاتی ڈرائیور کی نوکری پیش کروں تو۔۔۔"

"جی مجھے خوشی سے یہ نوکری منظور ہوگی۔۔۔"

"بس پھر میرا ایک آدمی آپ کو ڈرائیونگ سکھا دے گا۔۔۔" اور لائسنس بھی بنوا دے گا' شناختی کارڈ تو ہے نا آپ کے پاس۔"

"جی نہیں۔۔۔"

"خیر وہ بھی بن جائے گا آپ فکر نہ کریں۔"

اس کے بعد ایک آدمی نے سارا دن مجھے ڈرائیونگ سکھائی' وہ مجھے ایک میدان میں لے گیا تھا۔ میں وہاں مشق کرتا رہا۔ شام کو میں نے آکر صوفی صاحب کو کہا' وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ پھر دو تین دن میں میں کافی رواں ہو گیا۔۔۔ چوتھے دن انہوں نے مجھے اپنے آفس بلایا تھا اور کہنے لگے۔

"یہ گاڑی کی چابی لو اور گھر چلے جاؤ' بیگم صاحبہ کو بتا دینا اور یہ گھر کا ایڈریس ہے۔" انہوں نے ایک چٹ مجھے پکڑا دی' جس پر گھر کا ایڈریس لکھا تھا۔

"سر وہ میرا لائسنس۔۔۔"

"ارے ہاں۔۔۔" انہوں نے کہا اور میز کی دراز سے شناختی کارڈ اور لائسنس نکال کر میرے حوالے کیا۔ میں انہیں سلام کر کے باہر آگیا۔

میں گاڑی لے کر گھر پہنچ گیا' بیگم صاحبہ روایتی قسم کی خاتون تھی۔ چند ایک سوالات کیے اور مطمئن ہو گئیں۔ میں نے کام شروع کر دیا پھر ایک ہفتے بعد انہوں نے ایک لفافہ مجھے تھماتے ہوئے کہا کہ۔

"یہ ایڈوانس تنخواہ رکھ لو' تمہاری بھی ضروریات ہوں گی۔" میں نے شکریہ کے ساتھ وہ لفافہ رکھ لیا اور گھر آکر وہ لفافہ بانو بیگم کو دے دیا۔ تو وہ بولیں۔

"یہ کیا ہے۔۔۔؟"

"تنخواہ ہے میری۔۔۔"

"تو تم رکھو۔۔۔"

"اب آپ غیروں والی باتیں کر رہی ہیں۔۔۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے شاہو' آپ رکھ لیں۔" صوفی صاحب نے کہا۔ سنبل بھی اس بات سے بہت خوش تھی اب وہ زیادہ تر چپ رہتی تھی' میں بھی اس سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ ویسے بھی اب مجھے صرف کرشنا کے خاتمے کا انتظار تھا۔ میں شاہ حسین کا انتظار کر رہا تھا کہ کب وہ آئیں اور اس کا خاتمہ کریں پھر ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔

(باقی آئندہ)

☼ ☼

آسیب

سیمیں کرن

جادو، شرکیہ تعویز اور عملیات بیماریوں کی جڑ ہیں اکثر عاملوں نے روحانی اور قرانی علاج کو محض کاروبار بنا لیا ہے نجومیوں اور عاملوں سے رجوع کرنے کی بنیادی وجہ جہالت اور کم علمی ہے۔ توہم پرست اور جاہل لوگوں کی کثیر تعداد ان کو اسلام کا ولی سمجھتے ہوئے ان کی مرید ہوجاتی ہے یہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ان پر آسیب ہے اور وہ جنات کو بھگانے کا علم جانتے ہوئے ان کا جنات سے چھٹکارا دلواسکتے ہیں۔

جھوٹے مسیحاؤں کے چہرے بے نقاب کرتی ایک دل خراش تحریر

وہ تکلیف اور جلن سے تڑپ رہی تھی' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ تن کے کپڑے بھی اتار پھینکے' اتنی شدید حدت تھی کہ جو اس کی برداشت سے باہر تھی' وہ اپنی ہتھیلیوں اور پیروں کے تلوؤں کو بری طرح ٹھنڈی زمین سے رگڑ رہی تھی' بار بار ہاتھوں اور پیروں کو ٹھنڈے پانی میں ڈبوتی اس کی بے چینی اور تکلیف اپنے عروج پر تھی' اتنی سردی میں بھی اس نے باریک سا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا اور وہ بھی اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا' وہ تکلیف سے کراہی۔

''اماں جلن بہت ہے بدن کے اندر کانوں کے اندر نتھنوں کے پردوں میں ہر جگہ جیسے کوئی گرم سلاخوں سے جلا رہا ہے نہیں ہو رہا برداشت مجھ سے' میرے ہاتھوں پیروں میں جلن خارش اور آگ ہے۔'' اس کی ساس جو اس کے سر پر کھڑی بے حسی سے اس کا تماشا دیکھ رہی تھی اس کی بات سن کر بولی۔

''ہائے پھر پڑ گیا نمانی کو دورہ' حق ہا ہمارے نصیب میں تو کوئی خوشی لکھی ہی نہیں' پیر بھاری ہوتا ہے تب ہی اس کے دورے بڑھ جاتے ہیں ہائے ہائے ستیاناس ان شریکوں کا' جانے کیسا آسیب پیچھے لگایا ہے گھر میں خوشی کو ترس گئے ہیں۔'' وہ تکلیف سے کراہی۔

''اماں تمہیں کتنی بار بتایا ہے کچھ نہیں مجھے یہ کوئی آسیب ہوائی چیز نہیں بس الرجی ہوجاتی ہے مجھے' پکڑ یہ پرچی مجھے (Avil) کا ٹیکا لگوادے' اماں شادی سے پہلے بھی ہوجاتی تھی مجھے کبھی کبھار اس حالت میں بڑھ جاتی ہے اور کچھ نہیں۔'' مگر اس کی ساس اور بھی بلند آواز میں سینہ کوبی کرتے بولی۔

''نہ کیسے کچھ نہیں' ہائے ہائے ماں نے یہ روگ لڑکی ہمارے پلے ڈال دی' ارے دورہ ہی ہے جو پڑا ہے مگر ایسا میسنا' مامااس کا مجال ہے جو منہ سے بھاپ نکالی ہو کہ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے' یہ الرجیاں بتاتی پھرتی ہے ارے الرجیاں کیا بچے نگل جاتی ہیں ہائے ہائے ہمارے تو نصیب سڑ گئے تھے جو اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے اس نصیبوں جلی کو بیاہ لائی' چار سال ہو گئے ایک بلی کا بچہ تک نہیں نصیب میں ہوا' دفعہ دو بیٹیاں پیدا کیں وہ بھی مردہ جانے کیا روگ لگا کر لائی ہے۔''

یہ مکالمہ جانے کتنی بار دہرایا جا چکا تھا نہ اماں ہی باز آئی تھی اور نہ وہ رکتی تھی اس کی تصحیح کرنے سے مگر اس وقت جلن سے بے حال تھی ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''اماں تو مجھ سے بعد میں لڑلینا جو طعنے دینے ہوں دے لینا جو ہوا ہو منوالینا' مگر تیری مہربانی اس وقت مجھے



ٹیکا لگوا دے میں مر رہی ہوں تکلیف سے۔" مگر اماں ہنوز بے حسی کی ردا اوڑھے بولی۔

"اے دفعہ دور جا مرے جا کر مگر اس دفعہ اگر بچے کو کچھ ہوا تو میں تجھے بتا رہی ہوں میں آصف کی دوسری شادی کروا دوں گی ارے مجھے اپنی نسل چلانی ہے اپنے بیٹے کو ہرا بھرا دیکھنا ہے۔" وہ اندر ہی اندر لرز اٹھی اماں کے فیصلہ کن انداز کو دیکھ کر مگر اس وقت تکلیف کچھ سوچنے کا موقع نہیں دے رہی تھی' وہ شکست خوردہ انداز میں گویا ہوئی۔

"اچھا اماں جو تیرا دل کرے جو تو کہے میں مان لیتی ہوں مگر اس وقت مجھے ٹیکا لگوا دے۔"

اماں کچھ دیر آنکھوں میں چمک لیے اسے دیکھتی رہی پھر پختہ انداز میں بولی۔

"میں ٹیکا تجھے اس شرط پر منگوا کر دوں گی جو تو میرے ساتھ پیر سائیں کے پاس جانے پر راضی ہو جائے۔" اور یہ موقع تھا جب روبینہ ہار گئی تو تڑپتے ہوئے بولی۔

"اچھا اماں جو تو کہے مگر اس وقت مجھ پر رحم کر۔"

اور پھر کچھ دیر بعد جب قادر اس کو آ کر ٹیکا لگا گیا اور کچھ دیر بعد اسے جیسے سکون سا ہو گیا تو اس نے ان سب باتوں کو دل ہی دل میں دہرایا جو اس کی ساس اسے کہتی رہی تھی' اک ملال اور دکھ کی گہری چادر تھی جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ یہ کیسی ظالم عورت ہے جسے میرے دکھ درد سے کوئی سروکار نہیں اور اس تکلیف کے عالم بھی یہ اپنے مطالبات منوانے کے چکر میں پڑی تھی اور پھر اس نے اس کے مطالبات کو دہرایا اس کی دھمکی کو۔

"آصف کی دوسری شادی یا پھر پیر سائیں کے پاس حاضری۔"

اس کے دل پر جیسے گھونسا سا پڑا گو کہ آصف نے کون سا اسے تخت پر بٹھا رکھا تھا اسے یہاں ماں کے پلے ڈال کر خود باہر جا بیٹھا تھا مگر جو بھی تھا اس کے سر کا سائیں تھا دنیا میں واحد آسرا' حالانکہ جب سے اوپر تلے اس کی دو بیٹیاں ہو کر فوت ہو گئیں تو وہ اس سے جیسے مزید بیگانہ اور بے زار ہو گیا تھا سال چھ مہینے بعد و چکر لگاتا مہینے کی چھٹی مہمانوں کی طرح گزارتا اور ان چار سالوں میں تیسری دفعہ اس کا پاؤں بھاری تھا۔

نہ تو کبھی اس نے یہاں آ کر اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانے کی زحمت کی نہ ہی وہ اسے اتنے پیسے دے کر جاتا کہ وہ خود سے کوئی قدم اٹھالے اور پیسے اگر ہوتے بھی تو اس کی ساس ان ناز نخروں کے سخت خلاف تھی اس کی دونوں بیٹیاں قریبی سینٹر میں جو کوالیفائیڈ نرس نے کھول رکھا تھا وہیں ہوئی تھیں اچھی خاصی نارمل صحت مند بچیاں اور پیدا ہونے کے کچھ عرصے بعد ہی نیلی پڑ کر مر گئیں۔

اسے اپنی بچیاں یاد آئیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اب تیسری دفعہ' وہ سوچ کر لرز اٹھی و جانتی تھی کہ اس کی حالت اس مرتبہ پہلے سے زیادہ خراب ہے نرس نے اس کی ساس کو کہا بھی تھا کہ خال جی اپنی بہو کو کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر کو دکھائیں یہ بہت زیادہ کمزور ہے وہ اس کے سارے ٹیسٹ کروا کرا اچھی دوائی دے گی مگر اس کی ساس نے نخوت سے س ہلا دیا تھا' یہ سب سوچ کر اس کے آنسوؤں میں شدت آ گئی اس نے بے بسی سے سوچا کہ وہ کیا کرے اور آنس تھے کہ رکنے کا نام نہ لیتے تھے' اس کی ساس نے اسے روتے دیکھ کر لتاڑا۔

"ارے کس کا سوگ منا رہی ہے تو' کیوں نحوست پھیلا رکھی ہے؟" پھر اس کی خاموشی دیکھ کر اپنے لہجے نرم کرتے ہوئے بولی۔

"کل چلنا میرے ساتھ پیر سائیں کے دربار پر' الل کے پہنچے ولی ہیں۔ مزار پر چادر چڑھائیں گے ان کی د سے رب سائیں تیری گود بھر دے گا اور تجھ پر جو بھی اثر ہے ہوائی چیز کا وہ اسے بھگا دیں گے قابو کر لیں گ سنا تو نے تیار رہیو اب کوئی بحث نہ سنوں میں ورنہ م نے تجھے بتا دیا ہے کہ میں آصف کی دوسری شادی ک

"ہاں کی پھر ہاتھ ملتی رہنا۔" اس نے ملال بھری نظروں سے اماں کو دیکھا اور خاموشی و افسردگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆ ☆ ☆

روبینہ خود ایف اے پاس تھی ابھی فرسٹ ایئر میں تھی کہ امی ابا دونوں بس حادثے میں اللہ کو پیارے ہوگئے اور اس کی اور اس سے چھوٹے بھائی کو ماموں کے پاس آنا پڑا' ایک بہن جو اس سے بڑی تھی شادی شدہ تھی اپنے گھر میں خوشحال تھی بہت امیر نہ سہی مگر اچھی سفید پوشی کا بھرم ڈھکا تھا مگر اس کا میاں بہت کرخت مزاج تھا روبینہ کبھی اس سے بے تکلف نہ ہو سکی' ماموں مامی نے اس کا بوجھ فافٹ ڈھونے کی کی' آصف کا رشتہ آیا میٹرک فیل آصف دوبئی میں الیکٹریشن تھا مناسب شکل و صورت دونوں بہنیں شادی شدہ ماموں نے جھٹ پٹ رشتہ قبول کر لیا اور وہ بیاہ کر اس قصبے نما چھوٹے سے شہر میں آگئی جہاں زندگی کی تقریباً" ہر سہولت میسر تھی۔ مگر سہولتیں لوگوں کے ذہن و سوچ کو تو تبدیل نہیں کرتیں اور روبینہ بھی جن لوگوں میں بیاہ کر آئی تھی ان کی سوچ کو بدل نہیں سکی تھی' ماموں مامی بھی کبھار رسم دنیا کو خبر گیری کر لیتے اور یہی حالات اس کے شوہر اور ساس کو مزید دلیر کرتے تھے۔

اس نے اپنے آنسو پونچھے مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اسے ہر صورت اپنی گھر گرہستی کو بچانا تھا اپنے بچے کو بچانا تھا اس نے دل سے کسی معجزے کی دعا کی مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کوئی معجزہ نہیں رونما ہو گا اسے خود سے ہمت کرنی ہو گی' ماموں مامی کے بارے میں سوچ کر اس نے خود ہی سر نفی سے ہلا دیا' وہ جو اس کی بچیوں کی فوتگی پر گھڑی دو گھڑی کو آئے اور مامی جو اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہی تھیں گویا اسے کوئی چھوت کا مرض لگا ہو جو کوئی اس کے پاس جائے گا وہ ہی لپیٹ میں آجائے گا۔

سوچ کے تمام تر دھارے صرف ثمینہ اس کی بڑی بہن پر کھلتے تھے' بھائی اس قدر چھوٹا تھا کہ کسی بوجھ کو اٹھانے کے قابل نہ تھا' خود ماموں کے رحم و کرم پر تھا' آخر اس نے سوچ لیا کہ اسے اس معاملے میں ثمینہ کی مدد لینی ہی پڑے گی۔ اس نے ارادہ باندھا کہ اگر اسے اپنی سخت گیر بہنوئی کے پیروں میں گر کر بھی مدد مانگنی پڑی تو وہ مانگ لے گی کل کلاں کو اگر اس کی ساس نے واقعی آصف کی دوسری شادی کر دی تو پھر بھی تو اسے ثمینہ کے در کی خاک چھاننی پڑے گی۔ ماموں ممانی تو اسے کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے دھڑکتے دل سے ثمینہ کو فون کر دیا' وہ اس کی آواز سنتے ہی بولی۔

"ارے بہنا آج تجھے کیسے میری یاد آگئی۔ سچ میں تو ترس جاتی ہوں تم لوگوں کو ملنے کو دیکھنے کو۔" وہ بھرائی آواز سے بولی۔

"بس آگئی مگر جیسا تم کہہ رہی ہو یہی سچ ہے تو کبھی آکر دیکھ ہی جایا کرو کہ تمہاری چھوٹی بہن جیتی بھی ہے یا پھر ظلم کی چکی میں پستے پستے مر گئی۔ کہنے دیکھنے کو میرا میکا تم ہی تو ہو پھر میں اتنی بے آسرا کیوں ہوں تمہارے پاس تو اپنی گاڑی ہے شوہر کا ساتھ ہے اور میں۔۔۔" آگے اس سے بولا ہی نہ گیا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ثمینہ اس کے گلے شکوے اور اس کی تکلیف و حالت کو محسوس کر کے تڑپ کر بولی۔

"بول بہنا تجھے میری قسم بول کیا ہوا ہے؟ دیکھ مجھے مزید پریشان نہ کر' دکھ تو بتانے سے ہی پتا چلتے ہیں۔" وہ چیختے ہوئے بولی۔

"نہیں اپنوں کو دور سے بھی نظر آتے ہیں' تمہیں کیوں نہیں نظر آئے میرے درد۔" ثمینہ کے ہاتھ پاؤں بھول گئے اس کی حالت پر وہ اسے پچکارتے ہوئے بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے غلطی ہو گئی' معاف کر دو مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔" اور روبینہ نے روتے ہوئے اسے تمام بات بتا دی اور روتے ہوئے بولی۔

"اب بتاؤ بھلا میں کیا کروں' نہ دوا دارو نہ علاج اور تیسرا بچہ' اس پر ساس کے ظلم و ستم اور میاں کی دوری و بے رخی اور اب یہ پیروں فقیروں کا ٹنٹا اس حال میں یہ مجھے کہاں خوار کرائے گی۔" ثمینہ تشویش سے بولی۔

"تو تم نے آصف کو بتایا وہ کیا کہتا ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"اس نے کیا کہنا ہے' اگر وہ چاہے تو مجھے اچھی سے اچھی ڈاکٹر کو دکھا سکتا ہے مگر وہ کہتا ہے جو اماں کہتی ہے وہ کرو' نرا جاہل ہے بالکل ضعیف العقیدہ' مجھے تو لیکن ان پیروں پر بالکل بھروسا نہیں لیکن اب تو مجھے بھی وہم ہونے لگا ہے کہ واقعی مجھ پر کچھ آسیب ہے۔" وہ لحظہ بھر کو رکی۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ اس کا جی مجھ سے بھر گیا ہے یا پھر اس کو کوئی اور باہر پسند آگئی ہے وہ مجھے فون نہیں کرتا۔ کرے بھی تو بڑی بے رخی اور بیگانگی ہوتی ہے اس کے لہجے میں۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے اسے کوئی خوشی نہیں دی کوئی سکھ نہیں دیا اور یہ کہ......" وہ پھر بات کرتے کرتے رو پڑی۔

"اور یہ کہ مجھ میں کوئی روگ ہے کوئی سایہ اور آسیب ہے میں کبھی زندہ بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔ کیا واقعی میرا یہ بچہ بھی نہیں بچے گا کیا واقعی کسی آسیب کی وجہ سے میری یہ حالت ہے؟" ثمینہ اسے دلاسا دیتے ہوئے بولی۔

"اتنا سب کچھ تم نے کبھی مجھے نہیں بتایا ہمیشہ اک فاصلہ ہی رکھا اور پھر میرے میاں اور سسرال کا مزاج ایسا تھا کہ... تم فکر نہ کرو آصف کا نمبر دو میں اسلم سے بات کرواتی ہوں اس کی اور کچھ دنوں میں آکر تمہیں لے جاؤں گی اپنے پاس کچھ روز کے لیے' یہاں تمہارا اچھی طرح چیک اپ کرواؤں گی۔" وہ ہراساں ہو کر بولی۔

"کبھی نہیں وہ کبھی اجازت نہیں دے گا وہ دے بھی دے تو اماں کبھی نہیں جانے دے گی تم نہیں جانتی ثمینہ اس کو مجھ سے بے دام غلام کہاں سے ملے گی وہ تو اگر آصف کی دوسری شادی بھی کروا دے تو مجھے اپ پاس ہی رکھے گی اپنی خدمت کے لیے۔" وہ مایوسی انتہا پر تھی مگر ثمینہ نے اسے حوصلہ دیا۔

"یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو کہ میں یہ کیسے کرتی ہوں مگر اپنی ہمت اور حوصلہ جمع رکھو۔"

"بس مجھے تمہاری اتنی ہی مدد کی ضرورت ہے کہ اپنا حوصلہ مضبوط رکھو باقی میں سب سنبھال لوں گی۔" روبینہ کو سچ مچ خود میں اک نئی قوت کا احساس ہوا وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔

"اور جو صبح اماں نے پیر کے پاس لے جانے کی ضد لگائی تو وہ... اس کا کیا کروں۔" ثمینہ نے بڑے رسان سے اسے سمجھایا۔

"چند دن کی بات ہے وہ جو کہتی ہیں مان لو ضد مت لگاؤ۔" وہ کچھ دیر کو خاموش ہو گئی پھر آہستگی سے بولی۔

"میرا مان رکھ لینے کا میرے دکھ بانٹنے کا شکریہ۔" و ہنس کر بولی۔

"پگلی کہیں کی۔"

✡ ✡ ✡

اگلے دن اماں نے فارغ ہوتے ہی اسے تیار رہنے حکم دیا وہ بظاہر خاموشی سے اٹھ گئی مگر اندر ہی اندر لرز ہراندام تھی' اس نے ان جھوٹے جعلی پیروں فقیرو کے اتنے قصے سن رکھے تھے کہ وہ بہت بری طرح خوف زدہ تھی پھر کہیں کہیں وہ اندر سے ڈول جاتی اور ہول کر سوچتی۔

"ہو سکتا ہے واقعی یہ کوئی جادو آسیب اور سائے کا چکر ہو' آخر میری بظاہر بالکل صحت مند بچیاں کیسے دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گئیں اور یہ میری تکلیف جسے اماں دورہ کہتی ہیں کتنی بڑھ گئی ہے آخر اس کا کوئی سبب تو ہو گا نہ۔"

روبینہ نے خود کو چادر میں اچھی طرح لپیٹا اور اماں کے ساتھ چل پڑی' چادر میں اچھی طرح لپٹی دھان پان

ں نازک سی روبینہ کہیں سے لگتی نہ تھی کہ وہ تیسری
ر ماں بننے جارہی تھی اور اس کا پانچواں مہینہ چل رہا
ھا۔

وہ مختلف وسوسوں میں گھری خاموشی سے چلتی
انے کب پیر سائیں کے دربار پہنچ گئی' وہی تمام
وازمات جو اس طرح کے درباروں کے ہوتے ہیں دو
کمرے ملاقاتیوں سے بھرے تھے زیادہ تر عورتیں ہی
ھیں اور جو مرد تھے وہ کمروں سے باہر احاطے میں تھے
یک چھوٹا سا حجرہ تھا جہاں پیر سائیں بیٹھتے تھے اور
لاقاتی ایک ایک کر کے اپنی باری پر حاضری دیتے
وگوں کو آپس میں جھگڑنے سے بچانے کے لیے دربار
کے ملازمین دھیان رکھتے کہ لوگوں کو باری کے حساب
سے بٹھائیں' ان کمروں سے باہر کھلا کچا احاطہ تھا جو مزار
سے منسلک بھی تھا اور دربار کو کچھ مزار اور مسجد سے
علیحدہ بھی کرتا تھا' مزار کے باہر ملنگ بیٹھے تھے لوگ
آجارہے تھے نذرانے چڑھاوے چڑھاتے منتیں مانگتے
چادریں چڑھاتے۔

روبینہ نے بے بسی سے سوچا "جانے ان میں سے کون کون میری طرح مجبور ہو کر آئے ہوں گے۔"

باری آنے پر وہ اپنی ساس کے ساتھ پیر سائیں کے حجرے میں داخل ہوئی۔ باریش سفید داڑھی والے سفید اجلے کپڑے پہنے اپنے سفید بالوں اور داڑھی کی نسبت کافی صحت مند اور نسبتاً "جوان دکھنے والے پیر سائیں سرخ و سفید پر جلال چہرہ سرمگیں آنکھیں لال ڈورے لیے ہوئے آنے والی اکثر عورتیں تو ان کی نورانی شخصیت سے آدھی صحت یاب و بافیض ہوجاتیں۔

پیر سائیں نے نگاہ اوپر کی چمکتی پراسرار آنکھیں کھوجتی ہیں' روبینہ کو لگا کہ اندر پار ایکسرے کر گئیں اور سب حال دل معلوم کرلیا۔ پیر سائیں نے لحہ بھر کو نگاہ کر کے نظر جھکالی اور بلند آواز میں بولے۔

"بی بی تیرا مرض پڑھ لیا میں نے جان لیا میرے موکل بتا گئے' سب مجھ کو تیرے بچے اس وقت تک نہیں بچیں گے جب تک یہ سایہ تیرا پیچھا نہیں چھوڑے گا' کہاں سے اس غلیظ موذی کو پیچھے لگا لیا تھا۔" اماں تو بس پیر سائیں کے قدموں میں گر گئی روتی بلکتی۔

"آپ کرامت والے ہو کچھ کرو بن بتائے سب جان گئے ہمیں علم ہے آپ کے پاس مدد کرو۔" پیر سائیں نے آنکھیں موند کر کہا۔

"کریں گے ضرور کریں گے اللہ کے حکم سے مدد کرنے ہی بیٹھے ہیں' تو ایسا کر تھوڑی دیر کے لیے بچی کو ادھر چھوڑ دے' تو باہر بیٹھ اور سن کسی آواز پر اندر مت آنا ورنہ نقصان کی اس کوکھ میں پلنے والے بچے کی جان کا ذمہ تجھ پر ہوگا۔"

جہاں دیدہ اماں اس انوکھی فرمائش پر دم بخود تھی اس نے سنا تھا کہ کچھ پیچیدہ اور خاص خاص عورتوں کو یہی پیر سائیں اس طرح روکتے تھے ان کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں بن رکھی تھی' اماں نے لحظہ بھر کو ٹھٹک کر پیر سائیں کو دیکھا ان کی سفید نورانی داڑھی کو پھر اپنی نڈھال بدحال سی بہو کو جو اس حال میں تھی' اسے لگا کہ اس میں کوئی حرج تو نہیں اور یہ نہ ہو کہ پیر سائیں جلال میں آ کر کچھ اور مصیبت پیچھے لگا دیں' وہ خاموشی سے اٹھی اور حجرے سے باہر چلی گئی اور روبینہ کا رنگ اڑ گیا۔

ابھی اماں کو باہر بیٹھے دس منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ پیر سائیں نے تیز آواز میں اماں کو بلایا۔

اماں جب اندر داخل ہوئی تو ان کا منظر دیکھ کر حق دق رہ گئی' پیر سائیں کا ہاتھ بری طرح لہولہان تھا اور روبینہ اپنی چادر کو تختی سے لپیٹے پھٹی پھٹی آنکھوں سے آنسوؤں کے ساتھ چہرے پر ہلدی جمائے پیر سائیں کو دیکھ رہی تھی' پیر سائیں نڈھال اور تکلیف سے کراہ رہے تھے۔

"جا اماں لے جا اپنی بہو کو' قابو کرلیا ہے میں نے اس سرکش کو۔ پیچھا چھوٹ گیا ہمیشہ کے لیے تیرا اور تیری بہو کا' اب اللہ کے فضل سے بچہ صحت یاب ہوگا آئندہ اس کو لانے کی بھی ضرورت نہیں بس ہر ماہ آ کر پانی اور چینی پر دم کروالیا کر' ہاں جاتے ہوئے مزار پر

چادر چڑھانا نہ بھولنا' جاؤ اللہ کرم کرے گا۔" اماں مزید عقیدت اور مودب ہو کر بولی قدرے ہکلاتے ہوئے بولی۔

"مگر سائیں۔۔۔ یہ آپ کا ہاتھ۔۔۔ یہ کیسے زخمی ہوا؟" پیر سائیں بولے زوردار گرج کر دبنگ آواز میں ڈانٹتے ہوئے مخاطب ہوئے۔

"جاہل عورت یہ آسیب اس قدر موذی تھا' جانے کب سے اس کے پیچھے تھا' جاتے وقت مشتعل ہو کر مجھے زخمی کر گیا اب جا چلی جا یہاں سے وہ ابھی یہیں آس پاس ہے۔"

اماں الٹے پیروں وہاں سے روبینہ کو لے کر دوڑی' اس نے روبینہ سے بہتیرا پوچھا کہ کیا ہوا تھا وہاں؟ مگر اس کے پاس اس کے سوا کچھ جواب نہ تھا کہ مجھے کچھ نہیں پتا۔

اور اگلے دن ثمینہ نے اپنا کہا پورا کر دکھایا وہ اپنے میاں اور ساس کے ساتھ آ کر اسے لے گئی اس کی ساس نے اماں سے کچھ اس طرح بات کی کہ اماں غصے میں ہونے کے باوجود کچھ بھی نہ کر سکی کیونکہ آصف کا فون بھی آیا تھا اور خلاف توقع اس نے بڑے پیار اور اچھے موڈ کے ساتھ نہ صرف بات کی بلکہ جانے کی اجازت بھی دے دی۔

اماں نے بادل ناخواستہ اسے بھیج تو دیا مگر اس تاکید کے ساتھ کہ وہ یاد سے دم کیے پانی اور چینی کا استعمال جاری رکھے اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا' اماں جتلاتے ہوئے بولی۔

"بڑی مشکل سے پیر سائیں نے اس کے اوپر جو اثرات تھے جو سایہ تھا ان کو قابو کیا بلکہ ان کا ہاتھ بھی زخمی ہو گیا تم لوگوں نے تو ہمیں نہیں بتایا روگی لڑکی ہمارے پلے ڈال دی اور یہ الرجیاں بتا کر پردے ڈالتی ہے' اب لے کر جا رہی ہو تو دھیان رکھنا ہماری آنے والی آل اولاد کا۔"

ثمینہ کا رنگ اس سخت بیان پر متغیر ہوا خاص طور پر ساس اور میاں کے سامنے اس غلط بیانی پر اسے شدید غصہ آیا مگر بہن کی خاطر وہ برداشت کر گئی۔

لاہور لا کر ثمینہ نے اسے بڑی اچھی لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا اسے تمام تر صورت حال سے آگاہ کیا کہ کیسے اس کی پہلی دو بچیاں پیدا ہونے کے تھوڑی دیر بعد مر گئیں اور دل گرفتگی سے کہا۔

"اور اس کے سسرال والوں کا خیال ہے کہ اس پر آسیب ہے سایہ ہے کوئی' اس کو دورے پڑتے ہیں۔" ڈاکٹر جو روبینہ کا تفصیلی معائنہ کر رہی تھی چونک کر بولی۔

"دورے کیسے دورے' یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ اس کو دورے پڑتے ہیں؟" روبینہ دل گرفتگی سے بولی۔

"کوئی دورے نہیں پڑتے ڈاکٹر صاحبہ' الرجی ہو جاتی ہے شادی سے پہلے بھی کبھی کبھار ہو جاتی تھی اب اس حالت میں بڑھ جاتی ہے اور کچھ نہیں۔" ڈاکٹر نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

"کیسی الرجی کیا محسوس ہوتا ہے؟" روبینہ سرسری لہجے میں بولی۔

"نہیں ڈاکٹر صاحبہ کچھ بھی نہیں' جسم صاف رہتا ہے مگر تمام بدن میں حرارت کا تناسب بڑھ جاتا ہے جسم کے تمام اندرونی حصے شدید حدت اور خارش زدہ محسوس ہوتے ہیں اور بظاہر کچھ نہیں فطرتاً" اسی لیے تو میری ساس کہتی ہے کہ اسے دورہ پڑتا ہے جب ہوا چیزیں آتی ہیں تو جسم اسی طرح تپتا ہے اور بخار بھی نہیں ہوتا۔" ڈاکٹر یہ سن کر مسکرائی۔

"اور یہ سب بتا کر مجھے لگتا ہے کہ روبینہ میں تمہارے آسیب کو پکڑ لیا ہے تم جسے معمولی الرجی سمجھ رہی ہو یہ تمہارے بدن میں خاص وٹامنز و کلیات اور کچھ ہارمونل نظام میں گڑبڑ کی نشاندہی ہے اور اس حالت میں بدن کا یہ نظام کچھ گڑبڑ ہوتا ہے اسی لیے تکلیف بڑھ جاتی ہے۔" پھر وہ ثمینہ سے مخاطب ہوئی۔

"آپ یہ اس کے کچھ ضروری ٹیسٹ کروائیں میں کچھ وٹامنز اور انجکشنز دے رہی ہوں کمزوری زیادہ ہے باقی سب خیریت ہے غذا کا خاص خیال رکھیں باقی ٹیسٹ کی رپورٹ آنے پر۔"

پھر روبینہ پندرہ بیس دن ثمینہ کے پاس رہی ثمینہ کا بال گفت گیر اور خاموش طبع ضرور تھا مگر روبینہ کے ساتھ رویہ کافی بہتر تھا روبینہ نے دل میں سوچا۔

"ہم دور رہ کر خود سے اندازے قائم کرکے تلخیاں اور رنجشیں کیوں بڑھاتے ہیں' رشتوں کو وقت اور مقام کیوں نہیں دیتے۔"

ان پندرہ بیس دنوں میں اس کے مزاج اور صحت پر کافی اچھا اثر پڑا بچے بھی خالہ کرتے آگے پیچھے پھرتے حتی کہ آصف کا بھی دو تین مرتبہ فون آیا جو ایک حیران کن امر تھا ورنہ تو وہ پوچھتا ہی نہیں تھا اور اب وہ کہہ رہا تھا۔

"اچھی بات ہے یہاں تیری صحت پر اچھا اثر پڑا ہے تو اپنا اور بچے کا خیال رکھ مگر ابھی کافی ٹائم پڑا ہے طبیعت کچھ سنبھلے تو کچھ عرصہ کے لیے اماں کے پاس چلی جانا پھر واپس آجانا میں اسلم بھائی کو کہہ دوں گا خود بھی کوشش کروں گا وقت سے پہلے آنے کی۔" وہ حیرت زدہ اور مسرور سی ہوگئی اور سوچنے لگی شوہر کی محبت بھی عورت کے لیے کسی ٹانک کسی طاقت ور دوا سے کم تو نہیں۔

اور پھر واقعی وہ طبیعت سنبھلنے پر واپس اپنی ساس کے پاس آگئی' اس کا رویہ ہنوز وہی تھا مگر اسے ثمینہ اور ڈاکٹر نے بہت سمجھایا تھا اور اس نے بھی اس کی باتوں اور ڈانٹ پر غور کرنا چھوڑ دیا تھا۔

اور جب اس کے کریدنے پر اس نے اسے ڈاکٹر کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ اسے پہلے سے واقعی آرام ہے اور جلدی جلدی الرجی بھی نہیں ہوتی تو وہ ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔

"یہ تو پیر سائیں کی کرامت ہے دیکھا نہیں تھا کیسے انہوں نے تیرا آسیب بھگایا تھا' تو پانی اور چینی استعمال کرتی ہے نہ۔" اس نے اثبات میں سرہلایا۔

"ہاں اماں بے شک ثمینہ سے پوچھ لینا۔" تو اماں بڑی عقیدت سے بولی۔

"ہاں سویرے کو جاؤں گی تیرے لیے دم کی چینی اور پانی لے کر آؤں گی اور مزار پر منت کی چادر بھی چڑھاؤں گی۔"

اور پھر کچھ وقت اسی طرح گزرا کہ روبینہ چیک اپ کے لیے جاتی اور کچھ دن ثمینہ کے پاس رہ آتی وہاں سے آرام سکون اور محبت بھی ملتی جو اسے درکار تھی اور پھر کچھ عرصے کے لیے وہ ساس کے پاس آجتی۔

وہ جب ادھر ساس کے پاس ہوتی تو ہر ماہ وہ باقاعدگی سے اس کے لیے دم کی چینی اور پانی لے کر آتی اور آخری دو ماہ جب ثمینہ نے اسے جانے سے منع کردیا اور ڈاکٹر نے بھی کہا کہ وہ احتیاط کرے' آرام کرے ہلکی پھلکی چہل قدمی ضرور کرے' مگر سفر سے بچے تو اماں خود احتیاً سے باقاعدہ ہر ماہ اسے دم کی ہوئی چینی اور پانی دے کر جاتی رہی بڑی عقیدت سے وہ کہتی۔

"بڑی کرامت والے ہیں پیر سائیں ایک ہی دفعہ مرض پکڑ لیا اس کے حال پر ترس کھا کر دوبارہ آنے سے منع کردیا۔"

اور وہ دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر رہ جاتیں اور آخر وہ دن آہی گیا جب اسے اسپتال جانا تھا ڈاکٹر نے اس کی گزشتہ پیچیدگیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے وقت سے پہلے ہی بلا لیا' وہ اپنا چھوٹا سا بیگ تیار کررہی تھی کہ اچانک ثمینہ وہاں آگئی۔

"ارے یہ کیا کررہی ہو اس میں۔" وہ ٹال گئی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی تو ثمینہ کندھے اچکا کر چلی گئی۔

ایک تکلفی وہ اور کربناک مرحلے سے گزر کر اس نے گل گوتھنے سے سفید گلابی رنگ کی آمیزش لیے ایک پیارے سے بیٹے کو جنم دیا ڈاکٹر نے اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد ابتدائی چار گھنٹے اس کو ان کو بیٹو میں رکھنے کے بعد ان کے حوالے کردیا تھا۔

آصف بھی آگیا تھا اور اس کے چہرے پر بیٹے کے باپ ہونے کی خوشی و فخر پھیلا تھا' وہ بڑی محبت بھری نظروں سے اپنے بچے کو اور روبینہ کو دیکھتا تھا اور وہ محجوب سی ہو کر نگاہ جھکا لیتی تھی۔

اگلے دن اماں بھی آگئی ابھی وہ اسپتال ہی میں تھی اس کی حالت کے پیش نظر ڈاکٹر نے احتیاطاً' ایک دن

روک لیا تھا' اماں بچے کو گود میں اٹھاتے ہی بولی۔

"ربا تیرا شکر ہے جیتے جی میرا پوتا ہو گیا رونق میلا لگ گیا میں نے اپنے بیٹے کی خوشی دیکھ لی' دیکھ بہنا میرے پیر سائیں کتنی کرامت والے ہیں اب تجھے اور اپنے پوتے کو سلام کروانے لے کر جاؤں گی۔"

روبینہ نے ثمینہ کو آواز دے کر کہا کہ وہ گٹھڑی جو اس کے بیگ میں رکھی ہے لے آئے' ثمینہ سمیت سب نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا ہے اس میں؟" روبینہ نے وہ گٹھڑی اماں کو تھماتے ہوئے کہا۔

"اماں یہ پکڑ تیری امانت ہے یہ۔"

اماں نے اسے کھولا تو حیران رہ گئی اس میں وہ تمام چھوٹی چھوٹی بوتلیں اور دم کی ہوئی چینی موجود تھی اور ساتھ ہی ایک خون الود خنجر بھی' اماں نے حیرت ودکھ کے ساتھ اسے دیکھا اور قدرے تاسف اور ہکلاتے ہوئے بولی۔

"مطلب... تو... تو نے ... یہ سب استعمال نہیں کیا۔" تو اس نے سر نفی میں ہلا دیا' اماں واویلا کرتے ہوئے بولی۔

"بہت برا کیا تو نے' بہت برا' نافرمانی کی۔ پیر سائیں کو اس حرکت کا پتا چل گیا ہو گا وہ بہت ناراض ہوں گے ارے کلموہی تجھے دو بچے کھا کر بھی عقل سمجھ نہ آئی۔" آصف بھی بہت ناراض نظر آرہا تھا' روبینہ ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"اماں تو نے مجھ سے اس چاقو کے بارے میں نہیں پوچھا جس پر خون لگا ہے پتہ ہے یہ کیا ہے اماں؟ آصف یہ اس بابا کا خون ہے۔ جن عورتوں کے مرد باہر چلے جاتے ہیں نہ ان کو بڑا محتاط اور دلیر ہو کر جینا پڑتا ہے جب اماں تجھے لے کر گئی تو میں اپنی چادر میں یہ چھپا کر لے گئی تھی میں نے پیر سائیں کے بارے میں جیسا سوچا تھا وہ ویسا ہی نکلا' اماں کے باہر نکلتے ہی اس نے اپنا چولا بدل لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ میرے ساتھ کچھ برا کرتا میں نے اس کا ہاتھ بری طرح زخمی کر دیا اور اس کو دھمکی بھی دی کہ اگر تم نے کچھ غلط کرنے کی کوشش کی تو بری طرح شور مچاؤں گی اور مجبور کیا کہ وہ اماں کو کہہ دے کہ مجھے نہ لایا کریں ساتھ کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ اماں کبھی مجھ پر بھروسا نہیں کرے گی۔" یہ سب کہہ کر وہ تھک سی گئی پھر وہ دوبارہ بولی۔

"میرا اللہ پر ایمان کتنا پکا اور سچا ہے پتا نہیں مجھے اللہ اور اس کے نیک بندوں کا کیا معاملہ ہے مجھے یہ بھی نہیں پتہ مگر مجھے اتنا ضرور پتہ ہے کہ ہر نیکی بدی اس کے ہاتھ میں ہے اور پیر سائیں جیسے فراڈ کسی کو کچھ نہیں دے سکتے۔" ماحول جو بڑا بوجھل بوجھل لگ رہا تھا' روبینہ یہ سب بول رہی تھی کہ ڈاکٹر آگئی اس نے روبینہ کی آخری بات سن لی تھی وہ آصف کی طرف رخ موڑ کر بولی۔

"آپ کی مسز کا آسیب میں نے پکڑ لیا ہے' یہ دوائیں اور جو ٹانک میں نے دیے ہیں جاری رکھے ان شاء اللہ تعالیٰ بالکل صحیح ہو جائے گی میرے بھائی یہ مرض ہے اور جسم میں خاص چیزوں کی کمی بیشی سے پیدا ہوتا ہے اور بے شک زندگی اور موت اس کے ہاتھ میں ہے آپ کی مسز بہت سمجھ دار اور حوصلے والی ہیں جو اس جعلی پیر کے ہتھے نہیں چڑھی۔"

آصف شرمندہ سا ہو کر آگے بڑھا اور مٹھائی کا ڈبا کھول کر بولا۔

"لیں ڈاکٹر صاحبہ منہ میٹھا کریں واقعی اللہ نے مجھ پر بڑا کرم کیا۔"

سب ماحول کا تناؤ کم ہونے پر مسکرانے اور باتیں کرنے لگے مٹھائی کا ڈبا سب ہاتھوں میں گردش کرنے لگا مگر روبینہ کی یہ بات بالکل سچ تھی اماں کو واقعی ابھی تک یقین نہیں آیا تھا اور وہ ابھی تک کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کر رہی تھیں۔

✡

مسخرہ

احمد صغیر صدیقی

ایک ڈرائونی کہانی شہر میں ہونے والی پر سرار اموات' ہر روز ایک لاش کہیں نہ کہیں
پائی جا رہی تھی جس کے سارے بدن کا خون نچوڑ لیا گیا ہوتا تھا۔

ایک مسخرے کی روداد لوگوں کے قہقہے جسے غذا فراہم کرتے تھے۔



مجھے ہنسانے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ یہ میری آپ سے درخواست ہے۔

پلیز یہ بات نہیں کہ میرے اندر حس ظرافت نہیں ایسی کوئی بات نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کل پھر انہیں کوئی ملا ہے۔ آپ نے اخبار پڑھا ہو گا۔ ہو سکتا ہے ٹی وی پر دیکھا ہو۔ یہ لاش انہیں ڈاک لینڈ پب کے عقب میں واقع ایک لین سے ملی ہے۔ حالانکہ تفصیلات نہیں بتائی ہیں مگر مجھے معلوم ہے اس کی حالت وہی ہو گی جیسے پہلے ملنے والی لاشوں کی تھی۔ سب کے چہرے پر ایک ہی تاثر تھا۔

میرا خیال ہے اگر میں بات شروع سے کروں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ آپ اچھی طرح سمجھ سکیں گے مگر ہنسیے گا نہیں۔

میرا نام پیٹر مارٹن ہے۔ ویسے یہ میرا نام نہیں ہے آپ کی آسانی کے لیے بتایا ہے تاکہ کہانی سنائی جا سکے۔

اس قصے کا آغاز مارٹن راجر سے ہوتا ہے اور یہ ختم بھی اسی پر ہوتا ہے۔ مارٹی دراصل مسٹر مقبولیت تھا۔ ساری دنیا اسے چاہتی تھی وہ سب کو ہنسانے میں ماہر تھا۔ افسوس انہیں نہیں معلوم تھا۔

میری مارٹن سے پہلی ملاقات کالج میں ہوئی تھی ہم دونوں Humanities میں ڈگری لے رہے تھے۔

ابتدا میں ہمارے مراسم رسمی دعا سلام تک محدود تھے۔ ذاتی سطح پر ہم دونوں میں بڑا فرق تھا۔ ہماری فطرت ایک دوسرے کے برعکس تھی۔ وہ مجلسی، ہنسوڑ اور مقبول عام آدمی تھا۔ میں داخلیت پسند، پر تکلف اور غیر مجلسی فطرت کا تھا۔ اسی لیے عورتوں کے معاملے میں میں خاصا ناکام آدمی تھا ہم دونوں آگ اور پانی جیسے تھے۔ پھر دوسرے ٹرم میں ہم دونوں میں گہری دوستی ہو گئی یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔ اب ماضی پر نگاہ ڈالتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ مارٹن نے مجھ سے دوستی کیوں بڑھائی تھی۔ اس زمانے میں میں خاصا معصوم تھا۔ اس کے اتباع کی خواہش اور اس کے ساتھ سوشل لائف جوائن کرنے کے خیال نے مجھے تقریباً" اندھا کر دیا تھا۔ ایک معنی میں وہ میرا سوشل ٹیوٹر تھا۔ وہ آگے بڑھتا تھا۔ تعلقات بناتا تھا اور مقبول ہو رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے چلتا تھا۔ مارٹن کی حس مزاح کا زمانہ قائل تھا۔ وہ موقع پر دلچسپ باتیں گڑھ لیتا تھا۔ لوگ اس کی محفل میں جا کر خوش ہوتے تھے اس کا زرد چہرہ اور سرخی مائل بال پرکشش تھے۔ میں مارٹن کو ایک دیوتا کی طرح سمجھتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں خود کو بھی ایک اسٹائل دے رہا تھا۔ میں تنہائیوں کی دلدل سے نکل آیا تھا۔ مجھے خوشی ہوتی تھی جب میں دیکھتا تھا کہ میں بھی لوگوں کو ہنسا سکتا ہوں۔ گو بڑی حد تک میں بھی ایک پاپولر آدمی بن گیا تھا۔ میرا استاد زندگی سے مسرتیں کشید کر رہا تھا اور میں بھی اس کے سائے میں خوش تھا۔

مگر پھر انکشاف ہوا تھا کوئی سال بھر بعد آخری ٹر کے دوران۔

میں نے اور مارٹن نے خریداری کی تھی۔ اور ہم ان کی قیام گاہ پر گئے تھے۔ وہ ان دنوں کالج کی فراہم کر جگہ پر رہتا تھا۔ وہاں ہم نے پی تھی اور سگریٹ نوشی بھی کی تھی۔ ہمارا موڈ بہت اچھا تھا اور مارٹن نے کوئی لطیفہ بھی سنایا تھا۔ یاد نہیں.... مگر میں بہت ہنسا تھا۔ بی پیتے ہوئے مارٹن نے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور مجھ سے مخاطب ہوا "ہم دونوں اچھے دوست ہیں نا؟" میں نے محسوس کیا وہ خاصا سنجیدہ ہو رہا تھا۔

"بالکل۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"سچ مچ؟"

"اور کیا۔"

مارٹن ہنسا۔ کچھ دیر تک اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ میں اس سے بے چین ہو گیا تھا۔ اب ماضی کی سمت دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ مارٹن کا نارمل چہرہ دراصل ایک نقاب تھا۔ اس کا اصل چہرہ تو وہ تھا جو میں نے اس وقت دیکھا تھا۔ پہلے یہ چہرہ میری نظروں سے مسلسل چھپا رہا تھا۔

مارٹن مسکرایا مگر اس کے چہرے کا تاثر وہی رہا۔

اس نے کہا ہماری دوستی کو کتنا عرصہ ہو گیا۔
"تم مذاق کے موڈ میں ہو شاید۔" میں نے کہا۔
"دو سال۔" مارٹن نے کہا "اور تم نے اتنے عرصے میں بھی نہیں جانا۔" وہ آہستہ سے ہنسا۔
"کیا نہیں جانا؟"
"کہ لوگوں کو ہنسایا کس طرح جاتا ہے۔"
میں مسکرایا "تم تو جانتے ہو۔"
"ہاں تم میری پاپولریٹی دیکھ ہی رہے ہو۔"
"یہ تو ہے۔"
"اچھا سگریٹ کا دوسرا ڈبا نکالو۔ میرے پاس ایک کہانی ہے جو میں تمہیں سنانا چاہتا ہوں۔"
میں مزاحیہ انداز میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
"سناؤ۔" میں نے کہا۔
"زندگی میں کامیابی کے بہت سے طریقے ہیں۔" مارٹن نے سگریٹ کا لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔ "پہلا طریقہ یہ ہے کہ مال دار گھرانے میں پیدا ہوا جائے۔"
"میں اس میں شامل نہیں ہوں۔"
"میں بھی.... مگر لوگ دولت کی عزت کرتے ہیں۔ جو دولت مند پیدا ہوتے ہیں انہیں کامیابی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس اتنا کرنا ہوتا ہے کہ حماقت سے رقم نہ گنوائیں۔ دوسری طرف.... آدمی میں ہنر مندی ہونی چاہیے۔ مکینکل آرٹسٹک یا دانش ورانہ۔ یہ بھی کامیابی کے راستے ہیں۔"
"یہ تم کیا کہہ رہے ہو آخر؟"
"بتانا یہ ہے کہ ہمیں خود کو بیوقوف نہیں بنانا چاہیے۔ یہ بڑی بے رحم دنیا ہے۔ بڑی مچھلیاں چھوٹی کو کھا جاتی ہیں اور ان سے بھی بڑی مچھلیاں انہیں کھا جاتی ہیں۔ جب تک کوئی غیر معمولی نہیں بنتا کامیابی نہیں مل سکتی اور ہر ناکام آدمی چھوٹی مچھلی کی طرح ہوتا ہے۔"
"میں ابھی تک...."
"دیکھو.... کامیابی کا حقیقی راستہ شخصی سطح پر ہوتا ہے تعلقات کی سطح پر۔" میں نے درمیان میں پھر مداخلت کرنی چاہی مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "میرے چند عظیم ہیروں میں سے ایک چودھویں صدی میں ہوتا تھا۔ اس کا نام تھا ٹام فول (فول احمق کو کہتے ہیں) وہ اولڈ انگلینڈ کے ایک کومک ٹروپ سے متعلق جو مسلسل سفر کرتا رہتا تھا۔ یہ ٹروپ گاؤں گاؤں جا کر تماشا دکھاتا تھا۔ ٹام فول اس ٹروپ میں بہ طور جوکر ملازم تھا۔ یہ زمانہ سخت تھا۔ اس میں بہت سے حرام زادے ہوا کرتے تھے ایسا ہی حرام زادہ تھا بیرن جو نواب زادہ بھی تھا۔ اسے ٹام فول بھا گیا تھا۔ اس نے اس غریب کی مرضی کے خلاف اسے اپنے دربار میں لا ڈالا اور اسے درباری جوکر کا عہدہ دے دیا۔ بقیہ ٹروپ وہاں سے کسی طرح نکل بھاگا۔ اب ٹام فول یہاں تقریباً "ایک قیدی کی طرح تھا۔ وہ برسوں نواب زادے کو خوش کرتا رہا۔ بیرن نے اس سے کہہ دیا تھا جس دن وہ اس کی حرکات سے خوش نہ ہو سکا وہ اس کا آخری دن ہوگا۔ تم سمجھ سکتے ہو یہ الف لیلہ جیسا قصہ تھا۔ بہرحال ٹام فول کسی طرح اس حرامی بیرن کو خوش رکھے ہوئے تھا۔ لوگ ٹام کو بہت خوش قسمت سمجھنے لگے تھے۔

مارٹن رک کر بولا "ایک تاریک سے پیکر کو اس کے کوارٹر میں جو تہہ خانے میں تھا ایک رات اس سے بات کرتے دیکھا گیا۔ یہ سایہ اسی وقت جیسے وہاں کی پتھریلی دیوار میں ضم ہو گیا تھا۔ جونہی بیرن کے محافظ ادھر بڑھے تھے۔ پھر ہر طرف یہ خبر پھیلی کہ ٹام فول نے تو شیطان سے معاہدہ کر رکھا ہے۔

افسوس غریب ٹام فول اس کی تقدیر زیادہ دنوں ساتھ نہ دے سکی بات یہ نہ تھی کہ وہ بیرن کو ہنسانے میں ناکام ہو گیا تھا۔ کہانی یوں ہے کہ ٹام نہایت ذہین برجستہ اور پر مذاق تھا کہ بیرن کی محبوبہ اس پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے جب بات کھلی تھی۔ تو ٹام فول زد میں آیا تھا۔ اس حرامی بیرن نے ٹام فول کو دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا۔" رک کر مارٹن نے میری طرف کسی رد عمل کے لیے دیکھا۔
"اس کا مطلب ہے کہ چودھویں صدی میں زندگی کوئی ہنسی کھیل نہ تھی۔"

مارٹن نے سینے پر انگلی رکھی اور قدرے جھک کر بولا۔ "میری اپنی زندگی ٹام فول سے بہت مناسبت رکھتی ہے۔ میں بھی اس کی طرح کامیاب ہوا ہوں۔ میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ سب مجھے پسند کریں۔"

"یہ تو ایک فطری جوہر کا معاملہ ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" مارٹن نے اس طرح کہا کہ چونک گیا۔

"تم نقطے تک پہنچے ہی نہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ فطری جوہر نہیں یہ حاصل کردہ صلاحیت ہے۔" مارٹن اٹھا اور اپنے سستے سے بک کیس کی طرف گیا۔ یہاں نصابی کتابوں کے علاوہ ذرا بڑی اور مہنگی کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اس ایک چمڑے کی جلد والی موٹی سی کتاب باہر نکالی۔ اسے الٹنے لگا۔ "یہ کتاب ان Notes پر مشتمل ہیں جو میرے لکھے ہوئے ہیں میں نے ہر شخص کے بارے میں جسے میں جانتا ہوں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ یہ باتیں ان کے کردار کی تھی وہ کس بات سے خوش ہوتے ہیں۔ میں انہیں کس طرح اپنے مفاد میں استعمال کر سکتا ہوں۔ وغیرہ"

"کیا مطلب ہے اس کا؟"

"اس میں تمہارے بارے میں بھی نوٹ ہیں۔"

"پیٹر۔" مارٹن نے کہا "پیٹر مارش .... جنسی اور سوشل پیمانے پر عدم سیرابی۔ میں نے کس طرح تمہیں مہمیز کیا تھا کہ تم میرے نقش قدم پر چلو۔ کس طرح تمہارے اندر خود اعتمادی پیدا کی تھی۔ یہ میں کوئی اپنی تعریف نہیں کر رہا ہوں۔ نتائج تمہارے سامنے ہیں۔ جب میں کسی کو ہنسا لیتا ہوں میں ایک فتح حاصل کرتا ہوں۔"

مارٹن نے کرسی سے پیٹھ ٹکالی۔ مجھے اس کی باتیں اس کے دماغ کی سنک لگ رہی تھیں۔

اس کے بعد ٹرم ختم ہونے تک میں مارٹن سے دور ہی رہا۔ اس عرصے میں میرے اندر خاصی خود اعتمادی آ گئی تھی۔ میں نے نئے دوست بنا لیے تھے میں اس سے دور تھا اسے بھی میری پروا نہ تھی۔ وہ اب بھی پارٹیوں کا روح رواں بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد میں نے دیکھنا شروع کر دیا تھا کہ وہ کس لطیف طرح سے لوگوں کو اپنے مفاد میں استعمال کرتا ہے۔

پھر ہم دونوں نے ڈگری حاصل کر لی تھی۔ کالج سے جانے کے بعد نہ میں نے اس کے بارے میں کچھ سنا نہ جانا۔ البتہ پچھلی اکتوبر کو ضرور یہ عجیب واقعہ ہوا تھا۔

اس کا خط ڈیٹا پوسٹ کے ذریعے آیا تھا۔ اس پر لگی مہر سے معلوم ہوا کہ یہ ایکسٹر سے آیا تھا۔ یہ ایک گاؤں ہے۔ اس جگہ سے چالیس میل دوری پر میں نے حیرت کے احساس کے ساتھ لفافہ کھولا اور اس کی تحریر پہچان لی۔ اس نے لکھا تھا۔

میں ایکسٹر کی موکنگ برڈ نامی ان میں ٹھہرا ہوں۔ فوراً آجاؤ۔ بہت اہم معاملہ ہے رات رکنا ہو گا۔ لباس لے آنا۔"

میں نے خط موڑ توڑ کر پھینک دیا۔ اتنے دنوں بعد اس نے لکھا تھا اور وہ بھی دو سطر کا اور سمجھ رہا تھا کہ اس کی چٹکی سن کر میں دوڑتا ہوا پہنچ جاؤں گا۔

دوسرے دن میں نے ایکسٹر کے لیے ٹرین کا ٹکٹ لیا۔ یقیناً" میں کمزور قوت ارادی کا آدمی ہوں سفر کرتے ہوئے میں نے خود کو ملامت بھی کی پھر میں اس سرائے پر جا رکا جہاں مارٹن ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ سرائے اسٹیشن کے پاس ہی تھی۔ اس کے چاروں طرف سبزہ تھا۔ اشجار پتوں سے خالی تھے۔ وہ سڑک جو ادھر آئی تھی کچی تھی۔ اس پر کیچڑ بھی تھا۔

اب میں سوٹ کیس اٹھائے اس کیچڑ بھری روڈ پر چل رہا تھا۔ میں سرائے کی طرف دیکھا یہ کسی حرافہ کی طرح مجھ پر ہنس رہی تھی۔ اس کا دروازہ کسی بڑے سے منہ کی طرح تھا جب اسے کھولا گیا تو اس میں سے ایک زرد چہرے اور بے ترتیب بالوں والا پیکر برآمد ہوا یہ مارٹن تھا۔ وہ مڑا اس نے سرائے کے اندر موجود کسی آدمی سے کچھ کہا اور پھر جواب میں ایک زوردار قہقہہ مجھے سنائی دیا۔

حرام زادہ۔

وہ عمومی رفتار سے میری طرف آیا۔

"پیٹر خوب تم نے پارٹ کو سمجھ ہی لیا۔"

"کیسا بارٹ؟" مارٹن کی مسکراہٹ نے ہاتھ کے سوٹ کیس کو بھاری بنا دیا تھا۔

"نوجوان آدمی ایک پراسرار بلاوے پر ایک دور افتادہ گاؤں کی طرف چل پڑتا ہے۔" پھر اس نے میرا سوٹ ہاتھ سے لے لیا اور عجلت سے اندر چلا میں اس کے پیچھے تھا۔

"پتا نہیں میں کیسے آگیا۔ مارٹن۔"

"تم یہاں اس لیے آئے ہو کہ میں نے تمہیں بلایا تھا۔" مارٹن نے کہا۔ مجھے اس کے لہجے میں غرور محسوس ہوا ساتھ ہی مجھے اس سے نفرت بھی محسوس ہوئی۔ "کچھ پینا چاہو گے؟" اس نے کہا۔ "اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ معاملہ کیا ہے اور سنو میں نے یہاں کے کمرے فرضی ناموں سے بک کرائے ہیں۔"

مارٹن بار کی طرف گیا اس نے میرا سوٹ کیس زمین پر رکھ دیا۔ اور جیب سے ایک نوٹ نکالا۔ لینڈ لارڈ ہمارے دو گلاسوں میں کڑوی شراب لے آیا۔ میں نے دیکھا لاؤنج میں بیٹھے کسٹمر مارٹن کو دلچسپ نظروں سے دیکھ رہے ہیں پھر مارٹن نے دو افراد سے باتیں شروع کر دیں ذرا سی دیر میں انہوں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ مگر مجھے ان سے نفرت آرہی تھی۔ مجھے مارٹن نے وہ کمرا دکھایا جو میرے لیے لیا تھا۔ یہ ویسا ہی فضول سا تھا جیسا کہ دیہی آبادی کی سراؤں میں ہوتا ہے۔

پھر وہ مجھے نیچے لایا کئی لوگوں نے مجھے سلام کیا۔ بالآخر ہم ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ ہماری میز ٹوٹی پھوٹی سی تھی۔ شراب پیتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ اس نے مجھے کیوں بلایا ہے۔

"میں نے اسے ڈھونڈ لیا ہے۔"

"کیسے؟"

"وہ ادھر ہی جنگلوں کے کھنڈرات میں ہے۔"

"کون؟ کس کی بات کر رہے ہو؟"

"ٹام فول مسخرے کی۔"

مجھے پرانی باتیں یاد آئیں۔ میرے ذہن میں اپنی تحقیر کا زخم تازہ تھا۔ ٹام فول۔۔۔ مارٹن کا مشابہ تھا۔ بڑی بری موت مرنے والا۔

حیرت کی بات ہے پیٹر۔ یہ خوبی تقدیر کی بات ہے۔ اسے مرے اور دفن ہوئے چودہ سو سال ہو چکے ہیں۔ کسی کو پتا نہیں کہ بیرن نے اسے کس جگہ دیوار میں زندہ چنوایا تھا۔۔۔ مگر میں وہ واحد آدمی ہوں جسے معلوم ہے۔"

"تمہیں یہ خیال کیوں آیا کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا میں اس کی تحکمانہ روش سے جل بھن رہا تھا۔ مارٹن مسکرایا "اتنے برسوں بعد بھی تم اسمارٹ بننے کی کوشش کر رہے ہو۔" اس نے کہا۔

یاد ہے تمہیں میں نے کہا تھا کہ ہر قہقہہ ایک چھوٹی سی فتح ہوتا ہے تم واحد آدمی ہو جس سے میں نے یہ باتیں کہی تھیں۔ دراصل تم پیٹ کے ہلکے نہیں ہو۔ تم واحد آدمی ہو جس سے میں ٹام فول کی باتیں کی تھیں۔ میں نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے تاکہ تم میری دریافت میں حصے دار بن سکو۔ پیٹر میں نے معلوم کر لیا ہے وہ کہاں دفن ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

جو کچھ اس نے بتایا میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس یہ جان لیں ٹام فول اس پر کسی کالوس کی طرح لد گیا تھا۔ اس ضمن میں اس نے پرانے اور نادر مخطوطے دیکھے تھے۔ تاریخ کھنگالی تھی۔ اور بالآخر اس مقام کی نشاندہی میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جہاں یہ مشہور مسخرہ دفن تھا۔

"اب کیا کرنا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اس کی باقیات نکالیں گے۔"

"تم مذاق کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا "یا واقعی اسے منظر عام پر لا کر چاہو گے کہ اسے آثار قدیمہ میں ڈالا جائے۔"

"یہ سب باتیں بعد کی ہیں۔ پہلے تو ہم اسے کھود کر نکالیں گے۔"

"مارٹن تم عقل کی بات کرو۔" میں نے کہا۔

"دیکھو میں اسے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ اس ضمن میں سب سے پہلا آدمی بننا چاہتا ہوں۔"

میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا میں اس بے تکے کام میں شریک نہیں ہو سکتا۔ بعد میں سہ پہر کے وقت ہم دونوں آدمی سرائے سے نکل کر اس کچے راستے پر چل دیے جو اندرونی حصے کی طرف جاتا تھا۔ مارٹن نے ایک ہولڈال سنبھال رکھا تھا۔ یہ راستہ بہت برا اور ناہموار تھا۔ کوئی گھنٹے بعد ہم ان کھنڈرات میں پہنچے جو ہماری منزل تھے۔ یہاں اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک بات بتا دوں انہیں تلاش کرنے کی کوشش بے سود ہو گی کیونکہ نہ تو موکنگ برڈ نامی کوئی سرائے ہے۔ نہ ہی کوئی ایسا گاؤں ہے جو ایکسٹر کہلاتا ہے۔

جب ہم اس پشتے کے پاس پہنچے جو اشجار کے جھنڈ کے پاس تھا۔ مارٹن کی کیفیت بہت پرجوش اور ہیجانی سی ہو گئی۔

"پیٹر۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"میرا خیال ہے ہم نے عجلت کی ہے۔ ہمیں کم از کم آدھی رات تک انتظار کرنا چاہیے تھا۔ تم نے ایسی فلمیں ضرور دیکھی ہوں گی۔ لاش چرانے والوں کی۔"

میں نے جواب نہیں دیا۔ مجھے کراہت ہو رہی تھی۔ مارٹن سے اور شاید اپنے آپ سے بھی۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ مارٹن آگے بڑھا۔ میں بھی ٹھوکریں کھاتا پیچھے چلا۔ ہم نشیبی حصے میں جا رہے تھے۔

بالآخر ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں جھنڈ کی شکل میں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ میری طرف گھوما۔ معاً مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گر گیا۔ جب میں اٹھا تو مارٹن میرے سر پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ "ہم اپنی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔" اس نے کہا۔

میں نے اردگرد دیکھا۔ وہاں سوائے گھاس، جھاڑیوں اور گہرے سایوں کے کچھ نہ تھا۔ کیونکہ سورج اب ڈوبنے ہی والا تھا۔

مارٹن نے آگے بڑھ کر جھاڑیوں کو چیرا اور منہ سے چیخ چیخ کر آواز نکالی۔ اس کے پیچھے ایک ٹوٹی پھوٹی سی محراب تھی اس کے پتھروں پر کائی جمی ہوئی تھی۔ مارٹن ٹارچ نکالی اور میری طرف روشنی ڈالی۔ جلد ہی مجھے نظر آیا کہ آگے کچھ زینے سے ہیں۔ بھیگے ہوئے سے ان پر گھاس جمی ہوئی تھی۔ یہ خمدار تھے اور نیچے زمین میں اتر رہے تھے۔

"یہیں۔۔۔ نیچے۔" میں نے پوچھا۔

"وہاں۔" اس نے کہا اور ہلکا سا ہنسا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس ہنسی کی بازگشت ابھری تھی۔ یعنی اس کی ہنسی کے پیچھے ایک اور ہنسی بلند ہوئی تھی۔ جھکتے ہوئے میں نے نیچے پھیلے اندھیرے میں جھانکا میں کچھ نہ دیکھ سکا۔

"یہ زینے۔" میں نے کہا "خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔"

"میں نے تمہیں کبھی ڈرپوک نہیں سمجھا۔" مارٹن نے کہا۔

پھر وہ خود آگے بڑھا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ حرام زادہ۔

میں بھی اس کے عقب میں چلا۔ یہاں ایسی بو پھیلی ہوئی تھی جیسے فریج میں جمے گوشت سے اٹھتی ہے۔ معاً میرا پیر پھسلا۔ میں نے جلدی سے قریبی پتھریلی دیوار کو پکڑ لیا۔ یہاں نہ جانے کیا چیز جمع تھی جس سے میرا پورا ہاتھ لتھڑ گیا۔ یہ بالکل گوبر جیسی کوئی چیز تھی۔ میں نے ہاتھ جھٹک کر اس سے جان چھڑائی۔

"دھیان سے" اس نے ٹارچ کی روشنی میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

ہم خمدار زینے اترتے جا رہے تھے پھر میرے کان میں بہتے پانی کی آواز آئی اور گندے پانی کی بو کا احساس ہوا۔ اس جگہ سارا دارومدار اس ٹارچ پر تھا جو مارٹن کے پاس تھی۔ مجھے خوف آ رہا تھا یہ مارٹن میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ٹارچ بند کر سکتا تھا اور مجھے اندر چھوڑ کر جا بھی سکتا تھا۔

معلوم نہیں ہم کتنی گہرائی میں تھے۔ ٹارچ کی روشنی سے اندازہ ہوا کہ ہم کسی زمین دوز چیمبر میں پہنچ چکے ہیں۔ یہ قطر میں پچاس ساٹھ فٹ ہوگا۔ فرش اور چھت سب پتھر کے تھے۔

"یہ ہے وہ جگہ۔" مارٹن نے کہا۔ "مجھے یقین ہے وہ یہیں ہے' اس کا چہرہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس نے چیمبر کے وسط میں اپنا ہولڈال رکھ دیا۔ پھر ٹارچ مجھے دے دی۔ "روشنی ڈالو ادھر۔" اس نے ہولڈال سے ایک CROW-BAR نکالا اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "قبریں کھودنے والے۔ اپنے ساتھ کرو بار ضرور لاتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہاں سردی ہو رہی ہے۔ یہاں سے نکلو۔"

"کمال کر رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کام میرے لیے کس اہمیت کا حامل ہے۔" وہ اٹھ پڑا اس نے ٹارچ لے لی۔

"تیس قدم۔" اس نے کہا۔ پھر وہ چلا اور تیس پر رک گیا۔ وہ مجھ سے کوئی دس فٹ کی دوری پر تھا۔

اس کے بعد وہ فرش پر بیٹھ گیا اور کرو بار کی مدد سے فرش پر زور آزمائی کرنے لگا۔ جس پر سبزے کا پلستر چڑھا ہوا تھا۔ "یہیں اسی جگہ اس نے ٹارچ میری طرف بڑھائی۔ اس جگہ کوئی تین فٹ قطر میں کسی مربع کی صورت میں پتھر جڑے گئے تھے۔ مارٹن نے چھڑ کا سرا ایک درز میں پھنسا کر اسے اکھاڑنے کی کوشش کی۔

"بہت وزنی ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

میں نے ٹارچ رکھ دی اور خود زور آزمائی کرنے لگا۔ بالآخر پتھر اٹھ ہی گیا۔ یہ برف کی طرح سرد تھا۔ ہم نے اسے کھسکا کر ایک طرف کر دیا۔ اب ہمارے سامنے ایک قبر کا منہ تھا۔ زمین نرم اور بھربھری تھی۔ "ایک پتھر اور ہے نیچے ذرا میری مدد کرو۔" اس نے کہا۔ پھر اس کوشش میں چھڑ دو ٹکڑے ہو گئی۔

جھلا کر میں نے پوچھا۔ "تمہیں اچھی طرح یقین ہے کہ وہ یہیں ہے۔"

میری انگلیاں زخمی ہو گئی تھیں۔

"وہ بالکل یہیں ہے۔" مارٹن نے کہا۔

میں نے بہت عرصہ ریسرچ کی ہے۔ یوں ہی نہیں آیا ہوں۔ اچھا اب جا کر دوسرا کرو بار لے آؤ تاکہ یہ آخری پتھر بھی ہٹایا جا سکے۔"

"ہمارے پاس ایک ہی ٹارچ ہے میں تمہیں یہاں اندھیرے میں تو چھوڑ سکتا۔"

ٹارچ میرے پاس رہے گی۔ میں تمہیں روشنی دکھاؤں گا اوپر پہنچ کر تمہیں راستہ مل جائے گا۔

"مگر آگے بھی راستہ ناہموار ہے اور اندھیرا بھی ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تو پھر یوں کرو۔ تم یہاں رکو میں جاتا ہوں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔"

میں نے کہا اور تیزی سے چل دیا۔ مارٹن نیچے سے مجھے ٹارچ دکھا رہا تھا۔ چیمبر کے اندر بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں سلپ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس طرح چل رہا تھا جیسے کوئی شخص رسے پر چلتا ہے۔ میرے اندر سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مارٹن شاید ٹوٹی ہوئی چھڑ سے پتھر کو کھودنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر مجھے روشنی کا احساس ہوا اور پہنچنے کا تاثر خوشگوار تھا۔ میں نے رفتار بڑھائی اور ایک دم سے پھسلا۔ شکر ہے میری گردن سلامت رہی۔ میں نے سبزے کو چیرا اور پتھریلی دیوار کو عبور کیا' پھر بھی اندھیرے میں پھیلی جھاڑیوں میں گھس پڑا۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا شاید کوئی ایسی چیز نظر آ جائے جس سے آخری پتھر ہٹایا جا سکے۔ مگر وہاں صرف درختوں کی ٹوٹی شاخیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں پشتے پر چڑھا ادھر مجھے ایک راستہ نظر آیا۔ اور ایک جنگلا سا دکھائی دیا۔ ادھر بھی کوئی کام کی چیز نہ تھی۔ میں مایوس ہو کر پلٹ ہی رہا تھا کہ کسی چیز سے ٹھوکر لگی.... میں نے جھک کر اسے ٹٹولا۔ معلوم ہوا یہ لوہے کی ایک چھڑ ہے۔ مورچہ زدہ سی یہ کوئی پسٹن راڈ تھی کسی پرانے ٹریکٹر کی۔ اسے اٹھا کر میں

دوبارہ نشیبی راستے پر پلٹا۔ ہوا تیز ہو رہی تھی اور درختوں کے پتے بری طرح کھڑکھڑانے لگے تھے۔

میں دوبارہ نیچے نہیں جانا چاہتا تھا مگر مارٹن وہاں اکیلا تھا۔ اس حرامی کی آنکھ میں میں خود کو ذلیل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے محراب عبور کی' پھر ٹھٹک گیا۔ کسی آواز کی گونج میرے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ یہ آواز یقیناً "نیچے ہی سے آئی تھی۔

مارٹن زور زور سے ہنس رہا تھا۔

کوئی چیز شاید ایسی ہی کھانے والی تھی۔ مگر میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس ہنسی میں کوئی کھنک نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ہذیانی عنصر زیادہ تھا۔ میں الجھ سا گیا مگر میں نے قدم پھر بڑھا دیے اس بار میں ہاتھ میں دبی راڈ کو سہارے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔

میں قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے نیچے سے مارٹن کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ "مارٹن....." میں نے سیڑھیوں سے اسے پکارا۔

"کیا ہے؟"

شاید اسے کوئی نئی چیز مل گئی ہے۔ جبھی وہ بہت خوش ہو رہا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا۔ پھر مارٹن ایک دم سے کھانسنے لگا۔ اس کی کھانسی میں کرب تھا۔ میں پریشان ہو گیا۔ بہر حال میں نیچے اترتا رہا۔

مجھے اب پھر مارٹن کا قہقہہ سنائی دیا۔

"تم بہت ہنس رہے ہو کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ مارٹن کی ٹارچ کچھ کمزور ہو رہی ہے۔ ہمیں گویا جلدی سے کچھ کرنا تھا۔ ورنہ ہم اندھیرے میں پھنس جاتے۔ چونکہ ٹارچ میری آنکھوں کے رخ پر تھی میں چیمبر کا منظر نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ بس مجھے مارٹن کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔

پھر میں آخری سیڑھی تک اترا۔ میں نے زمین پر دھری ٹارچ اٹھالی۔ مارٹن مجھے گھٹنوں کے بل بیٹھا دکھائی دیا اسی جگہ جہاں کا پتھر ہٹاتا تھا۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا اور اس پر کچھ کیچڑ لتھڑا ہوا تھا اس کا چہرہ خوف سے مسخ ہو رہا تھا۔ مگر اس کے راستے سے قہقہے ابل رہے تھے۔

کوئی شے اس کے سر پر کھڑی تھی۔

بس کا قد لمبا تھا۔

اس پر نظر پڑتے ہی خود میرے اوسان خطا ہو گئے لمبی ہونے کے علاوہ یہ بے حد شکستہ سی تھی۔ اس نے مارٹن کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اس کا ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ یہ شے مارٹن کو گردن جھکا کر دیکھ رہی تھی خود یہ شے بھی کیچڑ میں لت پت تھی۔

اور پھر۔۔۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی اس ڈھانچے کے کاندھے پر عجیب سا سر رکھا ہوا تھا۔ جب یہ سر ذرا سا گھوما تو مجھے لگا جیسے گھنٹیاں بجی ہوں کیچڑ زدہ چہرے پر مجھے اس کے دانت نظر آئے۔ اس کی کھوپڑی میں آنکھیں تھیں جو گول تھیں اور چمک رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے استخوانی چہرے پر جیسے گوشت اگنے لگا۔ مسلز کھال دونوں نے مل کر اس کھوپڑی کو نقوش بخش دیے۔

میں نے اس ہیبت ناک شے سے نظریں ہٹائیں اور مارٹن کو دیکھا۔ وہ بند دانتوں کے اندر سے آوازیں نکال رہا تھا یہ قہقہے نہ تھے بلکہ دبی دبی چیخیں تھیں۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے پھر وہ جیسے ایک دم سے بوڑھا ہونے لگا۔ اس کا گوشت جیسے اس کی ہڈیوں کو چھوڑ رہا تھا۔ اس کے بالوں کا رنگ بھی مدھم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے گہرے حلقوں میں دھنس رہی تھیں ٹارچ کی روشنی میں سے اسے خالی ہوتے دیکھ رہا تھا۔

اور پھر۔۔۔ ٹارچ ایک دم سے بجھ گئی۔

مارٹن کی چیخیں اب حدوں کو چھو رہی تھیں میں تیزی سے گھوما اور اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا زینے کی طرف لپکا۔ میں نے ہاتھ کی آئرن راڈ کے سہارے جس قدر عجلت سے ممکن تھا اوپر کی سمت بھاگ رہا تھا۔

"پی۔۔۔ ٹر۔۔۔ پیٹر خدا کے لیے مجھے مت چھوڑو۔"

مارٹن کے یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے۔ اس کے بعد تو میں خود بھی چیخنے لگا تھا۔ راڈ کا سہارا نہ ہوتا تو

میں گر کے اٹھ بھی نہ پاتا۔

جس وقت میں سنگی محراب کے پاس پہنچا میں راڈ پھینک دی اور اپنے ہاتھ سے دونوں کان بند کر لیے تاکہ چیخیں اور قہقہے سن سکوں۔

☆ ☆ ☆

مجھے یاد نہیں کہ میں کس طرح سرائے تک پہنچا البتہ یہ یاد ہے کہ کسی نے پوچھا تھا۔ "تمہارا وہ دوست کہاں ہے؟"

اس آواز نے مجھے چونکایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں سرائے کے اندر کھڑا ہوں۔ بار روم کے دروازے پر یہاں پر اور لوگ بھی جمع تھے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ میں چیخا تھا یا بولا تھا البتہ یہ احساس ضرور ہوا تھا کہ یہاں کے لوگوں نے مجھ میں دلچسپی لینا بند کر دی تھی۔ اور سب خورد نوش میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میرے کپڑوں پر گھاس اور کیچڑ کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔

"آخر وہ کہاں ہے؟" اسی آواز نے پھر پوچھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ یہ لینڈ لارڈ ہے جو کاؤنٹر کے پیچھے سے پوچھ رہا تھا۔

"کہیں گھومنے گیا ہے۔" میں نے خود کو کہتے سنا۔ لینڈ لارڈ مایوس سا نظر آیا۔ کیونکہ اس کے نہ ہونے سے اس کی محفل اکھڑی ہوئی تھی۔ کیا میں اسے سب کچھ بتا دوں؟ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا تھا اسی زمین دوز چیمبر میں؟ کیا میں ان لوگوں سے کہوں کہ یہ ہمارے ساتھ چلیں اور اس خوف ناک جگہ مارٹن کو بچا لیں۔

الفاظ میرے منہ سے نہیں نکل رہے تھے "ڈرنک چاہیے؟" بار مین نے پوچھا۔

"ہاں... وھسکی۔" میں نے کہا۔

پھر میں ڈگمگاتا ہوا بار کی طرف چلا۔

بار مین نے وھسکی کا گلاس مجھے دے دیا۔ ایک قریبی دیہاتی سے بلند آواز سے پوچھا۔ "تمہارے ساتھی کے نہ ہونے سے پینے میں مزا نہیں آرہا ہے۔"

"ہاں وہ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔" کسی نے ٹکڑا لگایا۔

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا ہی چاہا تھا۔ کہ بار کا دروازہ بڑے زور سے بند ہوا۔ شور سے میرے کان بج اٹھے۔ میں اچھل کر رہ گیا۔ میں نے بار مین کو دیکھا غصے سے اس کا منہ بن گیا تھا۔

مگر... دوسرے ہی لمحے وہ مسکرانے لگا۔

"میں نے تو سمجھا تھا کہ تم غائب ہو گئے۔" اس نے کہا۔

"نہیں بھائی۔" مجھے ایک مانوس آواز سنائی دی۔

میری رگوں میں خون جیسے منجمد ہو گیا۔ میں نے جلدی سے دروازے کی سمت دیکھا۔

وہاں مارٹن کھڑا ہوا تھا۔

اور مسکرا رہا تھا۔

"کیا... کیسے؟" میں نے دانت کٹکٹائے۔

مارٹن اپنی جگہ سے ہلا اور اندر آ گیا۔ میں نے سردی محسوس کرتے ہوئے اپنی ہتھیلیاں ملیں۔

"ایوننگ۔" اس نے کہا اور پھر وہاں موجود تقریباً سارے سر اس کی سمت گھومے پھر وہ میرے پاس آ گیا وہ مسکرا رہا تھا اور مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ بار کے پاس تھا اور لینڈ لارڈ ٹرے میں گلاس سجا رہا تھا۔

"مارٹن۔"

بالآخر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ اس کے چہرے پر مزاح کے سائے لہرا رہے تھے۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ میری حیرت پر۔

"بتا دیا نا میں نے تمہیں بیوقوف۔" اس نے کاؤنٹر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

گویا جو ہوا سب مذاق تھا۔ مارٹن نے کسی منصوبے کے تحت یہ ڈراما رچایا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس نے مجھے الو بنانے کے لیے کیا تھا۔ اس حرامی نے اتنے دنوں بعد بھی میری تحقیر میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ اس کی تحقیق وغیرہ کیا تھی۔ واقعی میں جب میں اس کے خط پر دوڑا دوڑا آ گیا تھا تو اسے کس قدر خوشی ہوئی ہوگی۔

"تم حرام زادے۔" میں نے اسے گالی دی اور اپنا گلاس منہ سے لگالیا۔

مارٹن بھی اپنا گلاس اٹھا رہا تھا۔

"میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔" اس نے کہا اور گلاس منہ سے لگالیا۔

میں نے اپنا گلاس کاؤنٹر پر کھٹاک سے رکھا اور تیزی سے چلتا ہوا بار روم سے باہر چل دیا۔ مجھے اپنے پیچھے لوگوں کی ہنسی سنائی دی۔ شاید وہ میرے ہی اوپر ہنسے تھے۔ اوپری منزل پر اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بستر پر گر گیا۔ اور مارٹن کی ہلکی آوازیں اور کسٹمرز کے قہقہوں کو سنتا رہا۔ مارٹن ..... آج بھی بہت کامیاب تھا۔ وہ لوگوں کو استعمال کرتا تھا اور یہ احمق نہیں جانتے تھے۔ اسی وقت بھی شاید نچلی منزل پر سارے لوگ مجھی پر ہنس رہے تھے۔

مجھے معلوم تھا کہ مارٹن کیا شے ہے۔ وہ اپنی کہانی عمدگی سے بننا جانتا تھا۔

پھر میں بستر سے اٹھا میں نے کھڑکی کے پردے ہٹائے اور باہر پھیلی رات کو دیکھا۔ اس وقت یکایک بونداباندی شروع ہو گئی تھی۔ ہوا سے درختوں کی شاخیں عفریتی انداز میں ہل رہی تھیں۔ اور یہیں پر کچھ فاصلے پر وہ جگہ تھی جہاں رات کے اندھیرے میں مارٹن نے ایک خوف ناک مذاق کے لیے اسٹیج سیٹ کیا تھا۔ وہ مقبرہ..... وہ ہیبت ناک پتلا۔ اس نے مجھ سے رکنے کے لیے کہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شرم کی وجہ سے اپنا خوف ظاہر نہیں کروں گا۔ اور خود مقبرے میں رک جاؤں گا۔ مگر جب میں چلا گیا تو اس کا منصوبہ مکمل ہو گیا۔ اس عرصے میں اسے وقت مل گیا تھا کہ دوسرے حصے کی تیاری کرلے۔ اس نے میرے لیے اس ہیبت ناک پتلے کو سیٹ کر دیا تھا۔ معاً" نیچے سے قہقہوں کی ایک نئی رو ابھری۔ میں پلٹا میں نے کمرہ عبور کیا۔ اس وقت رات بھر کے لیے میں یہاں قید ہو گیا اور مجبور تھا کہ ان آوازوں کو سنوں جن میں میرے لیے تحقیر تھی صبح کو کیا ہوگا؟ خیر یہ تحقیر یا مارٹن کی طرف سے میرے لیے شاباشی۔ مجھے خوف تھا میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔

مارٹن نے آج مجھے بہت ہی بری طرح بیوقوف بنایا تھا۔ مگر اب نہیں میرا جی چاہ رہا تھا یہاں سے نکلوں نیچے جاؤں اور اسے گلے سے پکڑوں اسے دھکا دے کر دیوار سے بھڑا دوں اور خوب خوب کھری کھری سناؤں۔ صبح کو پہلی فرصت میں میں ٹرین پکڑوں گا اور مارٹن نے اگر مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تو میں مکا مار کر اس کے دانت توڑ دوں گا اور دیکھوں گا کہ وہ مجھ پر پھر کیسے ہنستا ہے۔

مجھے نیچے سے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ غصے سے کھولتا ہوا میں بڑھا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ زور سے کھینچا اور نیچے کی طرف چلا۔ ذہن میں اپنے پلان کی ریہرسل کرتا ہوا۔ میں نے بار روم کے دروازے کو دھکا دیا تو زور سے بجا۔

میں نے اسے عقب میں بند کر دیا۔ میں ادھر اپنے ہاتھ پھیلائے جدھر مارٹن کھڑا تھا۔ وہ بار پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔

"تم....." میں اس کی سمت لپک کر چیخا۔

اور..... فوراً" ٹھٹک گیا۔

کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی تھی۔

کوئی غلطی۔

سرائے کے سارے کسٹمر اسی طرح اپنی سیٹوں پر تھے جیسے میں انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ مگر یہ مختلف سے تھے۔ میں نے دیکھا چند ایک اپنا سر میز پر ڈالے پڑے تھے۔ مگر ان کی آنکھیں مارٹن ہی کی طرف تھیں۔ بقیہ کے ہاتھوں میں خالی جام تھے ان کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ کچھ اپنی سیٹوں پر نیم اوندھے پڑے تھے۔ جیسے غنودگی میں ہوں۔ میں لینڈلارڈ کو دیکھا وہ کاؤنٹر تلے لمبا لمبا پڑا تھا۔ اس کا منہ ہنسی کے انداز میں کھلا ہوا تھا۔

پھر مجھے ان کے چہرے بھی دکھائی دے گئے۔ یہ بہت مرجھائے ہوئے تھے کھوکھلے سے استخوانی تھے۔ ان کا گوشت ہڈیاں چھوڑ رہا تھا۔ میں نے ان کی انگلیاں دیکھیں ان پر گوشت تھا ہی نہیں یہ صرف ہڈیاں تھیں۔ اور ان کی آنکھوں میں عجیب سا کرب تھا۔ اسی

وقت مارٹن نے باروالے سے کچھ کہا اور یہ تمام موجود لاش جیسے لوگ کھلکھلا کر زور سے ہنسے۔ یہ آوازیں مرتے ہوئے جسموں کے منہ سے نکلنے والی آوازوں جیسی تھیں۔ سرائے کے آخری حصے میں کھڑکی کے پاس کسٹمروں میں سے ایک فرش پر لڑھک گیا تھا۔ وہ گوشت کا نہیں ہڈیوں کا پنجر تھا۔ لاشیں سڑ رہی تھیں مگر ان کی کھلکھلاہٹیں جاری تھیں۔

میں مارٹن کی طرف گھوما۔

اس نے گردن ٹیڑھی کر کے میری طرف دیکھا۔ اور مسکرایا۔

اور تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ نہیں مجھے کسی عملی مذاق کا ہدف نہیں بنایا گیا تھا۔ کیونکہ یہ شخص مارٹن نہیں تھا۔

پھنسی پھنسی کراہوں جیسی ہنسی کی آوازوں کو سنتے سنتے۔ میں لڑکھڑا کر الٹے پیروں بھاگا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ اور وہ مخلوق جو مارٹن بنی ہوئی تھی۔ مجھے تکے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشی سی چمک بھری ہوئی تھی۔ میں نے زور سے بار کا دروازہ بند کیا۔ اور باہر کی جانب بھاگا۔

میں تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ باہر طوفان تھا۔ بارش تھی۔ میرا سارا جسم پانی سے شرابور ہو رہا تھا۔ درختوں میں سرسراتی ہانپتی ہوا جیسے مرا مذاق اڑا رہی تھی۔ میں کتنا بھی تیز دوڑ رہا تھا لگتا تھا کہ ہوا اپنے ساتھ سرائے میں اٹھنے والے قہقہوں کو اٹھا کر میرے کانوں میں انڈیل رہی ہے۔ قہقہوں کی آوازیں کبھی سرائے سے بلند ہو رہی تھیں کبھی یہ تہ خانے سے آ رہی ہیں۔ میرا دماغ جیسے پھٹنے والا تھا۔

جب میں جاگا یا یوں کہیے کہ اس ڈراؤنے خواب کی گرداب سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ میں ایکسٹر اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں پڑی بینچ پہ سکڑا پڑا ہوں۔ مجھے بڑا سکون سا محسوس ہوا۔ میں بینچ پر ہی پیر پھیلا کر سو گیا۔ اور صبح تک سوتا رہا۔

صبح ہوئی میرا سوٹ کیس اور کپڑے تو موکنگ برو نامی سرائے ہی میں رہ گئے تھے۔ مگر میرا بٹوہ میری

چٹکلے

بیٹا درسی کتب ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا مصیبت ہے۔ یہ ورڈز ورتھ تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا۔“

والد صاحب نے عینک کے اوپر سے بیٹے کو جھانکا‘ کچھ دیر ڈکشنری کا مطالعہ کیا اور پھر بولے۔ ”بیٹے۔ مجھ سے ورڈز ورتھ کے معنی پوچھو۔ اس کے معنی ہیں بات کے قابل۔ مثلاً تمہاری امی مجھے اکثر کہتی ہیں کہ۔ ”تم کسی بات کے قابل نہیں۔“ انگریزی میں اس جملے کو یوں لکھیں گے۔ ”یو آر ناٹ اے ورڈز ورتھ۔“

☆

شیخ چلی کا حافظہ بہت کمزور تھا۔ رمضان المبارک میں انہوں نے روزوں کی تعداد یاد رکھنے کے لیے ایک ترکیب ایجاد کی۔ وہ افطار کے بعد کھجور کی ایک گٹھلی ایک گھڑے میں ڈال دیتے یوں ایک روزہ ہو جاتا۔ شیخ صاحب کی چھوٹی بیٹی نے جب اپنے والد کو گھڑے میں گٹھلیاں ڈالتے دیکھا تو وہ بھی اپنی گٹھلیاں اسی گھڑے میں ڈالنے لگی۔

عید کے بعد لوگوں نے شیخ چلی سے پوچھا۔ ”آپ نے کتنے روزے رکھے۔“

شیخ صاحب نے کہا۔ ”الحمدللہ! ساٹھ پورے ہو گئے۔“

لوگوں نے کہا۔ ”مہینہ تو انتیس دن کا تھا۔ آپ نے ساٹھ روزے کیسے رکھ لیے۔“

کہنے لگے۔ ”میں نے تو ابھی آدھے بتائے ہیں۔ گھڑے کے حساب سے تو میں نے ایک سو بیس روزے رکھے ہیں۔“

سزا

مقدمے کی سماعت کے سارے عرصے میں جج صاحب اپنے ذہن پر زور دیتے رہے کہ انہوں نے ملزم کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ جب سماعت مکمل ہوگئی اور صرف فیصلہ سنانا باقی تھا تو وہ اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکے اور آخر ملزم سے پوچھ ہی بیٹھے کہ انہوں نے ملزم کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔

ملزم نے کہا۔ ”جناب میں آپ کی بیگم صاحبہ کو موسیقی کا سبق دیا کرتا تھا۔“

”چودہ سال قید بامشقت۔“ جج نے فیصلہ سنایا۔

جیب میں رہ گیا تھا۔ میں پہلی والی ٹرین پکڑے مجھے دو جگہ ٹرین بدلنی پڑی میں ایک گھنٹے بعد نیو کاسل پہنچ گیا۔

دو روز تک میں اپنے فلیٹ میں پڑا رہا۔

تیسرے روز میں باہر نکلا۔ میں نے قریبی نیوز اسٹینڈ سے اخبار خریدا اور ..... وہ خبر اس میں موجود تھی۔ تین افراد ایکسٹر کی سرائے میں مردہ ملے تھے۔ تفصیلات درست تھیں نہ کافی۔ یہ سرسری سی تھیں۔ میرا اندازہ بھی یہی تھا۔ مگر بات صاف تھی۔ پولیس مطمئن نہ تھی۔ انہیں شبہ تھا یہ اموات زہر سے بھی ہو سکتی ہیں۔ وہ علاقائی شراب کی بھٹیوں پر چھاپے مار رہے تھے۔ جبکہ شراب والے برابر کہہ رہے تھے کہ ان کے کوئی گڑبڑ نہیں۔ اس دوران ادھر بہت سے لوگوں نے خوف زدہ ہو کر بیئر پینا چھوڑ رکھی تھی۔

یہ کیا مذاق تھا؟

میں منتظر تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسی باتیں ابھی اور بھی رونما ہوں گی اور پھر.....

اخبار میں خبریں آنے لگیں۔

یہ خبریں ایکسٹر کے آس پاس کے دیہاتوں میں ہونے والے پراسرار اموات سے متعلق تھیں اور ان کا دائرہ آہستہ آہستہ وسیع ہو رہا تھا۔

موت کے جو اسباب لکھے جا رہے تھے وہ بے حد مبہم تھے اور میں سمجھ گیا کہ پولیس اس خوف سے انہیں چھپا رہی ہے کہ عوام میں خوف و ہراس نہ پھیلے۔ یقینی طور پر انہیں ایکسٹر کی موگنگ برڈ نامی سرائے میں ہونے والی اموات کا علم تھا۔ اس میں وہ خبر بھی سب کے حافظے میں محفوظ تھی۔ جو ایک آدمی کے متعلق تھی۔ ایک دریائی پشتے میں سے جس کی لاش ملی تھی۔ یہ کسی کاشت کار لاش تھی شاید۔ اس کے سارے بدن کا خون جیسے نچوڑ لیا گیا تھا۔ اور لاش بالکل اس گنے کی طرح تھی جس کا سارا رس نکال لیا گیا ہو۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر کھدا ہوا تھا۔ وحشت کا .... یا خوف سے بے حال ہو کر کھلکھلانے کا تاثر۔

اب ایک سلسلہ سا چل نکلا ہے۔

ہر روز ایک لاش مل رہی ہے۔

لوگ اندازے لگا رہے ہیں۔ کیا لاشوں کا خون پینے والا کوئی درندہ ہے؟ یا کوئی خون آشام .... یعنی وہ مخلوق جو انسانی خون پر زندہ رہتی ہے؟

مجھے علم ہے کہ ان کے سارے اندازے غلط ہیں۔

مجھے مارٹن کے الفاظ اچھی طرح یاد ہیں۔ جن کا مفہوم اب مجھ پر واضح ہو چکا ہے اس کا کہنا تھا کہ وہ لوگوں کے قہقہوں پر زندہ ہے۔ یہ ہنسنے والے لوگ اسے غذا فراہم کرتے ہیں۔ پہلے تو میں اس کی بات کو بالکل نہیں سمجھا تھا۔ اور اس کے کچھ اور ہی معنی اخذ کیے تھے مگر اب.....

ملنے والی لاشیں اس بات کی تصدیق کر رہی ہیں۔

کہ اس بار میں نے جو کچھ سمجھا ہے اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔

میں نے ساری کہانی بیان کر دی ہے۔ یہ کہاں ختم ہوگی مجھے کچھ پتا نہیں۔ یہ معاملہ آپ پر ہے کہ اس کا یقین کریں یا نہ کریں۔ مگر بس اتنا کیجیے گا وہی جو بات میں نے ابتدا میں کہی تھی ..... مجھے ہنسانے کی کوشش نہ کیجیے گا مجھے کوئی لطیفہ نہ سنائیے گا۔

میں بالکل ہنسنا نہیں چاہتا۔

☆ ☆

قاتل

محمد ظفر

مشہور ناول نگار کی پر سرار موت جو پولیس کے لیے ایک معما بن گئی تھی بظاہر یہ ایک خودکشی کا کیس تھا لیکن خود کشی کرنے کی کوئی وجہ ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ قاتل پکڑا گیا لیکن وہ انوکھا قاتل کون تھا یہ آپ کو کہانی پڑھ کر معلوم ہوگا۔!

"جرم کا ایک پیچیدہ معما" مجرم کو سزا کیسے ملے گی۔

سارے شہر میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی تھی اور اس کی وجہ مشہور ناول نگار ابن شاہ کی پراسرار موت تھی۔ وہ عین اسی روز اس جہان فانی سے رخصت ہوا جس روز اسے اپنی ساٹھویں سالگرہ منانی تھی۔ اس کی لاش ڈیفنس کے شاندار اپارٹمنٹ میں ملی جو اس کی ملکیت تھا جب اس کے مرنے کی خبر عام ہوئی تو بہت سے لوگ حیرت زدہ رہ گئے تھے کیونکہ اس نے محض ایک رات قبل ہی اپنے نئے ناول کی تقریب اجرا میں شرکت کی تھی اور وہ بہت خوش و خرم نظر آرہا تھا۔

یہ بات جلد ہی واضح ہوگئی کہ اس کے مرنے سے لوگوں کو صرف حیرت ہوئی ہے 'کوئی اداس نہیں ہوا' کسی نے بھی اس کے غم مین آنسو بہانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس کی پرانی خادمہ نور بی بی بھی ابن شاہ کے مرنے سے اداس نہیں ہوئی۔ وہ پندرہ سال سے اس کے ساتھ تھی۔ ان شاہ اسے ملتان سے اپنے ہمراہ لایا تھا۔ وہ ادیب کے علاوہ ملتان کا ایک بڑا جاگیردار بھی تھا۔

وہ شہر کے حلقوں میں جانا پہچانا مگر غیر مقبول شخص تھا۔ بدتمیزی اس کی سرشت میں شامل تھی جس کا اظہار اس کے قلم سے بھی ہوتا تھا۔ ناشروں کو اس سے نفرت تھی لیکن وہ ان کی مجبوری بھی تھا۔ ہم عصر ادیبوں اور ناول نگاروں کو تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا' اس کی وجہ اس سے عام نفرت کے علاوہ اس کی کامیابیاں بھی تھیں۔ اس کا کوئی رشتے دار بھی نہ تھا۔ گویا وہ اس بھری دنیا میں تنہا رہتا تھا اور یہاں سے تنہا ہی گیا۔

ابن شاہ کی تنہائی میں اس کی واحد رفیق "دیمی" تھی جو سامی نسل بلی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بڑا جادو تھا۔ وہ بڑے وقار سے دم ہلاتی تھی لیکن موت کے وقت یہ بلی بھی اس کے قریب نہیں تھی اور وہ گیس سے بھرے ہوئے کچن میں تنہا مر گیا۔

تفتیش کرنے والے بڑی مشکل سے دوچار تھے۔ ابن شاہ کو قتل کرنے کی تو کئی وجوہ سامنے آسکتی تھیں لیکن خود کشی کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔



اس کی صحت مرتے دم تک قابل رشک رہی تھی۔ بینک بیلنس بہت تگڑا تھا' کئی اشاعتی اداروں میں اس کے حصص تھے۔ بیوی بچوں کا کوئی وجود نہ تھا اور دولت کے بھی وارث موجود نہ تھے۔

پولیس سرجن کی رپورٹ میں واضح طور سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ موت گیس کی وجہ سے واقع ہوئی ہے جو گیس ککر سے خارج ہو کر کچن میں بھر گئی تھی۔ پولیس کو ککر کھلا ہوا ملا تھا۔ فلیٹ کے بغور اور تفصیلی معائنے سے بھی ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہوتا کہ رات کے وقت کوئی چوری چھپے فلیٹ میں داخل ہوا ہو گا۔

"اسے ہم خودکشی بھی نہیں کہہ سکتے۔" پولیس انسپکٹر نے فائل سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "محض ایک غلطی کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی ہے۔"

"آپ درست فرماتے ہیں جناب۔" ایس آئی اسلم نے کہا۔

"میں ہمیشہ سچ کہتا ہوں اسلم لہٰذا بہتر یہ ہے کہ میرے کہے پر یقین کرو اور کیس فائل کر دو۔"

"لیکن میری چھٹی حس یہ کہہ رہی ہے کہ اس موت میں کسی دوسرے کا بھی ہاتھ ہے۔"

"تو کیا تم اس بڑھی پر شک کر رہے ہو؟"

"نہیں جی۔ لیکن بعض ایسے امور بھی ہیں جن کے باعث حادثاتی موت کے نظریے پر شکوک پیدا ہو سکتے ہیں۔" اس نے پولیس سرجن کی رپورٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اس رپورٹ کے مطابق دائیں ہتھیلی پر زخم کا نشان ہے ایسا ہی مگر اس سے کچھ گہرا زخمی بائیں کلائی پر بھی ہے۔ خون کے چند قطرے ملے ہیں۔ یہ قطرے کچن اور باتھ روم کے درمیان قالین پر نمایاں ہیں' جب کہ باتھ روم کے بیسن پر خون کا دھبا بھی ملا ہے۔ بیسن پر استعمال شدہ سیفٹی ریزر ملا ہے جس کے اوپر میڈیسن کیبنٹ کا دروازہ کھلا ہوا ہے جس کے اندر رکھا ہوا سامان بے ترتیبی کی حالت میں ہے' باتھ روم کے فرش پر خون آلود روئی کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ کیا ان باتوں سے بھی آپ یہی کہیں گے کہ موت حادثاتی تھی جناب؟"

"تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ..... متوفی نے خودکشی کرنے کی نیت سے باتھ روم میں کلائی کی رگ کاٹنے کی کوشش کی لیکن پہلی کوشش میں ناکامی کے بعد حوصلہ ہار بیٹھا' شاید سیفٹی ریزر انگلیوں سے پھسل گیا ہو اور اس نے ہتھیلی کو زخمی کر دیا ہو۔ متوفی نے خون کی وجہ سے پریشان ہو کر میڈیسن کیبنٹ سے روئی نکال کر استعمال کی۔ پھر کچن میں جا کر اس نے چولہے کو کھولا اور گیس کی وجہ سے ہلاک ہو گیا۔"

"مگر خودکشی کا جواز کیا ہے اسلم؟ متوفی کنگال' قلاش' بیمار' بے زار یا قیدی نہیں تھا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اس نے خودکشی کی نیت سے ریزر استعمال کیا۔ وہ خودکشی کرنے کے لیے پستول بھی استعمال کر سکتا تھا' زہر کھا سکتا تھا۔ اس نے خودکشی کیوں کی؟ سوال صرف یہی ہے اور کیونکہ تمہیں حادثاتی موت پر یقین نہیں اور خودکشی کی وجہ کیا تھی۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک بار پھر ابن شاہ کے اپارٹمنٹ کا جائزہ لو' شاید تمہیں کوئی ایسی کارآمد چیز مل جائے جس سے ہم حادثاتی موت کو خودکشی یا قتل میں بدل دیں۔"

✡ ✡ ✡

ایس آئی اسلم' ناول نگار کے خوب صورت اپارٹمنٹ پہنچا تو بوڑھی نوری بی بی نے اسے فوراً "اندر بلا لیا۔ وہ اسے دیکھ کر خوش نہیں ہوئی تھی لیکن اسے اسلم کو دیکھ کر خوف بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے کچن میں لے گئی جہاں صوفے پڑے ہوئے تھے اور خود ایک کرسی پر بیٹھ کر سویٹر بننے لگی۔ قریب ہی ایک بلی آنکھیں میچے لیٹی تھی۔

اسلم نے نوری بی بی کو بھی اپنی اس تھیوری سے مطلع کیا کہ ناول نگار نے خودکشی کی ہو گی۔

"نہیں جناب۔" اس نے زور زور سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ خودکشی کر ہی نہیں سکتے تھے۔

سائیں بزدل آدمی نہیں تھے جناب!"

"مگر آپ اتنے وثوق سے خودکشی کے امکان کی تردید کیوں کر رہی ہیں؟"

"صرف اس وجہ سے کہ انہیں موت سے نفرت تھی۔ وہ زندہ رہنا چاہتے تھے' زندگی سے محبت کرتے تھے اور یہ کہ انہیں خون دیکھ کر چکر آنے لگتا تھا۔ ایک روز میں ڈش صاف کر رہی تھی کہ میری ایک انگلی کسی چیز سے زخمی ہو گئی اور خون نکلنے لگا۔ خون دیکھ کر وہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے مجھے بتایا کہ بچپن ہی سے وہ خون سے الرجک ہیں اور ایک قطرہ بھی دیکھ کر انہیں چکر آنے لگتا ہے۔"

"کیا آپ انہیں پسند کرتی تھیں؟"

"وہ۔ وہ مجھے اچھی تنخواہ دیتے تھے لیکن جہاں تک پسندیدگی کا سوال ہے تو میں نفی میں جواب دوں گی۔ وہ خود اپنی ذات کے علاوہ کسی سے محبت نہیں کرتے تھے۔ بہت بے پروا اور لاابالی انسان تھے اور شہر سے جاتے ہوئے بھی مجھے اطلاع نہیں کرتے تھے' چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ میں گھر میں چھٹی گزارنے کے بعد یہاں واپس آئی تو وہ شہر سے جا چکے تھے اور سیمی بھوکی تھی۔" نوربی بی اور زیادہ تیزی سے سویٹر بننے لگی۔

اسلم نے سٹنگ روم کا معائنہ کیا جس کی دیواروں کے ساتھ الماریوں میں سیکنڑوں کتابیں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ اس نے باتھ روم میں جھانکا اور پھر پائپ نکال کر سوچنے لا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا قاتل اسی اپارٹمنٹ میں موجود ہے؟ کیا بڑی بی نے قتل کیا ہے؟ کیا ابن شاہ کی موت' واقعی حادثاتی ہے؟ کیا اس کی کلائی بلیڈ بدلتے ہوئے کٹی اور وہ گیس کھولتے ہوئے بے ہوش ہو گیا اور گیس نے اسے ہلاک کر دیا؟

نوربی بی قاتل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دبلی پتلی اور کمزور سی ناتواں بوڑھی عورت تھی۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ کچن میں واپس چلا آیا۔

"کیا ابن شاہ سے کسی کی کوئی خاص پرخاش تھی؟" اسلم نے قتل کے شبہہ کو جانچنے کے لیے پوچھا۔

"اس بارے میں' میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ بہت سے لوگوں کو ان سے مخاصمت ہو سکتی تھی اور تھی مگر میں کسی خاص پرخاش کا حوالہ نہیں دے سکتی۔"

"کیا آپ کی موجودگی میں کبھی ان کا کسی سے جھگڑا ہوا تھا؟" اسلم نے پوچھا۔

"کئی مرتبہ... جب بھی کوئی مہمان یہاں آتا تو تلخی ضرور پیدا ہوتی تھی اور ملاقاتی خراب موڈ میں واپس چلا جاتا تھا۔"

اسلم نے لمبی سانس لی۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ اب مزید کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکے گا اور حادثاتی موت' خودکشی یا قتل میں تبدیل نہیں ہو سکے گی۔

اس نے لاشعوری طور سے بلی کو پیار کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا جو اس کے قریب ہی سو رہی تھی۔

"اسے مت چھیڑیں جی۔" نوربی بی کا جملہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ بلی نے اچھل کر اس کے منہ پر پنجہ مارنے کی کوشش کی' حملے سے بچنے کے لیے اسلم نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے' پنجہ اس کی ہتھیلی پر لگا اور اس سے خون بہنے لگا۔

"اوہ' ایک منٹ صبر کریں۔ میں آپ کی ہاتھ کی ڈریسنگ کے لیے سامان لاتی ہوں۔" نوربی بی گھبرا کر باتھ روم کی طرف چلی گئی جہاں دوائیں رکھی ہوئی تھیں۔

لیکن اسلم کی نظریں تو بلی پر جمی ہوئی تھیں۔ جو اب انگڑائی لے کر دم ہلا رہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بلی نے زقند بھری اور گیس اسٹوو پر پہنچ گئی۔ اس نے بڑے خوب صورت انداز میں ایک اور انگڑائی لیتے ہوئے دونوں پنجے گیس ککر کے سوئچ پر مارے۔ سوئچ آف کے بجائے آن کا اشارہ دینے لگا۔

اسلم نے اثبات میں سر ہلایا اور ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ حیران تھا کہ قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اس کا چیف اس قاتل کو کیسے کیفر کردار تک پہنچائے گا؟

☆ ☆

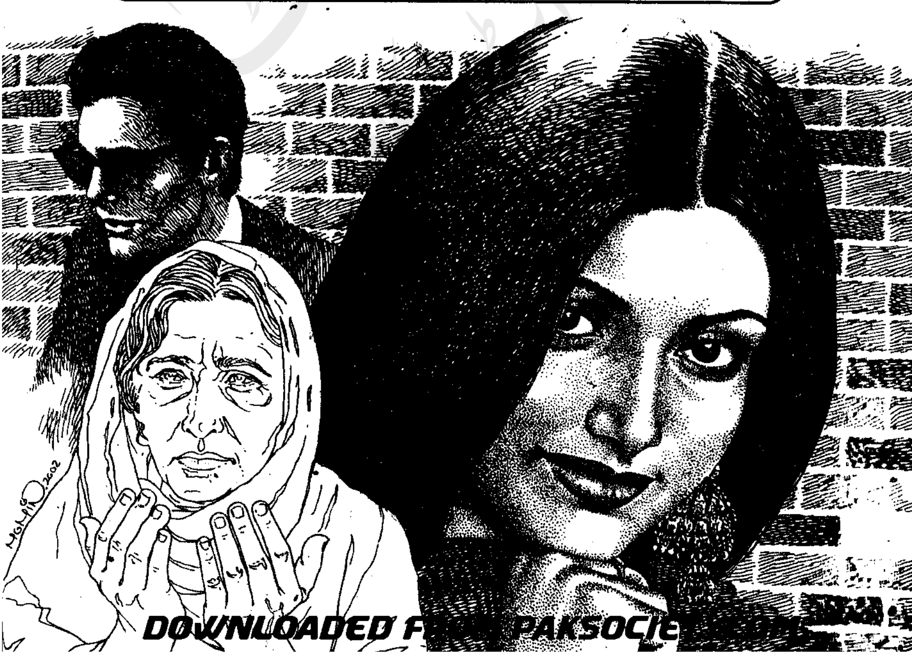
زہریلی عورت

ایم الیاس

دوسری اور آخری قسط

عورت محبت کا سرچشمہ ہوتی ہے بیوی بنتی ہے تو شوہر پرست ہوجاتی ہے۔ ماں بنتی ہے تو اس کے اندر ممتا کا عظیم جذبہ پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ محبت کرنا اور نبھانا جانتی ہے۔ ایثار اور قربانی کا جذبہ اس میں موجود رہتا ہے لیکن جب اسے دھوکا دیا جاتا ہے اور اس کی محبت کو پامال کیا جاتا ہے تو پھر وہ انتقام لیتی ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جسے محبت کے نام پر فریب دیا گیا تو وہ انتقام لینے کے اندھے جنون میں مبتلا ہوکر ایک خطرناک اور خوف ناک زہریلی ناگن بن گئی اس طویل کہانی میں آپ دیکھیں گے کہ اس نے اپنے فریبی محبوب سے انتقام لینے کے لیے کیسے جال بچھایا، ایم الیاس نے بنگلا دیش کے ماحول میں لکھا ہے جسے آپ مدتوں بھلا نہ سکیں گے۔

نفرت اور محبت کے جذبات کی ایک انوکھی کہانی





ان اٹھارہ برسوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی البتہ چند بڑی دکانوں کا اضافہ ضرور محسوس ہوا تھا۔ چھوٹا سا ہوٹل جو برگد کے نیچے تھا اور جس کی چائے اور پراٹھا مشہور تھا اور اسے مغلیہ پراٹھا کہا جاتا تھا۔ اسے کھانے اور چائے پیتے لوگ دور دراز سے آئے تھے۔ یہ ہوٹل رات بارہ ایک بجے تک کھلا رہتا تھا۔ وہ بھی بند نظر آیا تھا مگر اس کے اندر چراغ کی روشنی ہو رہی تھی جو دروازے کے نیچے سے جھانک رہی تھی۔

راستے میں کوئی اکا دکا آدمی بھی نظر نہیں آئے۔ بازار میں پہلے کبھی ایسی ویرانی نہیں دیکھی تھی.... شاید اس خوں خوار کتے کی وجہ سے ہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا دبکے تھے۔ یہ سب دیکھ کر میرا دل بہت خراب ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہر گھر میں مرگ سوگ منا رہے ہوں۔ بازار کے علاقے سے نکل کر میں ابو بکر کے گھر کی طرف تیزی سے بڑھ گیا۔ شہر میں رہتے ہوئے آنکھیں روشنیوں کی عادی ہو چکی تھیں۔ اس لیے گھپ اندھیرے میں چلنا خاصا دشوار ہو رہا تھا۔ راستے میں مجھے دو ایک جگہ ٹھوکر بھی لگی۔ میں توازن قائم نہ رکھتا تو اوندھے منہ گر پڑتا.... پھر جلد ہی میری نظریں بھی اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئیں اور میرے لیے تیز تیز قدم اٹھانا مشکل نہ رہا۔

میں نے ابو بکر کا گھر تاریکی ہونے کے باعث آسانی سے شناخت کر لیا۔ اس لیے بھی کہ کبھی میرا گھر جو اس کا پڑوس تھا۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا وہ بڑے تالاب کے کنارے بنا ہوا تھا۔ اس مکان کا احاطہ بہت وسیع و عریض تھا۔ میں نے دروازے پر رک کر اپنے کان اندر سے آنے والی آوازوں پر لگا دیے۔ میں ہر طرح سے اپنی تسلی کر لینا چاہتا تھا اس لیے کہ اس سے ملتے جلتے گھر جو تھے وہ دو تین اور بھی تھے جو پڑوس میں واقع تھے۔ مجھے ابو بکر کی آواز اندر سے سنائی۔ وہ اپنے کسی بچے کو بری طرح ڈانٹ رہا تھا۔ مجھے یک گونہ مسرت ہوئی۔

میں نے اپنا لرزاں ہاتھ بڑھا کر دروازے پر دستک دی۔ دستک کی آواز گونجتے ہی یک لخت باتوں کا شور دم توڑ گیا۔ ان سب کو شاید حیرت سے زیادہ ان جانا سا خوف محسوس ہوا ہو گا.... کہ اس وقت دروازے پر کون آیا ہو گا؟

”آپ دروازہ کھولنے سے پہلے یہ پوچھیں کہ کون آیا ہے؟“ ایک عورت کی آواز آئی۔ یقیناً“ اس کی بیوی ہو گی۔ ان دونوں اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا ایک لڑکی سے رومانس بڑا رومانی اور جذباتی چل رہا تھا۔ وہ اس کی منگیتر تھی۔ وہ تالاب پر دل کے ارمان پورے کرتے تھے۔

”تم پریشان کیوں ہوتی ہو....؟“ ابو بکر نے سرگوشی کے انداز میں آہستگی سے اسے دلاسا دیا۔ ”جو کوئی بھی ہو گا وہ گاؤں ہی کا ہو گا۔ شاید کسی ضروری کام سے آیا ہو گا.... شاید بہت پریشان ہو۔ ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو جاؤ۔“

”جو بھی آیا ہو.... لیکن آپ اس کے ساتھ کہیں نہیں جائیں گے؟“ اس کی بیوی کی آواز میں خوف چھپا ہوا تھا۔

چند لمحوں کے بعد ابو بکر کی آہٹ ابھری۔ اس کے سوا دروازے پر کون آ سکتا تھا۔ یہ آہٹ بتدریج دروازے کے پاس آکر تھم گئی۔

”کون ہے بھئی....؟“ ابو بکر نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

ابو بکر کی مانوس آواز میرے کانوں میں رس گھول گئی جس میں حیرت کا شائبہ بھی تھا۔

”تمہارا ایک دوست ہوں.... معلوم نہیں تم پہچانو گے بھی یا نہیں۔ کہیں بھول نہ گئے ہو۔ تمہاری محبت کی آزمائش کرنے آیا ہوں۔“ میں نے لہجہ بدل کر کہا۔

دوسرے لمحے دروازہ آہستہ سے کھل گیا۔ ابو بکر کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لالٹین تھی جس کی لو اس نے اونچی کر رکھی تھی۔ اس نے لالٹین اوپر اٹھا کر میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں استعجاب بکھر گیا۔ وہ متوحش زدہ انداز سے مجھے تکنے لگا۔

کسی بھی شخص کی زندگی میں اٹھارہ برس کا عرصہ کم نہیں ہوتا ہے.... ابو بکر اور میں ایک جگ بیت جانے

کے بعد ایک دوسرے کے سامنے مبہوت کھڑے ہوئے تھے۔ اگر میں نے اس کی آواز سنی نہ ہوئی ہوتی تو اسے پہچان بھی نہ پاتا۔ اس کے چہرے پر ان گنت شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے بال جو کبھی گہرے سیاہ تھے ان میں چاندی کے تار جھلملا رہے تھے۔ جسم کمزوری کے باعث خمیدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ابوبکر مجھے پہچان چکا تھا مگر شاید اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا تھا اس لیے وہ اپنی جگہ جامد سکتے کی کیفیت میں کھڑا ہوا تھا۔

''ابو....!'' میرے ہونٹوں پر سرگوشی کی طرح ایک لفظ مچلا اور سناٹے میں بازگشت کی طرح گونجنے لگا۔

ابوبکر نے لالٹین فرش پر رکھ دی.... اور پھر اس کے لرزتے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے۔ وہ مجھے اپنے کمزور اور ناتواں بازوؤں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا تھیلا بھی نیچے رکھ دیا اور پھر ہم دونوں بڑی محبت اور گرم جوشی سے بغل گیر ہوگئے۔

ابوبکر نے مجھے اس شدت سے بھینچ لیا جیسے وہ مجھے اپنے وجود میں سمالینا چاہتا تھا۔ پھر وہ میرے کاندھے پر سر رکھ کر سسکنے لگا۔ میں بھی اتنے عرصے بعد اس کی بے پایاں اور پرخلوص محبت کا یہ انداز دیکھ کر جذباتی ہو گیا۔ مجھے اس خلوص اور چاہت کی توقع نہیں تھی۔ کیوں کہ وقت اور حالات کی گرد محبت پر تہ بن کر جم جاتی ہے۔ بے اختیار میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر گئیں۔

اندر سے اس کی بیوی.... نوجوان بیٹی اور بچے نکل آئے۔ اس کی بیٹی نے سراسیمگی سے باپ سے پوچھا۔

''کیا ہوا ابو....؟'' پھر وہ ہم دونوں کو جذباتی انداز سے بغل گیر دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

✡ ✡ ✡

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم دونوں مکان کے باہر بنے ہوئے چبوترے پر آبیٹھے۔

چاند کی ڈھلتی ہوئی تاریخیں تھیں۔ آسمان کے چوڑے چکلے سینے پر نصف چاند منور تھا۔ اس کی پھیکی کرنیں ہر سو اپنا جال بن رہی تھیں۔ دھند چاندنی میں ناریل اور سپاری کے درختوں کا نظارہ بہت ہی دل فریب دکھائی دیتا تھا۔ اس نظارے نے ماضی کو حال بنا دیا تھا۔ اور سینے میں ایک عجیب سی فرحت بھر دی تھی۔

میں نے ابوبکر پر یہاں آنے کا مقصد کھل کر ظاہر نہیں کیا.... البتہ اسے وہ تمام واقعات سنا دیے جو مجھ پر بیتے تھے۔ میں نے نیلم چوہدری اور ذکیہ خانم کی سرفرازی' مہربانیوں اور فیاضی کا ذکر نہیں کیا۔ صرف نیلم چوہدری کی بے اعتنائی اور خود غرضی کے متعلق بتایا۔ لانچ میں سفر کے دوران اس بوڑھے کی بیوی کا ذکر بھی گول کر گیا جو اچانک روشنی گل ہونے پر مجھ پر خود سپردگی سے پیش آئی اور باہم پیوست ہونا چاہتی اور میں نے اسے سرفراز ہونے نہیں دیا۔ میں نے اسے جو واقعات سنائے تھے ان بدمعاشوں کا تذکرہ بھی تھا جنہوں نے لانچ میں میری درگت بنائی تھی۔ پھر اس لڑکی کا بھی ذکر آیا جس نے میری تیمار داری کی تھی اور ایک سگی بیٹی سے بھی بڑھ کر خدمت کی تھی اور میرے صحت یاب ہونے کے بعد مجھے پراسرار انداز سے ویرانے میں چھوڑ گئی تھی۔

ابوبکر نے میری رام کہانی بڑے غور اور توجہ سے سنی۔ اسے بدمعاشوں والے واقعہ پر بڑی حیرت ہوئی۔ اس لڑکی کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ وہ آس پاس کے گاؤں اور بستیوں میں کاروبار کے سلسلے میں آتا جاتا رہتا ہے لیکن کبھی اسے اس ناک نقشہ کی کوئی لڑکی کبھی دکھائی نہیں دی۔

میرے استفسار پر ابوبکر نے گل ناز کے بارے میں مختصر طور پر بتایا۔

''چند برسوں پہلے کی بات ہے کہ اس عورت نے یہ حویلی مہاراجہ کے بیٹے سے کوڑیوں کے مول خریدلی تھی۔ مہاراجہ نے اس لیے یہ حویلی بیچ دی تھی کہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی جو ہاتھ آجائے۔ اس عورت نے اس حویلی کے اندر نہ صرف کمروں کی مرمت کرائی بلکہ رنگ و روغن بھی اور اس کی عمارت

کے باہر بھی رنگ و روغن سے اس کا نقشہ ہی بدل دیا اور پھر اندر کے تمام کمرے آراستہ پیراستہ کیے۔ اس کی آرائش و زیبائش قابل دید ہے۔ اس کی آسائش کسی محل سے کم نہیں ہے وہ ہر برس دو تین مہینے کے لیے گاؤں آتی ہے اور اس ملک کی مہارانی کی طرح شان و شوکت سے رہتی ہے۔ اس کے پاس بے پناہ دولت ہے۔ نوکروں کی فوج اس کی خدمت اور حفاظت کے لیے ہر وقت مستعد رہتی ہے اس نے بہت سے خطرناک اور خوں خوار کتے پال رکھے ہیں جن کی جسامت شیروں جیسی ہے۔ انہیں دیکھتے ہی جسم پر جھرجھری دوڑ جاتی ہے۔ وہ رات کے وقت اپنے کچھ کتوں کو کھلا چھوڑ دیتی ہے لیکن آج تک ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا جس سے انسانی جان کو کوئی خطرہ پیش آیا ہو۔ پھر بھی لوگ ان کتوں سے خوف زدہ رہتے ہیں اور رات کے وقت باہر نہیں نکلتے ہیں۔ بازار اور ہوٹل بھی دن کے ڈوبتے ہی بند ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں عورتیں کیا نوجوان لڑکے اور مرد بھی باہر نہیں نکلتے ہیں۔"

پھر میں نے ابوبکر سے جو سوالات کیے تو اس نے مزید بتایا۔

"اس عورت کی عمر تیس بتیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن اس کا حسن و شباب نوخیز عمر کی دوشیزاؤں کو بھی شرماتا ہے۔ چھریرے اور متناسب بدن اور قامت کی وجہ سے انتہائی پرکشش اور جاذبیت سے بھرپور دکھائی دیتی ہے۔ وہ عورت کسی حد تک سخت مزاج لیکن فطرتاً اچھی طبیعت کی ہے۔ اس نے گاؤں والوں پر کوئی ظلم نہیں کیا اور نہ ہی کسی کو ستایا۔ البتہ اس نے ان لوگوں سے ان کی زمینیں خرید لیں جو اس گاؤں کے چوہدری بنے ہوئے تھے اور ان میں بڑا غرور اور تکبر تھا۔ اس نے انہیں کوڑی کوڑی کا محتاج بنا دیا۔

اس عورت کی ذاتی زندگی کا کسی کو کوئی علم نہیں ہے۔ قطعی طور پر اس کے متعلق کوئی بھی کچھ بتانے سے قاصر ہے۔ بڑی پراسرار اور دبدبے کی عورت ہے۔ اس کے متعلق بہت سی چہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی ہے.... کسی کا خیال ہے کہ وہ ایک بیوہ عورت ہے۔ ایک اور بات اس عورت کے بارے میں زد عام ہے کہ اس کا شوہر لندن میں رہتا ہے۔ کاروبار کرتا ہے اور ہر ماہ اس کے اخراجات کے لاکھوں کی رقم بھیجتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کسی رانی کی طرح ٹھاٹ باٹ سے رہتی ہے۔"

"مگر ڈھاکا میں اس عورت کے ظلم و ستم کی بہت ساری کہانیاں مشہور ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "اسے قاتلہ کہا جاتا ہے۔"

"یہ اس عورت کی ذات پر سراسر بہتان ہے۔" ابوبکر نے سختی سے تردید کی۔ "گاؤں کا ایک شخص بھی اس کے خلاف گواہی نہیں دے گا۔" میں چکرا کر رہ گیا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ مشتاق احمد خان نے اس عورت کے بارے میں مجھ سے غلط بیانی کی تھی اور میرے دل میں نفرت بھر دی تھی۔ اس نے مجھے ایک ایسی عورت کو قتل کرنے کی ذمے داری سونپی تھی جو بالکل بے گناہ تھی۔ صحیح صورت حال واضح ہونے کے بعد میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں کیا نہ کروں؟

ابوبکر نے مجھے پریشان اور فکر اور سوچ میں مبتلا دیکھ کر کہا۔

"میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں کہ جس کا تم شاید ہی یقین کرو گے.... گاؤں والوں کے لیے بھی یہ بات حیرت کا باعث ہے کہ یہ عورت نہ صرف گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہے اور گاؤں کے ایک ایک فرد کے بارے میں اس کی معلومات وسیع تر ہیں۔ اسے ذرا ذرا سی باتوں کی خبر رہتی ہے۔ وہ گاؤں کے ایک ایک فرد اور اس کے خاندانی پس منظر سے بھی بخوبی واقف ہے۔ خدا جانے اس نے یہ ساری معلومات کہاں سے اور کیسے حاصل کی ہیں۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے گاؤں کے کسی مرد کو ملازم رکھا ہوا ہو جس سے اس نے یہ معلومات حاصل کیں اور اب بھی کرتی رہتی ہو۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔۔۔" ابوبکر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "گاؤں کا کوئی بھی شخص ملازم ہے اور نہ ہی مخبر۔۔۔" میری سوچ میں ایک تلاطم اور تخیبو جنم لینے لگا۔

مجھے ابوبکر کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس عورت کو قتل کرنا اس قدر آسان نہیں ہے۔ جیسا کہ میں تصور کر لیا تھا۔

وہ اس حویلی میں کسی ریاست کی رانی کی طرح شان و شوکت اور تمکنت اور جاہ و جلال سے رہتی تھی اور اس نے اپنی حفاظت کے لیے خوں خوار کتے پال رکھے تھے۔ کتوں کے علاوہ بہت سارے مسلح محافظ بھی موجود تھے۔ وہ جب بھی حویلی سے باہر نکلتی۔۔۔ اس کے ہمراہ کتوں اور مسلح محافظوں کا لشکر ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس تک رسائی ممکن نہیں تھی اور نہ ہی چھپ کر اسے نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔

میرا ذہن اذیت ناک کش مکش میں مبتلا ہوتا گیا۔ اس عورت کو قتل کرنے میں سراسر جان کا خطرہ تھا۔ جب کہ دوسری صورت میں میرے لیے پھانسی کا پھندا تیار تھا۔ میری جان دونوں طرف سے سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی راہ اختیار کروں؟ اگر میں کسی طرح ایک بے گناہ عورت کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کامیاب ہو جاتا تو میرا ضمیر مجھے زندگی بھر چین لینے نہیں دیتا لیکن میرے دامن سے وہ داغ ضرور دھل جاتے جو مجھے جیل کی کوٹھری اور پھانسی کے پھندے تک لے جا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بھاری رقم بھی میرے ہاتھ آ جاتی جس کے ذریعے میں نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔

میرے لیے مشتاق احمد خان کی شخصیت بھی پراسرار اور معمہ تھی۔ وہ گل ناز کا شوہر بھی ہو سکتا تھا۔ گل ناز بے پناہ دولت کی مالک تھی۔ گل ناز کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھ کر نکال پھینکنا چاہتا تھا تاکہ اس کی ساری دولت اور املاک پر قابض ہو جائے۔ اس کے علاوہ اس کا گل ناز سے اس کا کوئی رشتہ ناتا بھی ہو سکتا تھا جو فی الوقت میری نظروں سے اوجھل تھا۔ میں دل ہی دل میں مشتاق احمد خان کی ذہانت اور منصوبے کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

اس کے لیے گل ناز کو راستے سے ہٹانا ناممکن تھا تو اس نے میرا انتخاب کیا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے ایک بھاری رقم مقرر کی تھی۔ یقیناً "اس دور میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں لیکن ہر شخص کی جان ارزاں بھی نہیں ہے۔ کم از کم گل ناز کی زندگی ارزاں نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ جانے گل ناز کب کی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو چکی ہوتی۔

مشتاق احمد خان کو بھی اس بات کا یہ احساس ہو چکا تھا کہ گل ناز کو قتل کرنا کسی بھی اجرتی قاتل کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ شاید اجرتی قاتلوں کو اس مشن پر بھیج چکا تھا تو انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اور پھر اسے یہ خیال آیا ہوگا کہ یہ فریضہ کوئی بہادر سپاہی انجام دے سکتا تھا۔ مشتاق احمد خان غالباً "یہ بات بھول گیا تھا کہ ایک جری سپاہی اور پیشہ ور قاتل میں فرق ہوتا ہے۔ اس میں اس کی اپنی کوئی غرض نہیں ہوتی اور نہ ہی موت کی کوئی پروا کرتا ہے۔ وہ کسی بے گناہ کو قتل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

کافی دیر تک بڑی سنجیدگی اور فکر مندی سے غور کرنے کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچا کہ گل ناز کو قتل کرنا مناسب نہیں مجھے واپس مشتاق احمد خان کے پاس پہنچ کر کسی ترکیب سے بقایا رقم حاصل کر لینی چاہیے۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

دوسرے دن میں نے ابوبکر سے گاؤں والوں اور دوستوں کے بارے میں دریافت کیا۔۔۔ چندا اماں کے متعلق بھی پوچھا جو اپنی بیٹی بانو کے ساتھ اسی گاؤں میں رہ رہی تھی۔ چندا اماں کے بارے میں ابوبکر نے بتایا 'چندا اماں سترہ اٹھارہ برس پہلے ہی بیٹی کے گناہ کے دکھ سے مر گئی۔ بانو اپنے گناہ کا بوجھ لے کر جانے کہاں چلی گئی۔ شاید اس نے کسی دریا میں خود کر خود کشی کر لی۔ کیوں کہ اس گناہ گار لڑکی کو کون سہارا دے سکتا تھا۔ اس کا یہ پاپ نہ صرف بانو بلکہ گاؤں والوں کی عزت پر ایک بدنما داغ تھا۔

میں نے گاؤں والوں اور دوستوں کے بارے میں

سن کر سکون کا سانس لیا۔
قلب کو بڑی طمانیت نصیب ہوئی اور ایک ان جانے کیف سے دوچار ہو گیا۔ خوش قسمتی سے میرے تمام دوست زندہ سلامت تھے۔ بوڑھے لوگوں کی قبریں آباد تھیں... جو بزرگ زندہ رہ گئے تھے ان کی خدمت میں حاضری دی تو انہوں نے ڈھیر ساری دعائیں۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے بھرا ہوا ریوالور جیب میں رکھا اور ابوبکر کو اعتماد میں لے کر اسے ساری کہانی سنائی تو وہ بھونچکا ہو کر رہ گیا۔

جب میں نے اسے حویلی جانے کا خیال ظاہر کیا تو وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ اس نے مجھے بے حد سمجھایا کہ رات گئے میرا حویلی کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہاں کتے آزادانہ گھومتے ہیں۔ ان سے بچ کر حویلی میں گھسنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

ابوبکر کو علم نہیں تھا کہ اس حویلی سے ماضی میں میرا کیا رشتہ رہ چکا ہے۔ میں اس کے چپے چپے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے کئی راتیں اسی حویلی میں بسر کی تھیں۔ وہاں کی یادیں میرا اثاثہ تھیں۔ وہاں سنہری یادیں جو تھیں ان کے لمحات اور گھڑیاں فراموش نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کیا تھا اور آخری سانس تک انہیں بھول بھی نہیں سکتا تھا۔ ابوبکر کر کہنا تھا کہ دن کے وقت بھی کوئی حویلی کے قریب بھی نہیں پھٹکتا اور ایک تم رات کے وقت جا رہے ہو؟ ایک طرح سے تم اپنے پیروں پر کلہاڑی نہیں مار رہے ہو بلکہ خودکشی کرنے پر کمر باندھ لی ہے۔ ابوبکر چوں کہ میرے جان نثار دوستوں میں سے تھا اس لیے اس نے مجھے خطرے میں دیکھ کر ساتھ چلنے پر اصرار کیا لیکن میں اسے سمجھا بجھا کر حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے احتیاطاً "پنسل ٹارچ ساتھ لے لی تھی۔ اندھیرے میں یہ ایک طرح سے ننھی مشعل تھی۔

چاروں طرف ایک گہرا سکوت چھایا ہوا تھا... پتا بھی کھڑکتا تو آپ ہی آپ میرے ہاتھ کی گرفت ریوالور پر مضبوط ہو جاتی اور میں چوکنا ہو کر قدم اٹھانے لگتا۔ مجھے سب سے زیادہ کتوں کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اگر چار کتوں نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا تو میرے لیے ناگہانی مصیبت کھڑی ہو جائے گی لیکن میں خیروعافیت سے حویلی کے عقبی حصے میں پہنچ گیا جس کی ذرا بھی توقع اور امید نہ تھی۔

حویلی پر گہرے سکوت اور تاریکی کا راج تھا۔ کبھی کبھی کسی کتے کے زوردار بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی... وہ جیسے ہی چپ ہوتا تو پھر سے سکوت طاری ہو جاتا۔ میں کافی دیر تک عمارت کے احاطے میں کھڑا رہا اندر کی سن گن لیتا رہا۔ میرے کان حویلی کے صدر دروازے پر لگے ہوئے تھے مجھے اندازہ نہیں ہو پا رہا کہ مسلح گارڈ اس وقت کہاں ہوں گے... خاصا وقت گزرنے پر جب کوئی آواز سنائی نہ دی تو میں نے سمجھ لیا کہ سب اس وقت گہری نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بظاہر اس چھوٹے سے گاؤں میں انہیں کس بات کا خطرہ ہو سکتا تھا۔

میں نے پنسل ٹارچ سے اس مقام کا اندازہ لگایا جہاں گھنی جھاڑیاں ایک زمین دوز راستے کو چھپائے ہوئے تھیں۔ اٹھارہ برس قبل میں اس چور راستے سے حویلی میں داخل ہوا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں گل ناز نے وہ گزرگاہ بند نہ کرا دی ہو لیکن میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ تھوڑی دیر کی تلاش اور جستجو کے بعد جھاڑ جھنکار میں وہ چھپا ہوا راستہ نظر آیا۔ شاید کسی ہنگامی حالت کے پیش نظر اسے دانستہ کھلا چھوڑ دیا گیا یا پھر اسے بند کرنے کا کسی وجہ سے سوچا نہ گیا ہو۔

میں نے پلٹ کر محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا اور اس راستے سے حویلی میں داخل ہو گیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور مجھے واضح طور پر دل کے دھڑکنے کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ میری پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ حویلی کا ماحول ایک پراسرار اور بوجھل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی زہریلے سانپ کی طرح ڈستا ہوا محسوس ہو رہا تھا... راہداریاں ویران پڑی تھیں... کسی راہ داری میں شمعیں بھی روشن نظر آئیں۔ میں ایک تاریک راستے سے گزرتا ہوا اس زینے کی جانب بڑھا جو ایک خواب گاہ کی طرف جاتا

تھا۔ وہ خواب گاہ بالائی منزل کے مغربی حصے میں واقع تھی اور حویلی کی دیگر خواب گاہوں سے نسبتاً "کشادہ" ہوادار اور عالی شان تھی۔ میرا خیال تھا کہ گل ناز نے اس خواب گاہ کا انتخاب کیا ہوگا۔ میرا یہاں آنے کا مقصد ہی صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ گل ناز کون سی خواب گاہ استعمال کرتی ہوگی۔

ہر چند کہ میں گل ناز کو موت کے گھاٹ اتارنے کا خیال دل سے نکال چکا تھا۔ تاہم میں اپنے اس فیصلے پر بہت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا تھا۔ میرے دل و دماغ میں برابر ایک کش مکش سی جاری تھی اور میرے لیے کسی حتمی فیصلے پر پہنچنا دشوار ہو گیا تھا۔ میری جان ایک بلیک میلر کے ہاتھوں میں تھی اور اس سے چھٹکارا پانے کا واحد راستہ یہ تھا کہ میں گل ناز کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔۔۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک بار حویلی کا اچھی طرح سے جائزہ لے لوں اور ساتھ ہی گل ناز کی خواب گاہ معلوم کر لوں تاکہ جب کبھی بھی اسے قتل کرنا ناگزیر ہو جائے تو عملی قدم اٹھانے میں دشواری نہ ہو۔ اس کی خواب گاہ معلوم کیے بغیر میں اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور پراگندہ سا خیال میرے دل میں گدگدایا۔ ابوبکر نے اس کے حسن و شباب اور گداز اور جسمانی تناسب کی تعریف کی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا اس کا چھریرا، متناسب اور ابلتا شباب کسی بھی سولہ برس کی کنواری دوشیزہ کی طرح پرکشش ہے اور ایسا لگتا ہے کہ روز بروز وہ نوجوان ہوتی جا رہی ہے اور اس کی عمر کم ہوتی جا رہی ہے۔ جب کبھی بھی وہ نظر آتی ہے تو مرد اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے۔ دل کرتا ہے کہ اسے نہ صرف بے لباسی کی حالت میں دیکھوں بلکہ اسے اپنی آغوش میں لے کر اس کے چہرے پر جھک جاؤں۔ نہ صرف اس کے رسیلے ہونٹوں کی بلکہ اوپر سے نیچے تک انگ انگ کی مٹھاس کو ہونٹوں میں جذب کر لوں اور کسی طوفان کی طرح اسے تاخت و تاراج کر دوں۔ رات جب کبھی ہم میاں بیوی جذبات کی رو میں ہوتے ہیں تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ وہ میری آغوش میں باہم پیوست ہے۔ اس عورت کا ایسا بجلی بھرا جسم اور خدوخال تڑپاتے ہیں کہ رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ تم اسے دیکھو گے تو تمہارے دل میں ایسے ہی پراگندہ خیالات جنم لیں گے۔ جب کہ میں بیوی اور بچوں کا باپ ہونے کے ناتے ایسا نہ سوچوں لیکن کیا کروں؟ دل اور جذبات کے ہاتھوں میرا تصور مجھے بھٹکاتا رہتا ہے۔

میں نے سوچا ہوا تھا کہ جب اس عورت سے تنہائی میں مڈبھیڑ ہو جائے اور اسے موت کی نیند سلانے سے پہلے اسے تاخت و تاراج کر دوں گا۔ کیوں کہ اس کے کارن میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگائی اور پھر ابوبکر نے اس کے حسن و شباب اور جسم اور حسن کی کرشمہ سازیوں کی جو تعریف کی اس نے میرے جذبات کو تند کر دیا تھا۔

میں نے بالائی منزل کے زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ کسی کتے کی غراہٹ سنائی دی۔ میں اپنی جگہ منجمد ہو گیا اور دہشت کی لہر میرے بدن میں دوڑی تو جیسے میرا سارا خون خشک ہو گیا۔ بدحواسی کے سبب مجھ میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ پیچھے مڑ کے موت کے فرشتے کو دیکھ لوں۔ چند ثانیوں کے بعد کئی اور کتوں نے غرانا شروع کیا تو میں مزید دہشت زدہ ہو گیا۔ پھر اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ کتے میری پشت پر نہیں بلکہ کسی کمرے میں بند ہیں وہ میری بو سونگھ کر یا کھڑکی سے جھانک کر غرا رہے ہیں۔ بالفرض حال وہ آزاد ہوتے تو ابھی تک میرا تیا پانچا ہو چکا ہوتا۔ ظاہر وہ اتنی مہلت دینے سے رہے۔

میں نے ریوالور پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کی اور لبلبی پر انگلی رکھ دی۔ پھر پلٹ کر دیکھا جہاں سے کتوں کے غرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک جنگلے دار کھڑکی نظر آئی۔ جنگلے کے عقب سے چار انتہائی خوں خوار کتے اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ ان کی خوف ناک اور لمبی لمبی زبانیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ چاروں ایک ہی نسل

سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب سے خطرناک نسل تھی اور بے حد قیمتی بھی تھے۔ سری لنکا میں نایاب تھے تو یہ سندر بن یا پھر افریقہ کے جنگلات میں پائے جاتے تھے۔ لیکن ان میں ایک خوبی یہ تھی اگر انہیں سدھایا جائے تو جلد سدھ جاتے تھے۔

یکایک انہوں نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ ان کے شور سے پوری حویلی گونجنے لگی۔ چند لمحے بعد کسی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر ساری حویلی میں جیسے بھونچال سا آگیا۔ میں حد درجہ خائف اور سراسیمہ سا ہو کر مخالف سمت دوڑ پڑا۔ بدحواسی کے باوجود میں اپنی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا۔ فوجی تربیت آج کام آگئی۔ دائیں بائیں.... اور دو تین موڑ مڑنے کے بعد میں ایک راہ داری میں پہنچ گیا جہاں آمنے سامنے دو رویہ کمرے بنے ہوئے تھے اور ان کے دروازے خوب صورت اور مضبوط لکڑی کے تھے۔

معاً عقب سے بھی دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے سرعت سے پلٹ کر دیکھا۔ راہ داری کے آخری سرے پر میرے عقب میں دو تین آدمیوں کے سائے نظر آئے جو مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے باوجود میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔ بھاگتے بھاگتے میری ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں ان کی نظر مجھ پر نہ پڑ جائے۔ کیوں کہ قدموں کا فاصلہ لٹ رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا اور اس پر عمل کرنے کے لیے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔

فی الفور بچاؤ کی یہی ایک صورت تھی۔ پھر اس سے قبل کہ میرے تعاقب میں بھاگتے ہوئے افراد اس راہ داری میں داخل ہونے میں نہایت سرعت اور پھرتی سے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اس میں گھس گیا۔ لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ دروازہ بند کرنے کی آواز ان تک نہ پہنچے۔ کیوں کہ فضا پر ایسا سناٹا طاری تھا کہ پتا بھی کھڑکتا تو اس کی آواز صاف سنائی دے جاتی۔

کمرے میں گھستے ہی ایک ناگوار سی بو نتھنوں نے محسوس کی۔ ایسا لگا کہ قے ہو جائے گی۔ جی بری طرح متلایا تھا۔ میں نے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی۔ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے ہر قسم کی بو برداشت کرنی تھی۔ یہ میرے لیے پناہ گاہ تھی۔ اس کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میرے ہاتھ میں ٹارچ گرتے گرتے بچی۔ کمرے میں ایک گرانڈیل کتا موجود تھا جو ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے تمام جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ کتا غالباً میری بو سونگھ کر چوکنا ہو گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی ٹارچ گل کی اور بوکھلاہٹ کے عالم میں کمرے سے نکل آیا۔ اس کے مقابلے میں حویلی کے محافظ ہی بہتر تھے۔ وہ مجھے گرفتار کر لیتے لیکن اس خون خوار کتے کی طرح چیر پھاڑ کے تو کھا نہیں سکتے تھے۔

راہ داری میں آکر کمرے کا دروازہ بے آواز بند کیا۔ معاً مخالف سمت نگاہ پڑی تو دو مسلح محافظ تیز تیز قدموں سے ایک سمت جاتے دکھائی دیے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ ان کی پشت میری طرف تھی۔ جب وہ زینوں کی طرف مڑ کے نظروں سے اوجھل ہوتے تو میری جان میں جان آئی۔ اور پھر میں نے موقع غنیمت جانا اور تیز تیز قدموں سے عقبی دروازے کی جانب بڑھا۔

حویلی سے باہر آکر میں نے چور راستے کو پہلے کی طرح جھاڑیوں سے ڈھک دیا۔ بہتر یہی تھا کہ کسی کو میرے حویلی میں داخل ہونے کا پتا نہ چل سکے۔ محافظوں نے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنی تھیں اسے کسی اور بات پر محسوس کریں گے۔ اگر میں دیکھ لیا جاتا تو خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ فرلانگ بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد جب میں میدان کے وسط میں پہنچا تو ہوا کے خوش گوار جھونکوں نے نہ صرف میری تھکن اتار دی بلکہ میرے اندر فرحت اور تازگی بھر دی۔ میں نے انتہائی سکون اور اطمینان سے گہری گہری سانسیں لیں اور کچھ دیر سستانے کی غرض سے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ میں موت کے منہ سے بال بال بچ کر نکل آیا تھا ورنہ گاؤں والوں کو میری ہڈیوں کا نام و نشان بھی نہ ملتا۔

ابوبکر میرے انتظار میں نہ صرف ٹہل رہا تھا بلکہ میرے سلامتی کی دعائیں بھی مانگ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس کا چہرہ دمکنے لگا۔ وہ چمکتا ہوا میرے قریب آیا اور انتہائی والہانہ انداز سے مجھ سے چمٹ گیا۔

"اللہ کالاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے تمہیں سلامتی اور خیریت سے پہنچا دیا۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرشاری سے بولا۔

"ہاں دوست....!" میں نے کہا۔ "اس نے میری زندگی کی حفاظت کی۔ میں اس کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔"

میں نے جب اسے حویلی میں پیش آنے والا واقعہ سنایا تو اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ پھر اس نے کہا۔

"یہ بڑا پر خطر واقعہ ہے۔ تم نے اپنی قیمتی جان جوکھوں میں ڈال دی۔"

✲ ✲ ✲

اگلے روز رات دیر سے سونے پر میں صبح میں ہی گہری نیند میں غرق تھا کہ ابوبکر نے مجھے گہری نیند میں سے بری طرح جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ کم خوابی کے باعث میری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ تاہم میں نے بہ مشکل تمام اس کا متوحش اور خوف سے پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

میں بہت بری طرح گھبرا گیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟

"کیا ہوا میرے دوست! میری جان! تم اس قدر دہشت زدہ کیوں ہو رہے ہو؟" میں نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا "گھر میں کسی کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے حویلی سے ایک ملازم آیا تھا۔ اس نے تمہارے نام اپنی مالکن کا یہ پیغام دیا ہے کہ.... تم پہلی فرصت میں حویلی پہنچو۔ گل ناز بیگم تم سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔" ابوبکر نے رک رک کر جواب دیا۔

گل ناز کا یہ پیغام سن کر میں اچھل پڑا۔ کیوں کہ یہ غیر متوقع تھا۔

یکے بعد دیگرے میرے ذہن میں طرح طرح کے خدشات ابھر آئے تھے۔ پہلے تو یہ امر میرے لیے بے حد تشویش ناک تھا.... پھر اس تشویش پر حد درجہ حیرت غالب آگئی۔ اس لیے کہ گل ناز نے بذات خود مجھے اپنے ہاں طلب کیا تھا۔ یہ بات ناقابل فہم تھی؟ آخر کیوں اور کس لیے؟ مجھ جیسے ایک معمولی آدمی کی اس کے نزدیک کیا اہمیت ہو سکتی تھی۔ میری اپنی اوقات کیا تھی؟

ایک امکان اس بات کا بھی تھا کہ رات حویلی میں مجھے کسی نے دیکھ لیا ہو؟ مگر میں نے اس پہلو پر زیادہ غور نہیں کیا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو اس کے محافظ مجھے صحیح سلامت حویلی سے نکلنے نہیں دیتے اور اس وقت گل ناز کے سامنے لے جاتے۔

ابوبکر وحشت زدگی کے عالم میں غالباً" میرے کچھ بولنے کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ جب میں نے اس سے کچھ نہیں کہا تو وہ خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ضرور کوئی بات ہے جو اس نے تمہیں صبح صبح بلایا ہے۔ جب بھی اس نے اپنے ہاں بلایا تو اس کی شامت آئی ہے۔"

"تم پریشان مت ہو....." میں نے اسے دلاسا دیا۔ "کیا میں نے اس کی کوئی چیز چرائی ہے؟ وہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔"

پھر میرے اندر تشویش نے جنم لیا جو اندر ہی اندر بڑھنے لگی۔ ایک نامعلوم خطرے کا احساس میرے لہو میں گردش کرنے لگا تھا۔ گل ناز کے ہاں میری طلبی کیا معنی رکھتی تھی؟ یہ سوال کسی زہریلے ناگ کی طرح بار بار مجھے ڈس رہا تھا۔ خاصی دیر کے بعد میرا خوف اندر سے کم ہوا۔ اس وقت تک میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے جلد از جلد گل ناز سے مل لینا چاہیے۔ کم از کم میری الجھنیں تو دور ہو سکتی تھیں۔ گل ناز کی ذات میرے لیے کسی معمہ سے کم نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس

ملاقات کے بعد آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنے میں خاص مدد ملے گی۔ ایک طرح سے گل ناز مجھے طلب کر کے میری مشکل حل کر دی تھی۔ میں بھی اسے ایک نظر جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔

حویلی کی طرف جاتے ہوئے میرے سینے میں دل کے دھڑکنے کی رفتار ہر لحہ بڑھنے لگی۔ موسم خوش گوار تھا لیکن اس کے باوجود ماتھا عرق آلود ہو رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ گل ناز سے کسی خطرے کا احساس تھا بلکہ اس لیے کہ کچھ خوابیدہ سپنے میرے سینے میں انگڑائیاں لینے لگے تھے۔ رات ایک بھولی بسری میرے دل کے گوشوں میں کیف و سرور اور نشاط بن کر سرسرانے لگی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ کل کی بات ہو۔ اس کا نشہ ابھی تک باقی تھا۔ اس نشے نے مجھے ماضی کی سنہری یادیں تصور میں بیدار کر دی تھیں۔

اٹھارہ برس پہلے جب فوج میں ملازمت ملنے کے بعد وردی میں گاؤں آیا تھا تب کتنی ہی دوشیزاؤں کے سینے دھڑک اٹھے تھے اور ان کی آنکھوں میں ان جانے سپنے لہرانے لگے تھے میں اپنے گاؤں کا پہلا فرد تھا جسے فوج میں ملازمت ملی تھی۔ یوں بھی گاؤں کے نوجوان لڑکوں میں میں سب سے زیادہ وجیہہ، خوب صورت اور دراز قد تھا۔ فوجی وردی نے میری شخصیت کو مزید جاذب نظر بنا دیا اور متاثر کن کر دیا تھا۔

چندا اماں کی لڑکی بانو ایک ایسی مہکتی کلی تھی جسے اپنی قیامت خیز جوانی کا احساس تھا اور نہ ہی اس میں پندار حسن تھا۔ ایک کلی اپنی آب و تاب دکھا رہی تھی۔ میں اس کے حسن و شباب اور دل کشی کا اسیر ہو کر اس پر مرمٹا۔ اس کی اور میری محبت کا علم چندا اماں کو ہو گیا۔ وہ ایک جہاں دیدہ، دور اندیش اور حقیقت پسند عورت تھی۔ اس نے دنیا دیکھی ہوئی تھی اور اسے مردوں کی ذات اور ان کی محبت کا تجربہ تھا۔ اسے خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں اس کی بیٹی میری جھولی میں کسی پکے کی طرح نہ چھلک جائے۔ کیوں کہ گاؤں کی لڑکیاں میری دیوانی ہو رہی تھیں۔ ان میں بانو بھی تھی۔ اسے اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی میری محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس نے میرے آگے اپنی جھولی پھیلا دی اور کہا کہ میں اس کی بیٹی سے محبت کرتا ہوں تو اس سے شادی کر لوں۔ مجھے بانو سے چوری چھپے شادی کرنی پڑی۔ اس لیے کہ ان دنوں میری ماں سخت علیل تھی۔ مولوی جبار الدین نے پڑھایا تھا۔ اس وقت یہ طے پایا تھا کہ ماں کے صحت یاب ہوتے ہی اس کا راز میری ماں کے علم میں لایا جائے گا۔ لیکن اس کی نوبت نہ آسکی۔ ماں اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

میں نے اس حویلی کے ایک زیریں حصے کے ایک کمرے کو حجلہ عروسی بنایا تھا۔ ہر طرح کا اہتمام کیا۔ تقریباً ایک ماہ تک اس حویلی میں رہ کر بانو کے سارے رنگ چرا لیے تھے اور پھر میں بانو سے جلد آنے کا وعدہ کر کے ڈیوٹی پر گیا تو محبت اور جوانی کا خمار اتر گیا۔ پھر میں نے سب کو پتھر دل کی طرح فراموش کر کے ان سے بے نیاز اور بیگانہ ہو گیا۔

پھر میں نے کبھی بھی گاؤں جانا پسند نہیں کیا۔ میں رفتہ رفتہ بانو کو بھولتا گیا۔ میں اس لیے بھی گاؤں آنا نہیں چاہتا تھا کہ بانو میری راہ میں آکر کھڑی ہو جائے گی۔ اس کی ماں میرا گریبان پکڑ لے گی لیکن ابوبکر سے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ سترہ اٹھارہ برس پہلے ہی گاؤں سے چلی گئی۔ یہ جان کر مجھے بڑی طمانیت سی محسوس ہوئی۔ نہ جانے کیوں آج وہ بھولے بسرے دن اور رنگین لمحات ایک ایک کر کے یاد آرہے تھے۔

سورج کی روشنی میں..... میں نے حویلی کی پرشکوہ عمارت دیکھی۔ آنے کے بعد میں نے اب تک اس کا بیرونی حصہ نہیں دیکھا تھا۔ آج رنگ و روغن سے اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ اس کا حسن کسی دلہن کی طرح دوبالا ہو گیا تھا۔ صدر دروازے پر دراز قد کے دو مسلح نوجوان کھڑے پہرا دے رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر وہ تینوں کتے زنجیروں سے بندھے جن سے رات میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بھونکنے لگے۔ ایک محافظ نے انہیں چپ کرایا۔ اس کے چپ کراتے ہی بھونکنا اور غرانا بند کر دیا تھا۔

دوسرا محافظ میری شکل دیکھتے ہی تیز تیز قدموں سے میری آمد کی اطلاع دینے دوڑ گیا۔ میں حویلی کے اندرونی حصے کا جائزہ لینے لگا۔ میرے سینے میں عجیب سی دھک دھک ہو رہی تھی۔ ذہن طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ ایک طرف بانو کا رسیلا بدن' اس کے ہونٹوں اور فراز اور تناسب اور ہونٹوں کی پیاس اور اس کی خود پردگی اور والہانہ پن کا خیال تو دوسری طرف طرح طرح کے سوال ابھرنے لگے تھے۔ میری پیشانی سے پسینے کی لکیر ندی کی طرح بہتی ہوئی چہرے پر پھیلتی جا رہی تھی۔

وہ محافظ چند لمحوں کے بعد دوڑتا ہوا آیا اور اس کے ساتھ ایک دراز قد نوجوان بھی تھا۔ وہ مجھے لے کر اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔

اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی وہ کسی گونگے کی طرح خاموش رہا۔ میں نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ کیوں کہ اس کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ میں اس کے ساتھ ایک فوجی کے انداز سے ایستادہ چل رہا تھا۔ نپے تلے قدموں اور باوقار انداز سے... فضا میں میرے بوٹوں کی گونج تھی اور میرے اندر کا شور خاموش فضا میں جیسے ارتعاش پیدا کرنے لگا۔ حویلی کسی محل کی طرح آراستہ ہو چکی تھی۔ لمبی سی راہ داری طے کرنے کے بعد ایک زینہ آیا جو زیریں حصے کی طرف جاتا تھا۔ چند لمحے بعد میں اور وہ نوجوان اس کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئے جس سے میرے ماضی کی مہان یادیں وابستہ تھیں۔ اس نوجوان نے بڑے شائستہ انداز اور ایک مخصوص طریقے سے دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ چند لمحے بیت گئے۔ اس نے پھر سابقہ انداز سے دروازے پر دستک دی اور پھر ہینڈل کا لٹو پکڑ کے گھمایا تھا بڑی آہستگی سے اور بے آواز... دروازہ اس قدر کھل جانے کے بعد کہ ایک آدمی با آسانی گزر جائے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس نے اپنے سر خفیف سا خم دے کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کمرے کی آرائش و زیبائش کو میں سحرزدہ انداز سے دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں حیران ہو گئی تھیں۔ میری نظریں بھٹک کر ایک صوفے کے پاس ایستادہ 'تراشیدہ مجسمے پر جیسے جم کر رہ گئیں۔ اس کے دل کش سراپا میں جیسے چراغ جل رہے تھے۔ ایک حسین پیکر بڑے شان دار 'انداز' تمکنت اور پروقار انداز سے کھڑا تھا۔ یہ گل ناز تھی۔ میں اس کے بے مثال شخصیت سے مرعوب ہو کر گنگ سا ہو گیا۔ وہ شعلہ مجسم تھی۔ اس کا حسن اور گداز بدن کی رعنائیاں میرے دل کو بہانے لگیں۔ اس کے انگ انگ میں بجلیاں کوندر ہی تھیں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر حسین ہو گی۔ میرے ذہن میں ایک قبول صورت اور عام سی صورت کا تصور تھا۔ میں نے اس کی خوب صورتی کے بارے میں ابوبکر سے پوچھا نہیں تھا لیکن اس نے بتایا تھا کہ وہ حسین اور پرکشش ہے۔ مرد اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ مرد تو ہر نوجوان لڑکی عورت کی طرف دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں اور اس کے حصول کی آرزو بھی کرتے ہیں۔ یہ کوئی عام سی بات تھی۔ مجھے گل ناز کی خوب صورتی اور رنگ روپ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن وہ جس قدر حسین لگی تھی اتنی ہی اس کی سرد مہر آنکھوں میں ایک خطرناک سازش کی جھلک مجھے محسوس ہوئی۔

ہم دونوں کی آنکھیں آپس میں ملیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے دیکھ کر مجھ پر کئی ثانیوں تک خود فراموشی کی کیفیت کیوں طاری رہی۔

اس کی صاف شفاف شہابی پیشانی پر میں نے شکنیں دیکھیں۔ اس کی حسین بڑی گہری سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ پھر اچانک اس کے پھول سے رخساروں پر جو سرخی تھی وہ زردی میں تبدیل ہو گئی۔

اس نے مجھے مخاطب کیا تو اس کی آواز اس کی طرح خوب صورت اور مترنم تھی۔

"خوش آمدید کیپٹن سراج بیگ!" اس کے لہجے میں زہر و تمسخر تھا۔

"کیا آپ نے مجھے سویرے سویرے طلب کیا تھا ....؟" میں نے اس کا لہجہ نظر انداز کر کے خوش دلی سے پوچھا۔ "کیا آپ اس خاکسار سے واقف ہیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے معنی خیز مسکراہٹ اپنے رسیلے ہونٹوں پر نمایاں کرتے ہوئے جواب دیا۔ "بہت اچھی طرح میں آپ کو آنے سے نہیں بلکہ برسوں سے اس طرح جس طرح آپ اپنی ذات سے واقف ہیں۔"

اس کی اس بات نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مبالغہ سے کام نہیں لے رہی ہے۔ میں نے متعجب لہجے میں کہا۔

"میں اٹھارہ برسوں کی مدت کے بعد پرسوں رات یہاں آیا ہوں۔ میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ آج اب پہلی بار آپ کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ آخر آپ میرے بارے میں کس طرح واقفیت رکھتی ہیں ؟"

"حیرت ہے کہ آپ مجھے بالکل بھی نہیں جانتے ....؟" اس کے لہجے میں طنز کا زہر پوشیدہ تھا۔ "ایک مرد سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے؟" اس کے آخری الفاظ دو دھاری تلوار بن کر میرے سینے میں اتر گئے۔

"جب آپ مجھے نہیں جانتے تو پھر قتل کرنے کیوں آئے ہیں؟" اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ عود آئی۔ مجھ پر جیسے بم گرا۔ خوف کی ایک سرد لہر کسی زہریلے چاقو کی نوک کی طرح میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔ اس نے مجھے سکتے کی حالت میں بے حس و حرکت پا کر پوچھا۔

"کیا یہ سچ نہیں ہے؟ کوئی مبالغہ ہے جس کا آپ کو یقین نہیں آیا ہے؟"

میں اس کے سوال کا جواب کیا دیتا۔ اس کے علم میں سارے واقعات آ چکے تھے۔ میں زمین میں گڑنے لگا۔ مجھے اپنی موت سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا لب ولہجہ اور تخاطب کا انداز نہ صرف اک دم بدل گیا بلکہ چہرے کے تاثرات بھی تبدیل ہو گئے۔ کسی پیشہ ور قاتل کی طرح اس کے چہرے پر سفاکی اور آنکھوں سے درندگی جھانکنے لگی۔ پھر اس نے انا تلخی سے کہا۔

"میں تمہارا برسوں سے انتظار کر رہی تھی۔ ایک طویل اور تھکا دینے والا انتظار.... اس انتظار میں کس قدر کرب اور اذیت تھی تمہیں اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہو سکتا.... ایک جان گسل زندگی جو صراط جیسی تھی میں اس پر چلتی رہی.... میرا سینہ ان سے کٹتا اور جلتا رہا ہے.... میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کس عذاب میں مبتلا رہی ہوں؟ تم کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟ ریوالور نکالو اور میرے سینے میں اس کی ساری گولیاں ایک ایک کر کے اتار دو.... ایسا سنہرا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا؟" اس نے میرے وجود پر جیسے دہکتے انگارے رکھ دیے تھے۔ میرے حلق میں کانٹے پڑنے لگیں۔ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

"میں نے قتل کا منصوبہ ترک کر دیا ہے۔"

"وہ کس لیے....؟" اس نے حیران نظروں سے دیکھا اور اس کے چہرے پر استعجاب ابھر آیا۔

"اس لیے کہ مجھے مشتاق احمد خان نے آپ کے بارے میں جو کہانی سنائی اس میں ذرہ برابر بھی صداقت نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں نے اس کی بات کا یقین کر لیا تھا لیکن یہاں کر جو سنا اس کے برعکس پایا۔"

"لیکن کیا بد عہدی ایک سپاہی کی شایان شان ہے ؟" گل ناز نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"لیکن ایک انسان کی جان اس قدر ارزاں نہیں ہے کہ اسے بلاوجہ موت کی آغوش میں سلا دیا جائے ؟"

"لیکن اس نے اس جان کے عوض دو لاکھ کی بڑی رقم دی ہے۔ ایک آدمی کے قتل کے لیے کون اتنی بڑی رقم دیتا ہے؟" "یہ مت بھولو۔"

اگر وہ ایک کروڑ بھی دے تو میں انسان کو ہرگز موت کی نیند نہیں سلاؤں گا۔"

"کیا تمہارے نزدیک ایک آدمی اتنی وقعت رکھتا ہے؟" اس کے چہرے پر ابر سا آ گیا اور آنکھوں سے

ں جھانکنے لگا۔ میں نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے ر اثباتی انداز میں سر ہلا دیا۔

" تم جھوٹ بول رہے ہو؟" اس کا لہجہ اک دم تلخ گیا اور اس کی آنکھوں میں شعلے لپکنے لگے۔ "تم ے آپ کو موت کے منہ میں دیکھ کر جان بچانے کے ے فریب سے کام لے رہے ہو اور مجھے بے وقوف نے کی کوشش کر رہے ہو۔"

" آپ میری سچائی کا کس طرح یقین کریں گی؟" ں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

" کیا تم نے کبھی اپنی زندگی میں سچ بولا ہے؟" اس ے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

" ایک سپاہی کی زبان اس کے دل کا آئینہ ہوتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

" تم محض سپاہی۔۔۔ ایک مرد بھی ہو۔" اس نے ہرناک لہجے میں کہا۔ "تم عیاری، مکاری، خود غرضی ر فریب کا مجموعہ ہو۔"

" یہ صرف آپ کے اندازے ہیں۔" میں نے کہا و میرا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ "ہر مرد ایسا نہیں ہوتا ہے۔"

" لیکن تم انہی مردوں میں سے ایک ہو۔" اس کے خسار تمتمانے لگے۔ "کیا تم نے آج سے اٹھارہ برس لے ایک معصوم لڑکی کو فریب نہیں دیا؟" اسے لات کے بھنور میں نہیں چھوڑ دیا۔۔۔ بے سہارا اور بے یارومددگار۔۔۔؟ بولو جواب دو۔"

میں سناٹے میں آگیا۔ کیوں کہ یہ سارا راز تو ابوبکر کو ی معلوم نہیں تھا۔ صرف مولوی جبارالدین کے علم یں تھا۔ چندا اماں اس راز کو سینے میں لے کر مر گئی ھی۔ بانو جانے ابھی زندہ تھی یا چل بسی تھی؟ لیکن یہ ب اس کے علم میں کیسے آگیا؟ کیا چندا اماں۔۔۔ یا پھر نو نے اسے بتایا۔ میں بوکھلا گیا۔ بدحواس سا ہو گیا۔

" تم اپنی بانو کو بھول گئے۔۔۔؟" اس کی آواز گلے میں ندھ گئی "جسے تم نے ایک مہکتی کلی سمجھ کر اسے اپنی ردی پر سجایا تھا۔۔۔ اور جب اس میں خوشبو اور شادابی ہ رہی تو اسے نکال پھینکا۔

"بانو۔۔۔؟" میں اپنی پھٹی پھٹی نظروں سے گل ناز کی طرف دیکھا۔ میں سراسیمہ ہو گیا۔ گل ناز میں بانو کا چھپا ہوا عکس ابھر رہا تھا۔

"تم۔۔۔ تم۔۔۔ بانو ہو؟" میری آواز تھرتھرائی۔ میری پلکیں ساکت اور آنکھیں پتھرا سی گئیں۔

"ہاں۔۔۔ میں وہی بانو ہوں کیپٹن سراج بیگ۔۔۔!"

اس کے سرد سفاک لہجے میں نہ صرف تلخی بلکہ نفرت، طنز اور زہر بھرا ہوا تھا۔ "غریب اور بے سہارا چندا اماں کی بیٹی۔۔۔ تمہاری بیوی۔۔۔ شریک حیات جس سے تم نے ساری زندگی ازدواجی اور محبت بھرا بندھن نبھانے اور آخری سانس تک شریک سفر رہنے کا عہد کیا تھا۔ تم نے میری مفلسی سے فائدہ اٹھایا اور ایک مقدس بندھن باندھ کر کھلونے کی طرح کھیل اور فریب دے کر چلے گئے۔ تمہاری نشانی میری کوکھ میں پرورش پانے لگی تو اس وقت بھی مولوی جبارالدین کی زبان کھل نہ سکی۔ میری ماں نے ذلت اور رسوائی کے خوف اور صدمے سے خودکشی کرلی۔۔۔ کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ یہ کس کا بچہ ہے۔۔۔ مجھے بدچلن، فاحشہ اور پاپی سمجھ کر ذلیل کیا گیا اور گاؤں چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ میری بے بسی، محتاجی اور منت سماجت اور آہ و زاری پر کسی نے ترس نہیں کھایا۔۔۔ وہ سب حاکم اور فرعون بن بیٹھے۔۔۔ میں ایک بے سہارا لڑکی کہاں جاتی؟ مجھے کون پناہ دیتا؟ صرف میری موت ہی میری مشکلات کا حل ہوتی۔۔۔ میں ایک رات ایک کشتی چرا کر اسے ایک نامعلوم منزل کی طرف لے چلی۔۔۔ میں رات بھر سوچتی رہی کہ اتنی بڑی دنیا میں کہاں جاؤں؟ چاروں طرف مجھے تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی تھی۔ جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو اس دنیا سے اس قدر نفرت ہو گئی کہ میں نے ایسے جینے سے مرجانا ہی بہتر سمجھا۔ کیوں کہ میں یہ جانتی تھی کہ میں نوجوان، انتہائی حسین اور پرکشش ہوں اور اس دنیا میں بھیڑیے اور درندہ صفت لوگ ہیں۔ وہ مجھے سہارا دینے کے بجائے مجھ سے کھلونے کی طرح کھیل کر جی بھرنے کے بعد کسی ویرانے میں پھینک دیں گے۔۔۔ قدرت کو میری موت کا نذرانہ پسند نہیں آیا۔ حالات نے مجھے مشتاق

احمد خان جیسے دکھی آدمی کے پاس پہنچا دیا۔ وہ شخص اپنی نوجوان اور اکلوتی بیٹی کی اچانک موت سے دنیا سے اچاٹ ہو کر جی رہا تھا۔ اس نے مجھے پا کر اپنی بیٹی بنا لیا۔ کیوں کہ میں نہ صرف اس کی مرحومہ بیٹی کی ہم عمر تھی بلکہ حیرت انگیز طور پر ایسی مشابہت رکھتی تھی کہ جیسے جڑواں ہوں۔ اس نے باپ بن کر مجھے وہ سب کچھ دے دیا جو ایک سگا باپ اپنی بیٹی کو دے سکتا ہے۔"

اس نے سانس لینے کے لیے لمحہ بھر توقف کیا۔ اس کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھا رہا تھا۔ پھر جب اس نے اپنا سلسلہ کلام جوڑا تو اس کا لہجہ اس قدر شدید اور نفرت انگیز تھا کہ میں جھرجھری لیے بغیر نہیں رہ سکا۔

میں نے تمہارے انتقام کے اندھے جنون میں ایک منصوبہ بنایا۔۔۔ اس منصوبے کے تحت برسوں بعد میں نے یہ حویلی خرید لی اور تمہاری سبک دوشی کا ایک ایک دن گننے لگی۔ میں تم سے اور ان لوگوں سے انتقام لینے کے لیے دیوانگی کی حد تک بڑھ گئی۔ جن لوگوں نے مجھے ذلیل و رسوا کیا ان برسوں میں خوش حالی، آسودگی اور بے فکری نے میرا روپ ایسا بدلا کہ گاؤں والوں میں سے کوئی بھی پہچان نہ سکا۔۔۔ تم بھی تو مجھے پہچان نہ سکے۔ حالاں کہ میری بھری جوانی میں تم مجھ سے زیادہ قریب اور میرے جسم و جاں کے مالک رہے تھے۔ میں نے گاؤں پہنچ کر غیر محسوس طریقے سے ان سب سے انتقام لے لیا۔۔۔ صرف ایک تمہارا انتظار رہ گیا تھا۔۔۔ تمہاری سبک دوشی کے بعد قدم قدم پر تمہیں پھانسنے کے لیے جال بچھانے لگی جس میں تم بڑی خوب صورتی سے پھنستے چلے گئے۔ لانچ میں جب تم سفر کر رہے تھے جب میں نے اپنے انتقام کا آغاز کر دیا۔ میں تمہیں ایک ہی وار میں موت کی نیند سلا دینا نہیں چاہتی تھی۔۔۔ میں بھی تمہیں ویسی ہی اذیت سے تڑپا تڑپا ختم کر دینا چاہتی ہوں جیسی اذیت میں نے پورے اٹھارہ برس سہی ہے۔"

میرے دل میں بانو کے لیے محبت کی لہر اٹھی۔ ایک پل میں حویلی میں گزری سہاگ راتیں۔۔۔ اس کا پرشباب بدن اور چاندنی۔۔۔ انگ انگ سے ابلتی ۔۔۔ میرے ہونٹوں نے اس کے چہرے، ہونٹوں اور خطوط اور عضو عضو کی ساری مٹھاس جو جذبہ تھی۔ اور پھر بانو کی خود سپردگی، دیوانگی اور والہانہ پن رات مجھ پر نچھاور کرتی تھی۔ وہ اس قدر فیاضی پیش آتی تھی کہ مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ میرا سینہ جذبے سے گھر گیا اور میری زبان سے رندھی ہوئی میں اس کا نام بے اختیار نکل گیا۔

"بانو۔۔۔؟ میری جان بانو۔۔۔ بانو!"

اس کے رس بھرے لبوں پر تمسخرانہ مسکراہ پھیل گئی۔ اس نے قدرے خشونت بھرے لہجے کہا۔

"بانو مرگئی ہے کیپٹن سراج۔۔۔! میں گل ناز بیگم ہوں جو تمہارے سامنے موجود ہوں۔ میں گل ناز بن کر تم سے بانو کا انتقام لوں گی۔۔۔ ایک عورت کا ان کتنا بھیانک ہوتا ہے تمہیں جلد ہی معلوم ہو جا گا۔"

"بانو! میری بات تو سنو۔" میں نے ہچکچا کر کہ

"میں تمہاری زبان سے صفائی کا ایک لفظ بھی نہیں چاہتی ہوں۔" اس نے رعونت بھرے لہجے کہا۔ "میں قدم قدم پر موت بن کر تمہارا تعاق کروں گی۔۔۔ اگر تم اپنے آپ کو میرے ہاتھوں مرنے سے بچا سکتے ہو تو بچا لو۔"

"میں موت سے نہیں ڈرتا ہوں بانو۔۔۔!" میں ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں آج اپنے کیے پر ہوں۔"

"میرے سینے میں اب دل نہیں پتھر ہے۔" نے کہا۔ "میں تمہاری ندامت پر تمہیں معاف ن کروں گی۔"

میں نے اس کی طرف بڑے جذباتی انداز سے قدمی کی اور محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ خیال تھا کہ اسے بازوؤں کے حصار میں لے کر اس چہرے پر جھک جاؤں گا تو اس کے دل میں جتنی نفر کثافت اور انتقام کا جذبہ جنون جو ہے میرے بو

مل جائے گا۔ یہ وہی کمرا تھا جو ماضی میں حجلہ عروسی تھا۔۔۔ وہ عورت ہے۔۔۔ میری شریک حیات تھی۔۔۔ اس کمرے کے ایک کونے میں مسہری تھی۔۔۔ بارہ برسوں سے میرے قرب کے لیے بے چین تھی اور ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ میرے وصول اور قرب کے لیے اس نے جال بچھایا تھا۔ میں اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ عورت پہلے مرد سے پہلی محبت جو کرتی ہے اسے کبھی نہیں بھولتی ہے۔ محبت عورت کرنا جانتی ہے۔ آج میں اس کے دل کے کسی کونے میں میری محبت کا جذبہ دیوانگی کی حد تک موجود ہے۔ ورنہ وہ مجھ سے تنہائی میں نہیں ملتی۔ اگر اسے واقعی مجھ سے نفرت ہوتی اور انتقام کا اندھا جنون ہوتا وہ کب کی اپنی حسرت پوری کر لیتی اور آج اس دنیا میں میرا وجود نہ ہوتا۔

ماضی کی بانو اور آج کی گل ناز۔۔۔ میں وہی حسن، شباب اور گداز پن تھا۔ ماضی میں بانو میں کسی کچی کیری کی طرح نوخیزی اور ترشی تھی۔ بڑی سرکشی جوانی تھی اور وہ پیاسی تھی۔ اس کا انگ انگ دعوت دیتا تھا کہ مجھے اپنا لو، فتح کر لو اور کسی آندھی کی طرح تاخت و تاراج کر دے۔۔۔ میں اس کے نشیب و فراز کیسے بھول سکتا تھا۔ لیکن آج اس میں ایسا رسیلا پن آگیا تھا کہ میرے جذبات میں ہیجان پیدا ہونے لگا۔ میں طوفان بن کر اس پر ٹوٹنے والا تھا کہ اس نے میرے ارادوں کو بھانپ لیا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اس کے بدن پر ایک دھجی تک نہ رہنے دوں۔ پھر وہ مجھ پر جوانی کے ایام کی طرح ماضی سے مہربان ہو جائے گی۔ اس نے تڑپ کر مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور ہذیانی لہجے میں چیخ کر بولی اس کے لہجے میں شدید کرب تھا۔

"میرے قریب نہ آنا۔۔۔ میں بانو نہیں ہوں۔۔۔ میں گل ناز ہوں۔ میں گل ناز ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

"تم کچھ بھی کہہ لو میری جان! میری بانو! تم میری ہی ہو۔۔۔ میں تمہیں آغوش میں لے سکتا ہوں۔ میں سکتا ہوں۔" اس کے حسین چہرے پر گھٹا سی چھانے لگی اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک کوند گئی۔

اس کے سراپا میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ اس نے خوف سے وہ زنجیر کھینچی جو دیوار سے لگی تھی کہ کہیں وہ جذباتی ہو کر اسے موم کی طرح پگھلا نہ دوں۔ محبت کے وہ لمحات دہرا دوں جو میں بھول گیا تھا۔ وہ ماضی کی طرف دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے جذبات کو قابو میں رکھنا ناممکن ہو جاتا۔

چند ثانیوں کے بعد دروازہ کھلا۔ وہی نوجوان جو مجھے اس کمرے تک لایا تھا مودبانہ انداز سے کمرے میں داخل ہوا۔

گل ناز نے تحکمانہ انداز سے اس نوجوان سے کہا۔ کیپٹن سراج کو باعزت طور پر رخصت کیا جائے؟"

میں نے اس سے بہت کچھ کہنا اور پوچھنا چاہا لیکن اس نے مجھے کوئی بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔ پھر وہ بڑی تیزی ملحقہ کمرے میں بڑی شان اور تمکنت سے اور باوقار انداز سے چلی گئی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

میں حویلی سے نکل کر گاؤں کی طرف جاتے ہوئے اپنے آپ میں کہاں تھا۔ میں ایک لمحے میں سب کچھ پا کر کھو بھی آیا تھا۔ میں سوچ بھی تو نہیں سکتا تھا کہ بانو میری زندگی میں اس ڈرامائی انداز سے سامنے آئے گی ۔۔۔ وہ آسمان کا ایک ایسا چاند بن جائے گی کہ میں اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی چھو بھی نہ سکوں گا۔ کتنی بدنصیبی کی بات تھی۔ کتنا بڑا المیہ تھا کہ وہ میری تھی لیکن میری ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے دل میں محبت کی جگہ نفرت کا زہر بھرا ہوا تھا جس کا تریاق میرے پاس نہیں تھا۔ اگر وہ اس نوجوان کو نہیں بلاتی تو میں اسے گود میں اٹھا کر بستر پر لے جاتا۔ دیوانگی میں جذبات کی رو میں بہہ کر اسے سرفراز کر دیتا۔

اس میں دوش کس کا تھا؟ اس میں سراسر قصور میرا ہی تھا۔ میں نے اس کے ساتھ جبر، زیادتی کی تھی۔ اسے فریب دیا تھا اپنی پیاس بجھانے کے لیے۔۔۔ کھلونا بنایا تھا۔۔۔ شادی کی صرف وقت گزاری کے لیے۔۔۔ ہوا یہ تھا کہ شادی سے قبل میں نے اسے تالاب پر بڑی آزادی اور اطمینان سے نہاتے دیکھا۔ اس کے جسم کے تناسب نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ چوں کہ میں جوان تھا

اور عورت کے جسم کی طلب نے مجھے اس کا پاگل کر دیا تھا۔ آج وہ میرے فریب اور جبر و زیادتی کا بھیانک انتقام لینے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے دل کے کسی کونے میں محبت کی رمق تک نہیں رہی تھی ورنہ گلے شکوے تک نہ کرتی اور موم ہو جاتی۔

اس نے کتنا بڑا جال بچھایا تھا.... کیا ایک عورت انتقام کے جنون میں اندھی ہو کر اتنی دور جا سکتی ہے.... نفرت اور انتقام کے طوفان نے محبت کو تہس نہس کر دیا تھا.... ایک عورت جب نفرت اور انتقام لینے پر آتی ہے تو یک سر کیوں بدل جاتی ہے۔ میں نے اپنے دل سے کتنی بار یہ سوال کیا تھا۔ لیکن میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لوگ کہتے آئے ہیں کہ عورت کو آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا ہے۔

ابوبکر کھیتوں میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں حویلی والے راستے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ میرے لیے سخت مضطرب، بے چین اور پریشان تھا کہ جانے مجھے کیوں بلایا گیا ہے۔ رات میں جو حویلی میں گیا تھا شاید گل ناز کو خبر ہو گئی۔ اس لیے اس نے باز پرس کرنے اور میری خبر لینے کے لیے بلایا ہے اسے یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ رات حویلی کے اندر داخل ہونے کے جرم میں اندر نہ کرا دے۔

اس نے مجھے دور سے آتا دیکھ لیا تو اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ میری طرف تیزی سے لپکتا ہوا آیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں بہت سارے سوالات کر ڈالے۔ لیکن اب وہ سوال فضول اور بیکار تھے اور میں نے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے گھر کی طرف چلتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کر لی ہوئی تھی۔ کیوں کہ میرے دماغ میں انتشار اور طوفان سا پا تھا۔ میرا وجود ریزہ ریزہ تھا۔ میں اندر سے بری طرح ٹوٹا پھوٹا ہوا تھا۔ میں نے ابوبکر کے پر تجسس سوالوں کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ گھر چل کر تمہیں ایک نئی اور عجیب کہانی سناؤں گا۔ ایک ایسی سنسنی خیز اور تعجب خیز کہانی جو تم نے کبھی نہیں سنی ہو گی۔ الف لیلیٰ ہزار داستان سے کہیں انوکھی۔

پھر گھر پہنچ کر میں نے اس کی بیوی آمنہ کی موجودگی میں ساری کہانی سنا دی۔ دونوں ششدر رہ گئے۔

میاں بیوی پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ابوبکر سکتے کی کیفیت سے نکل کر مجھے مشورہ دینے لگا۔

"تم جس قدر جلد ہو سکے گاؤں سے نکل کر کسی شہر میں روپوش ہو جاؤ۔ تم اس کے انتقام سے بچ نہ سکو گے۔ جبھی تو میں یہ سوچتا تھا کہ یہ کون عورت ہے جو گاؤں والوں کے ایک ایک شخص کے متعلق الف سے ے تک واقف ہے اور اس نے چند مخصوص گھر والوں کی جائیدادیں اور زمینیں خرید کر انہیں تباہ و برباد اور کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا۔"

آمنہ جو اس کی بات بڑے غور، خاموشی اور پوری توجہ سے سن رہی تھی اس کی بات ختم ہوتے ہی بول اٹھی۔

"ایک عورت اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتی.... اس محبت کی کشش نے یہ سارا کھیل رچایا ہے۔ بھیا کو یہ گاؤں چھوڑ کر جانا نہیں چاہیے۔ میرا دل کہتا ہے کہ گل ناز ایک دن بانو بن جائے گی کیوں کہ اس کی نفرت اصل اور سچی محبت ہے۔"

"تم احمق ہو...." ابوبکر کو طیش آ گیا اور بری طرح جھنجلا گیا۔ "کیا تم میرے عزیز جان دوست کو اس عورت کے انتقام کی نذر کر دینا چاہتی ہو؟" آمنہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے تنک کر جواب دیا۔

"کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ گل ناز کو بھیا سے انتقام لینا ہوتا تو وہ ڈھاکا ہی میں موت کا شکار ہو جاتے۔"

میں اس دیہاتی عورت کی ذہانت پر اش اش کر رہا تھا کہ اس نے کیا پتے کی بات کہی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس سے پہلے ابوبکر بیوی سے کچھ کہتا میں نے اس سے پوچھا۔

"دوست! اگر میں یہاں کچھ عرصہ قیام کروں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہو گا؟"

ابوبکر نے میرا ہاتھ پکڑ کے بڑی اپنائیت سے اپنے

رکھ لیا اور محبت بھرے لہجے میں بولا۔
"دوست.... ! تم غیریت کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے تمہاری جان بچانے کی غرض سے مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔ اگر اس کی تہ میں کوئی اور جذبہ کار فرما نہ تھا.... خدانا خواستہ کوئی وقت آیا تو تم دیکھ لوگے کہ تم پر جان نثار کرنے والا پہلا شخص میں ہوں گا۔"
میں فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اس سے لپٹ گیا۔ میرا دل بھی آنکھیں بھی بھر آئیں۔
اس رات بانو کے تصور نے میری نیند اڑا دی تھی اور میں بانو کے فراق میں جلنے لگا تھا۔ میرے چاروں طرف ایک آگ سی بھڑک رہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بانو کو پانے کی خواہش اس شدت سے کیوں مچل رہی ہے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس کی محبت اور گداز کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اس سے جی بھر کسی کھلونے کی طرح کھیلتا اور راتیں رنگین اور نشاط انگیز بناتا رہا.... آج کیا اسے بہت حسین دیکھ کر میرے جذبات میں ہل چل سی مچ گئی۔ وہ نوجوانی کے آغاز میں اتنی پرشباب گداز اور بھڑکتے تناسب کی پیکر نہ تھی۔ آج تو اس کے انگ انگ میں کسی بھرپور نوجوان دوشیزہ کی سی مستی ابل رہی تھی۔ اگر میں اس ملاقات میں اسے دبوچ کر قابو میں کر لیتا اور اسے بے لباس کر دیتا تو وہ اپنے آپ کو بڑی خود سپردگی اور جذباتیت سے سونپ دیتی۔ باہم پیوست ہونے کے بعد اس کے جذبات آگ بڑھکتی رہتی۔ چوں کہ بھڑکیلے لباس میں اس کا بھڑکیلا بدن دیکھ کر دل قابو میں نہیں رہا تھا شاید.... "پھر میں کسی ان جانے تصور میں ڈوبا اور گہری نیند میں سو گیا۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں اس کمرے میں ہوں اور بانو میری آغوش میں ہے۔ ہم دونوں ڈھول بھرے راستے سے گزر رہے ہیں۔ یہ میرے پراگندہ خیالات تھے جو ساری رات میں اسے باہم پیوست دیکھتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں نے بڑی دیر تک سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ بانو سے تنہائی میں ایک اور ملاقات کر لینی چاہیے۔ شاید میں اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر اس کے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ سوئی ہوئی محبت پھر سے جاگ اٹھے۔ محبت جو کبھی نہیں مرتی ہے۔ امر ہوتی ہے۔
میرے اندر ایک ایسی بے چینی بڑھنے لگی تھی جس پر قابو پانا میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ اب مجھے اپنی زندگی کی سنسان راتوں میں ایک رات کی قربت اور محبت کی احساس محرومی بڑھنے لگی تھی۔ میں اتنی بڑی دنیا میں اب عورت کے بغیر رہنا نہیں چاہتا تھا۔ یوں تو اٹھارہ برس کا ایک طویل عرصہ میں نے تجرد کی زندگی میں گزار دیا تھا.... لیکن نیلم چوہدری اور ذکیہ خانم کے پرشباب گداز بدن ' ان کی خود سپردگی اور جسموں کی رعنائیوں ایک ایسا نشہ طاری کر دیا جو روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ لانچ میں اس لڑکی نے میری قربت ' اس کے ہاتھوں اور ہونٹوں میں ایسا لمس اور مٹھاس بھر دی تھی کہ عورت کی قربت کا سپنا دیکھنے لگا تھا۔ اور پھر بانو میری بیوی تھی۔ قانونی اور شرعی رشتہ بھی تھا.... اس کے علاوہ دل کا بھی رشتہ۔
ایک اور بات یہ بھی تھی کہ بانو سے شادی کر کے اسے فراموش کرنے کے باوجود میں نے تجرد کی زندگی گزاری۔ جانے کیوں کبھی بھولے سے بھی کبھی کسی اور عورت سے شادی کا دل نہیں چاہا اور رفاقت محسوس کی.... بنگلہ دیش میں غربت و افلاس کے باعث عورت بہت ارزاں تھی اور ہم جنس پرستی کی وبا بھی تھی۔ میرے ساتھی فائدہ اٹھاتے رہتے تھے۔ میں نے مشن پورا کرنے کے بعد شادی کا سوچا تک نہیں تھا۔ لیکن بانو کو دیکھنے اور ملنے کے بعد خوابیدہ سپنے جاگ اٹھے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ اب اس کے بغیر زندگی نہیں گزار سکوں گا۔
میں دوسرے دن ابوبکر کے بہت منع کرنے کے باوجود حویلی پہنچ گیا۔
میرا خیال تھا کہ چوں کہ عورت اپنی پہلی محبت نہیں بھولتی اور یہ محبت اس کا سرمایہ حیات ہوتی ہے۔ جب وہ مجھے دوبارہ اپنے سامنے پائے گی تو اس کی سوئی

محبت جاگ اٹھے گی۔ آخر وہ عورت ہے۔ عورت محبت کے لیے بھکارن بن جاتی ہے۔ اپنی جھولی پھیلا دیتی ہے۔۔۔ کیوں کہ وہ محبت کے لیے جیتی اور عورت ہی محبت کرنا جانتی ہے۔ وہ محبت کی خاطر ایثار و قربانی بھی دیتی ہے۔ محبت میں ایسی سرشار بھی ہو جاتی ہے کہ جذبات کی رو میں بہہ کر خود کو مہربان کر کے فیاضی سے اپنا سب کچھ سونپ دیتی ہے۔ اس کے نزدیک محبت میں ہر چیز جائز ہو جاتی ہے۔ جس طرح جنگ میں۔

لیکن میری یہ سوچ خوش فہمی تھی۔ میرا فلسفہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ کتنے ہی گھنٹوں کے کرب ناک انتظار کے بعد ایک معقول عذر سے مجھے مایوس اور نامراد لوٹا دیا گیا جس کی توقع نہیں تھی۔ وہ واقعی پتھر دل ہو گئی تھی۔

میں حویلی سے باہر آ کر چند قدم چل کر نہ جانے کس امید اور آس سے رکا اور پھر حسرت بھری نظروں سے حویلی کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے خواب گاہ کی ایک کھڑکی کے پاس ایک سائے کو دیکھا جو پردے کی اوٹ میں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بانو ہے۔ جس کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پردے کی اوٹ میں ہونے کے باوجود اس کا عکس دکھائی دیتا تھا۔ یہ بات صاف عیاں تھی کہ اس نے اپنے اوپر گل ناز کا خول چڑھایا ہوا ہے۔ آخر وہ کب تک اس خول میں بند رہے گی؟ آخر ایک نہ ایک دن یہ خول ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ پھر اس میں سے وہ بانو نکل آئے گی جو ماضی میں بڑی مہربان اور فیاض تھی۔

مجھے اس کے اس طرح چھپ کر دیکھنے سے یہ اندازہ ہوا کہ اس کے دل میں میرے خلاف جو نفرت ہے اس کی شدت میں کمی آ گئی ہے۔

حسن پور کے جنوبی حصے میں میرے بچپن کے دوست عبدالسلام کا گھر تھا۔ اس نے مجھے اور ابوبکر کے گھرانے کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ جب ہم اس کے ہاں سے فراغت پا کر نکلے تو سہ پہر ہو رہی تھی۔ میں اور ابوبکر آپس میں ماضی کی حسین یادوں کے بارے میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ ہم دونوں کے پیچھے پیچھے ابوبکر کی بیٹی سونی اور بیٹا شاہد اپنی ماں کے ساتھ خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ ہم لوگوں کے درمیان پچیس تیس قدموں کا فاصلہ تھا۔ موسم بھی خوش گوار اور فرحت بخش ہوتا جا رہا تھا۔

ہم لوگ پگڈنڈی سے اتر کے اس راستے پر آ گئے جس سے میں پہلی بار گزر چکا تھا جہاں ایک خوں خوار کتے سے واسطہ پڑتے پڑتے رہ گیا تھا۔ دونوں اطراف جھاڑیاں تھیں اور ہم بیچ راستے سے گزر رہے تھے۔ چاروں طرف گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔

ابوبکر نے میری کسی بات پر ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ اچانک مخالف سمت سے ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئی۔ ہم دونوں ایک دم اچھل پڑے اور بدحواس ہو کر ایک دوسرے کی طرف حیرت اور وحشت سے دیکھا اور ابھی اس اچانک اور غیر متوقع حملے سے سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ مزید دو تین گولیاں سنسناتی ہوئیں ہم دونوں کے سروں پر سے گزر گئیں۔ ابوبکر دہشت زدہ ہو کر تھر تھر کانپنے لگا۔ وحشت اور خوف سے اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ کیوں کہ فرشتہ اجل سروں پر منڈلا رہا تھا۔

ابوبکر کی بیوی آمنہ اور اس کے دونوں بچے گھبرا کے ماں سے لپٹ کر رونے لگے۔ آمنہ انتہائی گھبراہٹ اور خوف کی کیفیت میں بچوں کو اپنے وجود سے الگ کرنے لگی۔ اس کا چہرہ نہ صرف پیلا پڑ گیا بلکہ اس پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

میں ابوبکر کا لرزاں ہاتھ پکڑ کے بجلی کی سی تیزی سے آمنہ اور اس کے بچوں کی طرف لپکا۔ میں نے آمنہ کے قریب پہنچ کر ابوبکر کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر سونی اور شاہد کے ہاتھ پکڑ کر ہذیانی انداز میں چیخا۔

"جھاڑیوں کی طرف بھاگو۔۔۔ دوڑو۔۔۔ یہاں خطرہ ہے۔"

ان سب نے میری تقلید کی۔ ہم لوگ لمبی لمبی جھاڑیوں میں چھپ کر وہاں جو گھاس تھی اس پر لیٹ گئے۔

میں اس ناگہانی حملے سے حواس باختہ ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے فوراً ہی اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا۔ پھر میں نے ابوبکر کی طرف دیکھا۔ وہ بے جان ہو رہا تھا منہ چہرہ متغیر سا ہو گیا تھا۔ نہ صرف وہ بلکہ آمنہ اور بچے بھی لرزہ براندام تھے۔ مجھے ان پر ترس آرہا تھا۔ اس وقت صورت حال میدان جنگ کی سی تھی۔ دشمن نے جیسے شب خون مارا ہو۔

چند ثانیوں کے بعد گولیوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ مخالف سمت سے اندھا دھند فائر ہونے لگے۔ ہم چوں کہ گھنی اور لمبی جھاڑیوں کے عقب میں چھپے ہوئے تھے اس لیے انہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ ہم کس جگہ پر موجود ہیں۔ گولیاں سروں سے باہر یا پھر کئی فٹ فاصلے سے گزر رہی تھیں۔ اگر ان کے نشانے صحیح ہوتے تو اب تک ہم سب بھونے جا چکے ہوتے۔

مجھے اس وقت شدت سے غصہ آرہا تھا لیکن یہ وقت غصے کا نہیں تھا۔ مجھے ہر صورت میں ابوبکر، اس کی بیوی اور بچوں کی حفاظت کرنی تھی۔ خطرے کے پیش نظر میں اپنا ریوالور اور بہت ساری گولیاں لے کر چلنے لگا تھا۔ اس وقت بھی میری جیب میں بھرا ریوالور اور گولیاں موجود تھے۔ پھر میں نے سرعت سے ریوالور نکال لیا۔ جب کہ یہ ریوالور، مجھے بے جان سا کھلونا دکھائی دیا۔ کیوں کہ میرے مقابل جو دشمن تھا وہ کئی نفوس اور بندوقوں سے مسلح تھے اور ان کی بندوقیں شعلے اگل رہی تھیں۔

گو کہ میرا ریوالور ان کے اسلحہ کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ مجھے کچھ کرنا تھا تاکہ فائرنگ کا سلسلہ رک جائے۔ ان کی فائرنگ سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک ایک کو بھون کر رکھ دیں گے۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ ہم نہتے ہیں۔ نہ تو ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی مقابلہ کریں گے۔

میں ایک فوجی تھا کوئی کمانڈر تو نہیں تھا۔ لیکن ایک فوجی کو ہر قسم کے حالات سے لڑنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ پھر میرے ذہن اچانک ایک تدبیر آئی تو میں کہنیوں کے بل رینگتا ہوا ایک سمت تیزی سے بڑھا۔

ابوبکر نے دہشت زدہ ہو کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

"یہ تم کیا کرنے جا رہے ہو.... ادھر مت جاؤ.... یہ محفوظ جگہ ہے اور پھر گولیاں ادھر نہیں آرہی ہیں۔"

"میں مرتے مرتے دشمن کے دو ایک بندوں کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "انہیں ان کی موت بلا رہی ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔ اپنی بیوی بچوں کو سنبھالو۔ اگر میں نے انہیں نہیں روکا تو وہ ہم سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"وہ بہت سارے ہیں....." ابوبکر نے کہا۔ "تم اکیلے ان سے کیسے مقابلہ کر سکو گے؟ تمہارے پاس تو صرف ایک ریوالور ہے۔" "وہ تعداد میں سو دو سو ہوئے بھی تو کیا ہوا؟" میں نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں ان پر بھاری رہوں گا۔"

آمنہ کی تھرتھراتی ہوئی آواز میرے کانوں میں گرم گرم سیسہ بن کر پگھلنے لگی۔ اس نے ابوبکر کو مخاطب کر کے کہا۔

"بھیا سے کہو کہ خدا کے لیے ہم پر رحم کھائیں.... وہ یہاں سے نکل کر کہیں اور پناہ لے لیں۔ ان کی وجہ سے ہم سب کی جانیں خطرے میں ہیں....."

"آمنہ....!" ابوبکر نے اسے حقارت بھرے لہجے میں غصے سے بری طرح ڈانٹا۔ "تمہیں یہ بات کہتے ہوئے شرم نہیں آئی.... دیکھ نہیں رہی ہو اس کی جان بھی سخت خطرے میں ہے.... وہ ہمیں بچانے کے لیے کوشش کر رہا ہے اور اپنی جان پر کھیلنے جا رہا ہے۔"

"مگر تم یہ کیوں....؟" آمنہ نے ابوبکر کے تیور دیکھ کر اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"ابو....!" میں نے اس کا شانہ تھپ تھپایا۔ "بھابی ٹھیک کہتی ہیں۔ تم جذباتی باتیں نہ کرو۔ تم سب کو لے کر ندی کی طرف نکل جاؤ اور کنارے کنارے چل کر گاؤں پہنچ جانا۔ اگر ان لوگوں نے تمہیں دیکھ بھی لیا تو کچھ نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ میں دشمن کا عتاب زدہ

ہوں۔"

"نہیں دوست ...!" ابوبکر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں اس مصیبت میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"ابو... ! جذباتی باتیں نہ کرو... میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم' بھابھی اور بچے جو معصوم ہیں نشانہ بن جائیں۔"

ابوبکر نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے بیوی کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

"دیکھو... فائرنگ بند ہو چکی ہے۔ موقع اچھا ہے۔ تم بچوں کو لے کر جلدی سے ندی کی طرف نکل جاؤ۔"

"ہاں بھابھی!" میں نے کہا۔ "آپ ابوبکر کی بالکل بھی فکر نہ کریں۔ میں اس پر آنچ آنے نہیں دوں گا۔ ان شاء اللہ ہم اندھیرا ہوتے ہی اس سے فائدہ اٹھا کر گھر پہنچ جائیں گے... میں ان ظالموں کو سبق دینا چاہتا ہوں۔"

آمنہ نے پل بھر کی تاخیر بھی نہیں کی' اس نے صرف ایک پل کے لیے اپنے شوہر کو تشویش بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر اس نے جھپٹ کر اپنے دونوں بچوں کے ہاتھ پکڑے اور اپنا مرتعش وجود گھسیٹتی ہوئی اور بچوں کو کھینچتی ہوئی جھاڑیوں سے نکل کر سرعت سے ندی کی طرف نکل گئی۔

میں اور ابوبکر انہیں اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ یہ خوف دامن گیر کہیں وہ ان پر فائرنگ نہ کر دیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے کہ میں ان کا شکار اور نشانہ تھا اور میری موت کے پیاسے تھے۔

ان کے بحفاظت نکل جانے پر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ابوبکر سے کہا۔

"کتنا اچھا ہوتا تم بھی بھابھی بچوں کے ساتھ چلے جاتے... میں نہیں چاہتا کہ تم زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو۔"

"زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے... اگر میری موت ان کے ہاتھ نہیں لکھی ہوئی تو میں نہیں مروں گا۔" اس نے جواب دیا۔

میں بجلی کی سی سرعت اور تیزی سے منہ کے بل رینگتا ہوا اور جھاڑیوں کو غیر محسوس [redacted] ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ چند لمحوں کے بعد پھر سے فائرنگ کا سلسلہ وقفے وقفے سے شروع ہو گیا۔ ان کے نشانے خطا ہو رہے تھے کیوں کہ وہ ابھی تک پتا نہیں چلا سکے تھے کہ میں کہاں چھپا ہوا ہوں میں نے جھاڑیوں کو حرکت نہیں دی ورنہ وہ اس سمت کا نشانہ لینے میں دیر نہ کرتے۔ تھوڑی دیر کے بعد دشمن پیچ و تاب کھانے لگا۔ وہ جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے یکبارگی پھر گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ساری فضا دھماکوں سے گونجنے لگی اور بارود کی بو فضا میں پھیلنے لگی۔ وہ میری جان لینے پر تلے ہوئے تھے۔ ناکامی ان کا منہ چڑا رہی تھی۔

میں اس دوران کوئی چھ سات قدم آگے پہنچ چکا تھا۔ میں نے جھاڑیوں کو غیر محسوس انداز سے ہٹا کر درمیان میں سے مخالف سمت دیکھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ دشمن کس حصے میں چھپا ہوا ہے تاکہ اس کی خبر لے سکوں۔

معاً" میری نگاہ اس درخت اور جھاڑیوں پر پڑی جو قدرے ہٹ کر تھیں۔ دشمن نے انہیں ڈھال بنا رکھا تھا۔ پھر وہ جھاڑیوں کے عقب میں آیا تو میں نے میری سمت نشانہ لینے کے لیے بندوق کی نال باہر نکالی۔ اس کا رخ مجھ سے ہٹ کر کسی اور سمت تھا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ میں کہاں چھپا ہوا ہوں۔ پھر اس نے اندازے سے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔

میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ریوالور سے اس بندوق والے شخص کا نشانہ لیا۔ دوسرے لمحے میرے جدید ترین اور امریکی ساخت کے ریوالور نے جو دور تک مار کرنے والی صلاحیت رکھتا تھا اس شخص کی سمت شعلہ اگل دیا۔

ایک دل خراش چیخ نے ماحول کو لرزا دیا۔ بندوق ہوا میں کسی گیند کی طرح اچھل کر جھاڑیوں سے ہوتی ہوئی راستے میں آن گری... جھاڑیاں اس طرح ہلنے

لگیں جیسے طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہوں۔ وہ شخص زخمی ہو کر ان جھاڑیوں میں پھنسا ہوا کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ میرے جی میں آیا کہ اس کی طرف لپک کر جاؤں اور ریوالور کی ساری گولیاں ایک ایک کر کے اس کے جسم میں اتار دوں اور سارا جسم چھلنی کر دوں۔ چوں کہ اس کے دوسرے ساتھی ادھر ادھر چھپے ہوئے تھے اس لیے میں نے اپنے آپ کو اس ارادے سے باز رکھا۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو پھر میں اسے نہایت بے رحمی سے موت کی نیند سلا دیتا۔ کیوں کہ اس نے ایک عورت اور معصوم بچی کا بھی کوئی خیال نہیں کیا تھا۔ میں اپنی اس کامیابی پر بہت مسرور تھا کہ دشمن کا ایک محافظ کام تو آیا۔ میری ہمت اور حوصلہ بڑھ گیا تھا۔

میں نے اپنے نشانے کا رخ بدلا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ جھاڑیوں کے سرے پر میں نے گھاس پر ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں بوٹوں کا عکس دیکھا تھا گو کہ وہ واضح نہیں تھا لیکن میں نے پھر بھی اندازے سے ادھر ایک فائر جھونک دیا۔ ایک گولی ضائع کرنے میں حرج نہیں تھا۔ مجھے اس بات کی امید تھی کہ وہ ضائع نہیں ہوگی۔

یہ دوسری چیخ تھی.... جھاڑیوں میں ایک اور طوفان آ گیا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے کراہنے کی آوازیں سنیں۔ دونوں محافظ زخمی ہو کر کراہنے لگے تھے۔ اب گولیاں برسانا بند ہو گیا تھا۔ جب دو آدمی نشانہ بنے تو اس سے دشمن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں نہتا نہیں ہوں بلکہ میرے پاس بھی اسلحہ موجود ہے۔ وہ نہتا جان کر شیر ہو رہے تھے جیسے بلی کی خالہ بھی اپنی گلی میں شیر ہو جاتی ہے۔

ابوبکر بہت خوش ہو گیا تھا۔ اس نے سرشاری سے کہا۔

"دوست.... ! تمہارے نشانے کی زد میں آ گئے۔ ہماری خاموشی کو انہوں نے ہماری کمزوری سمجھا تھا اور ان کا خیال تھا کہ ہم ان کی زد میں آ کر اس سنسار سے سدھار جائیں گے۔ اب ان کی غلط فہمی دور ہو گئی ہو گی کہ ہم ہنستے ہیں۔"

ابوبکر میرے قریب سے گزرتا ہوا بندوق اٹھانے کی غرض سے بڑھنے لگا تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ تم کہاں جا رہے ہو؟ کیا بندوقیں اٹھا کر لانے ؟"

"ہاں...." اس نے سر ہلایا۔ "اس لیے کہ یہ نہ صرف جدید ترین امریکی بندوقیں ہیں بلکہ بے حد قیمتی بھی.... اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اٹھا کر لاؤں۔ مجھے جانے دو.... اس لیے کہ پھر وہ اسے استعمال نہ کر لیں۔ ہمارے سروں پر خطرہ منڈلاتا رہے گا۔"

"مگر میرے دوست.... ! یہ خالی بندوقیں ہمارے کس کام کی....؟" میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ "اس کی گولیاں ہمارے پاس تو ہیں نہیں؟"

"فکر نہ کر عبداللہ کے پاس مل جائیں گی؟" ابوبکر نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "وہ اکثر سندر بن شکار پر جاتا ہے۔ شیروں کا شکار کرتا ہے تاکہ ان کی کھالوں کو فروخت کرے۔ میں نے اس کے پاس بھی بالکل ایسی ہی بندوقیں دیکھی ہیں۔ جو وہ حال ہی میں چٹاگانگ سے خرید کر لایا ہے۔

"لیکن تمہاری جان ان بندوقوں سے کہیں قیمتی ہے۔" میں نے کہا۔ "دشمن کے اور ساتھی کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ کہیں تم ان کا نشانہ نہ بن جاؤ۔"

"اللہ نے چاہا تو میں سلامت رہوں گا۔" وہ کہنے لگا۔ "ہمیں ایک بندوق کی سخت ضرورت ہے تاکہ دشمن سے مقابلہ کرنے میں آسانی ہو۔ یہ بندوق بہت قیمتی ہی نہیں بلکہ نایاب بھی ہے۔ ہم اسے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے ہیں۔ عبداللہ نے مجھے اس کی قیمت ہزاروں میں بتائی تھی۔"

ابوبکر کی بات غلط نہ تھی۔ اس نے بڑی دور اندیشی کی بات کہی تھی۔ میں نے اسے تاکیدی لہجے میں کہا۔

"احتیاط سے جانا میرے پیارے دوست.... ! میں اللہ سے دعا کروں گا کہ وہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

"میں اللہ ہی کے بھروسے پر تو جا رہا ہوں۔ وہی مارنے والا ہے بچانے والا تو ہے۔" ابوبکر نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا اور زیر لب مسکرا دیا۔ وہ کسی چیتے کی مانند دبے پاؤں بڑی پھرتی سے بندوق کے پاس پہنچا اور اسے اٹھا کر برق رفتاری سے واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے اس نے کوئی بہت بڑا محاذ فتح کر لیا ہو۔

اپنی جان پر کھیل کر موت کے منہ سے بندوق اٹھا کر لانا کسی محاذ کے فتح کرنے سے کم نہیں تھا۔ میں نے اس کی پیٹھ تھپک کر شاباش دی۔ خیریت اس لیے رہی تھی کہ دشمن پر کچھ ایسا خوف طاری ہو گیا اور ان کے دلوں میں ہیبت بیٹھ گئی تھی کہ فائرنگ کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ دشمن نے اپنے حریف کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں نہتا رہوں گا۔ لیکن اس کے دو ساتھی شدید زخمی ہو گئے یا موت کے منہ میں چلے گئے تھے... یا زخموں کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے تھے۔

یہ معلوم نہ ہو سکا۔ کیوں کہ اب اس طرف سے کراہنے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ البتہ سرگوشیاں سنائی دے رہی ہیں۔ وہ شاید کوئی منصوبہ بنا رہے تھے کہ ہمیں کس طرح زیر کیا جائے۔

میں نے ان کی فائرنگ سے اندازہ کیا کہ وہ کل پانچ چھ آدمی تھے جس میں سے دو آدمی تو ناکارہ ہو چکے تھے۔ چاروں طرف سے دو آدمی فائرنگ کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں حصار میں لیا ہوا تھا۔ انہوں نے آمنہ کو اس لیے جانے دیا تھا کہ وہ عورت تھی اور اس کے ساتھ بچے بھی تھے۔ وہ دشمن نہ تھی۔ میں ان کا نشانہ تھا۔ اگر میں ساتھ ہوتا تو میری لاش پڑی ہوتی اور بھابھی بھی بیوہ ہو چکی ہوتی۔

میں نے ابوبکر سے بندوق لے کر اسے چیک کی۔ اس میں میگزین نصب تھا۔ اس نے شاید میگزین اس لیے لگایا ہو گا کہ ہم دونوں کو بھون کر رکھ دے لیکن معاملہ الٹا ہو گیا۔ اسے فائرنگ کی نوبت نہیں آئی۔ میری گولی نے اس کی خیریت پوچھ لی۔ اس بندوق کی وجہ سے جسم میں نئی توانائی آ گئی۔ اب میں اس دشمن کی بندوق سے دشمن کو تباہی کا پیغام دے سکتا۔ ابوبکر نے اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے واقعی کمال کر دکھایا تھا۔ میں نے ریوالور ابوبکر کو تھما دیا۔ بندوق خود سنبھال کر پوزیشن لینے لگا تاکہ دشمن کے دانت کھٹے کر دوں۔

اس وقت آمنہ ندی کی سمت سے گرتی پڑتی اور بدحواس ہو کر دوڑتی ہوئی چلی آئی۔ اس کا سانس بری طرح پھول رہا تھا اور سینے میں دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس کا چہرہ خوف و ہراس سے زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

اس نے پہلے ابوبکر کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بعد میں میرا جائزہ لیا۔ پھر وہ اپنے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ اس کا اس طرح سراسیمگی سے گرتے پڑتے بھاگ کر آنا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس وقت ایک خیال آیا کہیں ایسا تو نہیں کہ دشمن کی گولی سے اس کا بچہ زخمی ہو گیا ہو۔ میرا خیال تھا کہ وہ اب تک خیریت سے گھر پہنچ چکی ہو گی۔ لیکن اس کا آنا بڑا حیران کن تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے اس طرح خوف زدہ ہو کر اکیلے بھاگ کر آنے کے بارے میں کچھ پوچھتا ابوبکر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے زمین پر گرا دیا۔ پھر وہ اس پر بری طرح برس پڑا۔

"احمق عورت تم کس لیے واپس آئیں...؟ کیا یہاں کوئی ناٹک ہو رہا ہے؟"

"میں نے دو مرتبہ بھیانک چیخیں سنی تھیں۔" آمنہ نے الجھتی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ "یہ چیخیں سن کر بچے رونے لگے۔ ان دونوں کا کہنا تھا کہ تم دونوں کو کچھ ہو گیا ہے۔ اس لیے مجھ سے رہا نہیں گیا۔ تم دونوں کو خیریت سے دیکھ کر جان میں جان آئی... اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یہاں سے بھاگ جاؤ..." ابوبکر گھٹی گھٹی آواز میں ہذیانی لہجے میں بولا۔ "دیکھتی نہیں ہو یہاں موت کا کھیل ہو رہا ہے احمق عورت...! ابھی فائرنگ کا سلسلہ ابھی پوری طرح تھما نہیں ہے... جلدی سے دفع ہو جاؤ۔ ورنہ تم اور بچے بچ نہ سکیں گے۔"

آمنہ ہانپتی کانپتی الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ میں اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک ندی کنارے جہاں اس کے بچے تھے پہنچ نہ گئی۔ بچے سہم کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

میں اور ابوبکر کتنی ہی دیر تک دم سادھے منہ کے بل لیٹے رہے اور مخالف سمتوں کا جائزہ لیتے رہے تھے کہ دشمن کسی سمت سے دوبارہ فائرنگ شروع نہ کر دے۔ ہم اس کی گھات میں تھے اور وہ ہماری گھات میں بیٹھا ہوا تھا۔ اوندھے منہ لیٹے لیٹے ہمارا سانس بھاری ہو گیا تھا۔ ایک ایک لمحہ صدی کی طرح بھاری ہونے لگا۔ ابوبکر کا اندرون اضطراب اس کے چہرے پر کرب بن کر کپکپا رہا تھا۔ اس کا وہ ہاتھ بھی کانپ رہا تھا جس کی گرفت میں ریوالور تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کے ارتعاش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دشمن کی جانب سے کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی تھی۔ چاروں طرف گہرا سناٹا طاری ہو گیا جس میں موت کی وحشت برس رہی تھی۔ یہ سناٹا کسی خطرے کا پیش خیمہ تھا۔ میری چھٹی حس پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔ میں چوکنا ہو کر خطرے کی بو سونگھتا ہوا جھاڑیوں پر نظریں مرکوز کیے دے رہا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اچانک جھاڑیاں سرسرانے لگیں جیسے کوئی ان میں مورچہ بنا رہا ہو۔

ابوبکر مجھ سے دو تین قدم پر موجود تھا اور اس نے میرے پاس آ کر کان میں سرگوشی کی۔

”وہ اپنے زخمی ساتھیوں کو اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔“

”تمہیں کس طرح سے پتا چلا....؟“ میں نے اس کے کان میں کھسر پھسر کی۔ ”میں نے ان دونوں کو تو جہنم رسید کر دیا تھا؟“

”کیا تمہیں ان دونوں کے کراہنے کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی نہیں دے رہی ہیں۔“ وہ بولا ”کان لگا کر سنو۔ دائیں ہاتھ کی طرف سے آوازیں آ رہی ہیں۔“

ابوبکر کی سماعت حیرت انگیز طور پر بہت تیز تھی۔ دیگر لوگوں کے مقابلے میں اس میں یہ خصوصیت بچپن ہی سے تھی۔ میں نے اپنی پوری توجہ دائیں جانب مبذول کر کے کان کھڑے کر لیے.... پھر چند لمحوں کے بعد سر ہلا کر اس بات کی تصدیق کی۔ اس کی سماعت کبھی دھوکا نہیں کھاتی تھی۔

چند لمحات بھی نہیں گزرے تھے کہ ابوبکر دوزانوں ہو کر بیٹھ گیا جس سے جھاڑیوں میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔

میں نے چونک کر اس کی احمقانہ حرکت کو دیکھا اور فوراً ہی ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے اوپر گرا لیا۔

”ابوبکر.... کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ موت کو دعوت دے رہے ہو....“

اگر میں پل بھر کی تاخیر بھی کرتا تو سنسناتی ہوئی گولی جو مخالف سمت سے آئی تھی اس کا بھیجا پاش پاش کر دیتی۔ ابوبکر بے جان سا ہو کر میرے سینے پر گر گیا۔ وہ چند لمحے تک موت کی دہشت سے بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اپنی جگہ پتھر بن گیا۔ سانس لینا بھی بھول گیا تھا۔ پھر اس نے چند لمحوں کے بعد سنبھل کر میری طرف ممنون نگاہوں سے دیکھا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی پھیل گئی۔ وہ پلکیں جھپکانے لگا۔ پھر اس نے سرگوشی کی۔

”دوست.... میں تمہارا یہ احسان کبھی بھی بھول نہیں سکوں گا.... تم نے مجھے نئی زندگی دی۔“

”بے وقوف.... کیا کسی دوست کے کام آنا احسان ہوتا ہے....؟“ میں نے تیز لہجے میں ڈانٹا۔ ”یہ جو تم قدم قدم پر اپنی جان خطرے میں ڈال کر اور بیوی بچوں کی پروا نہ کر کے میری مدد کر رہے ہو کیا یہ میرے لیے کم ہے.... یہ اتنا عظیم احسان ہے کہ میں اس کا بدل دے ہی نہیں سکتا.... میرا سگا بھائی بھی ہوتا تو وہ اس مصیبت کی گھڑی میں بھی کام نہ آتا.... تم مجھے شرمندہ نہ کرو ابوبکر....!“

”خطرہ تو ابھی بھی موجود ہے۔“ وہ بولا ”اس خاموشی سے میں یہ سمجھا تھا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ لیکن وہ اب بھی گھات میں ہیں۔“

میں نے اسے چند ضروری ہدایات دیں۔ پھر فوراً

بندوق سنبھال کر اس سمت نشانہ لیا۔ جہاں سے فائر کیا گیا تھا۔ ایک اشارے پر ہم دونوں نے مل کر ایک ساتھ فائرنگ شروع کر دی۔ بندوق سے ایک برسٹ مار کر میں نے ابوبکر کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا۔ پھر اندھا دھند فائر کرنے لگا۔ جب ریوالور خالی ہو گیا تو میں اسے دوبارہ بھرنے لگا۔ ایک طرح سے میں نے اچھا کیا تھا کہ فاضل گولیاں ساتھ رکھ لی تھیں۔ اس وقت ان کا کام آنا میرے لیے بڑے حوصلے کی بات تھی۔ پھر میں نے تڑتڑ ریوالور سے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ میں دشمن کو سانس لینے اور سنبھلنے کی مہلت دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا سر کسی سانپ کی طرح کچل دینا چاہتا تھا۔

میں نے ردعمل دیکھنے کے لیے توقف کیا۔ کیوں کہ جوابی حملہ بند ہو چکا تھا۔ اس وقت فضا میں ایک التجا بھری آواز گونجی۔

"رک جاؤ.... ٹھہرو.... خدا کے لیے فائرنگ بند کرو .... مجھ پر رحم کرو۔"

مجھے لگا کہ اس کی رحم کی التجا میں کوئی چال ہے۔ میں نے بھی زور سے ہذیانی لہجے میں چلا کر کہا۔

"اپنی بندوق پھینک دو.... اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ.... کوئی چالاکی نہ کرنا.... ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔"

"تم.... تم.... مجھے مارو گے تو نہیں....؟" اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ "میں تمہاری ہر بات اور حکم مانوں گا.... جو سزا دو گے منظور ہے۔"

"نہیں...." میں نے زور سے چیخ کر اسے یقین دلایا۔ "میں تمہاری طرح سنگ دل نہیں ہوں۔ شرافت سے پیش آؤں گا۔"

پھر اس نے فوراً ہی میرے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے اپنی بندوق پھینکی اور اپنی گردن پر دونوں رکھے ہوئے جھاڑیوں سے نکل آیا اور پریشان اور سراسیمہ ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔

اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی کمر بندھی پٹی میں بہت ساری گولیاں تھیں۔ وہ چہرے مہرے اور وضع قطع سے جرائم پیشہ دکھائی دیتا تھا۔ کوئی تربیت یافتہ مجرم.... اس کی ساتھی بھی تربیت یافتہ تھے۔ اس لیے انہوں نے بڑی مہارت سے فائرنگ کی تھی۔

میں نے پاٹ دار آواز میں تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔ "تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟ وہ دکھائی نہیں دیتے؟ کہاں چھپے ہوئے ہیں؟" اس نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا تو اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

"وہ زخمی ساتھیوں کو طبی امداد کے لیے لے گئے ہیں۔"

"سچ بتاؤ...." ابوبکر نے کرخت لہجے میں کہا۔ "اس وقت تم اکیلے ہو یا کوئی اور بھی ہے جو کہیں چھپا ہوا ہے؟"

"نہیں.... میں اکیلا ہوں۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔ "اب کوئی اور موجود نہیں ہے۔"

"پھر تم یہاں اکیلے موجود کیوں ہو؟" ابوبکر نے جرح کے انداز میں کہا۔ "تم ساتھ کیوں نہیں گئے....؟"

"مجھے یہاں ٹھہرنے کے لیے اس لیے کہا گیا ہے کہ اگر تم دونوں ان کا تعاقب کرو تو میں فائرنگ کر کے روک سکوں۔" اس نے کہا۔

ابوبکر نے اس کی بات سن کر مجھ سے کہا۔

"میں اس کی بندوق اٹھا کر لا رہا ہوں.... اگر اس کا کوئی ساتھی چھپا ہوا ہو گا تو مجھ پر فائر کرے گا۔ تم اسے بھون کر رکھ دینا اور میری فکر مت کرنا۔"

ابوبکر تیزی سے بندوق اٹھانے لپکا۔ وہ بدمعاش دونوں ہاتھ گردن پر رکھے کھڑا تھا۔ ابوبکر بندوق لے کر صحیح سلامت واپس آ گیا۔ اب اطمینان ہو گیا تھا کہ اس نے سچ کہا۔ ابوبکر اور میں نے جھاڑیوں سے نکل کر اسے گرفت میں لے لیا۔ اس کی کمر سے گولیوں کی پٹی اتار کر پوچھا۔

"اب بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے....؟ تم اور تمہارے ساتھیوں نے ہماری جان لینے کے لیے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔"

"میں اور میرے ساتھ حکم کے غلام ہیں۔ اس کی تن خواہ ملتی ہے۔" وہ لرزاں آواز میں کہنے لگا۔ "گل ناز بیگم صاحبہ نے صرف آپ کو زخمی یا دہشت زدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ اگر وہ جان لینے کے لیے کہتیں تو یقین مانیئے آپ دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچتا۔"

"اپنی مالکن گل ناز بیگم صاحبہ سے کہہ دینا کہ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا۔ "ان کے دل میں جو حسرتیں چل رہی ہیں انہیں پوری کرلیں.... تم اس بات سے ضرور واقف ہو گے کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔"

میں نے اسے جانے کا اشارہ کیا تو وہ تیزی سے حویلی کی جانب دوڑتا چلا گیا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس کی بندوق کا جائزہ لیا۔ وہ بھی جدید ترین امریکی ساخت کی تھی۔ بے حد قیمتی.... بانو نے اسلحہ کی خریداری پر پیسا پانی کی طرح بہایا ہوا تھا۔

گاؤں میں یہ واقعہ ہول ناک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ میری اور بانو کی کہانیاں راز نہیں رہ سکیں۔ لوگ انگشت بداں تھے کہ وہ معمولی سی لڑکی بانو.... گل ناز بیگم ہے۔ اس لیے اس نے مولوی جبار الدین بلکہ تمام لوگوں سے انتقام لیا تھا جنہوں نے اس کی بات نہیں سنی، سچ نہیں مانا اور ذلیل و رسوا کر کے گاؤں سے نکال دیا۔ بانو نے ان سے ایسا انتقام لیا کہ انہیں بھکاریوں سے بھی بدتر بنا دیا تھا۔ میں جدھر سے گزرتا ساری نگاہیں میری طرف اٹھ جاتیں.... خصوصاً نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت ہوتی اور ان کے چہروں کے تاثرات حقارت آمیز اور زہر خند.... اس لیے کہ میں نے ایک معصوم لڑکی کو فریب دیا۔ سبز باغ دکھا کر اس کی زندگی تباہ و برباد کردی۔ انہیں بانو سے بہت زیادہ اپنائیت، محبت اور ہم دردی ہو گئی تھی۔ ان کے خیال میں بانو میری دشمن بننے میں حق بجانب تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ بانو مجھ سے گن گن کر بدلہ لے۔ انتہائی بھیانک، وہ میرے ساتھ جتنی ذلالت کرسکتی ہے کرے.... مجھے کسی قیمت پر نہ بخشے۔ دوسری طرف وہ مرد حضرات جو بانو کے عتاب کا نشانہ بنے تھے میں ان کے نزدیک بھی نفرت اور حقارت کا مرکز تھا۔ مجھے الزام دیتے تھے کہ ان کی محتاجی اور بربادی کا ذمے دار میں تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ مجھے کچا چبا جاتے یا موت کی نیند سلا دیتے۔ ان کی نگاہوں میں ایسا زہر تھا کہ میری نگاہیں تاب نہ لا پاتی تھیں۔ میں اس بات کی حتی الامکان کوشش کرتا ان کے سامنے سے نہ گزروں۔

لیکن ان باتوں سے میرا ذہن ہٹ کر کسی ایسے منصوبے کی فکر میں تھا کہ بانو میری ویران اور بے کیف زندگی میں چپکے بہار بن کر آجائے۔ اس کی نفرت اور انتقام کے جوش اور اندھے جنون کو دیکھتے ہوئے یہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ اگر اس کے دل کے کسی کونے میں بھی محبت کی رمق ہوتی تو میں اسے ضرور حاصل کرلیتا۔ لیکن میں اتنا جانتا تھا کہ دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔

دن رات تدبیر سوچتے سوچتے آخر کار میرے ذہن میں ایک منصوبہ آ ہی گیا جس پر عمل کیا جاسکتا تھا۔

سہ پہر کے وقت حویلی جانے سے پہلے میں نے اس منصوبے کے ہر پہلو پر غور کیا اور ناقدانہ انداز سے جائزہ لیا۔ پھر مطمئن ہو کر حویلی کی سمت چل پڑا۔

میں نے عقبی حصے کا رخ کیا جو حویلی کا تھا اور ویران سا ہوتا تھا۔ اس کے لیے مجھے ایک لمبا سا چکر کاٹ کر ایک ایسے راستے سے گزرتا جو قدرے دشوار گزار اور تکلیف دہ بھی تھا لیکن کرتا گیا۔ کیوں کہ اس طرح میں حویلی کے محافظوں کی نظروں میں نہیں آسکتا تھا لیکن اس کے باوجود میں ہر طرح سے محتاط، مستعد اور چوکنا تھا اور حویلی پر نظریں مرکوز کیے ہوئے تھا تاکہ کوئی مجھے کسی عقبی کمرے سے نہ دیکھ لے۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا.... میں شیخ چلی بنا ہوا یہ خواب دیکھ اور سوچ رہا تھا کہ اچانک اور غیر متوقع میرے بھاگ جاگ اٹھیں۔ میں حویلی میں پہنچ جاؤں۔ آمنہ نے بتایا ہوا تھا کہ حویلی میں صفائی کے

لیے دو عورتیں جاتی ہیں اور کام ختم کرنے کے بعد انہیں ایک لمحہ بھی رہنے نہیں جاتا ہے۔ گل ناز بیگم رات دن اکیلی ہی رہتی ہے۔ اکیلی سوتی ہے۔ دن میں بھی اور شام ہونے کے بعد بھی۔۔۔ بستر پر جانے تک وہ نائٹی میں ہوتی ہے اور زیر جامے نہیں ہوتے ہیں۔ یہ نائٹی سیاہ اور جالی دار ہوتی ہے جس میں وہ بے لباس ہی لگتی اور اس کا چاندی کا جسم اور خال و خد اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے صاف و شفاف کانچ کی صراحی میں شراب چمکتی ہے۔ وہ رات جب سونے کے لیے بستر پر جاتی ہے تو بے لباس اور نائٹی کے بغیر ہی ہوتی ہے۔ یہ تمام باتیں آمنہ کو ان نوکرانیوں نے بتائی تھیں۔ آمنہ نے ابوبکر اور اس نے مجھے بتایا۔ وہ نوکرانیاں جواں سال تھیں۔ انہوں نے آمنہ سے کہا تھا کہ گل ناز کے جسم کے نشیب و فراز اس قدر پرکشش ہیں۔ ان میں اتنا گداز اور رس بھرا ہے کہ دل کرتا ہے کہ اس رس بھرے بدن کے ہر انگ انگ، خطوط اور عضو عضو اور گوشوں کا رس ہونٹوں میں جذب کرتی رہیں اور ہم آغوش ہو جائیں۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ عورت اس بھرپور جوانی میں اور پرشباب ہو کر کس طرح پیاسی رہ جاتی ہے۔ گاؤں میں ایک جواں سال عورت سلمٰی تھی جس کا شوہر شادی کے دو برس بعد اسے طلاق دے کر کولکتا چلا گیا تھا۔ کیوں کہ اس کے شوہر نے اپنی بیوی کو سولہ برس کے لڑکے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھا تھا۔ وہ غریب کرتی بھی کیا۔ کیوں کہ اس کا شوہر اس کے جذبات کی پیاس بجھا نہیں سکتا تھا۔ پھر اس عورت نے لڑکوں اور مردوں سے تعلقات استوار کرنے کے بجائے جوان لڑکیوں اور ایسی عورتوں کے ساتھ جن کے شوہر روزگار کے سلسلے میں ہندوستان اور نیپام اور عرب ممالک میں رہتے تھے ان سے تعلقات استوار کر لیتی تھی۔ وہ ہم جنس پرستی کا شکار ہو گئی۔ لڑکوں اور مردوں سے اس لیے تعلقات استوار نہیں کرتی تھی کہ کہیں اس کا نتیجہ ظاہر نہ ہو۔ گاؤں میں ایسا واقعہ ایک ہو چکا تھا۔ اس عورت نے شادی کر لی اور اس کے ساتھ کولکتا چلی گئی۔

میں نے ان دونوں کو راستے میں حویلی سے نکل کر گاؤں جاتے دیکھ لیا تھا اور میرے بدن پر اس خیال سے سنسنی دوڑ گئی تھی وہ اکیلی ہو گی۔ اگر میں کسی طرح حویلی پہنچ جاؤں تو اسے تنہا پا کر دبوچ سکتا ہوں اور قابو میں کر کے بے بس کرنے میں دشواری نہ ہو گی۔ میں اسے سرفراز کر دوں تو پھر وہ جذبات کی رو میں بہتی ہی چلی جائے گی۔ اندر کی سوئی ہوئی عورت جاگ جائے گی۔ لیکن اتنا آسان نہ تھا۔ وہ کوئی حلوہ نہ تھی۔ کوشش شرط تھی۔ موقع ملا تو میں اسے ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔

میں یہ سب کچھ سوچتے اور چلتے چلتے اور گل ناز بیگم کو تصور میں ہم آغوشی کی حالت میں جھکتے جھکتے اور ان جانے راستے پر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک وسیع و عریض میدان میں پہنچ کر رکا۔ کیوں کہ اس کے اطراف گھنے درخت تھے جو بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے اور راستے کی رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ دونوں طرف جھاڑیاں اس قدر اونچی اور گھنی تھیں کہ حویلی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ زمین پر لمبی لمبی خود رو گھاس اگی ہوئی تھی۔ وہ بھی چلنے میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ پہلے میں اس راستے سے نہیں گزرا تھا۔ چار دن پہلے رات کے وقت میں کسی دوسرے راستے سے گزرا تھا۔ چاروں طرف وحشت ناک سناٹا طاری تھا۔

میں ادھر کھڑا متلاشی نظروں سے ایسا راستہ ڈھونڈ رہا تھا کہ اس سے میں آسانی سے گزر سکوں۔ دفعتاً میں نے سوکھے پتوں کے چرمرانے کی آواز سنی جیسے کوئی دبے پاؤں غیر محسوس انداز سے میری طرف بڑھ رہا ہو۔ میں ایک دم چوکنا اور ہشیار ہو گیا۔ میں نے غور سے سنا اور اندازہ لگایا کہ یہ آوازیں کس سمت سے آ رہی ہیں۔ سامنے والی لمبی اور اونچی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی ہوئی میں نے کسی شکاری کی طرح شکار کی بو سونگھ لی تھی۔ پھر میں نے ریوالور نکالنے میں دیر نہیں کی۔ پھر اس پر گرفت مضبوط کر لی۔

میں آنکھیں پھاڑ کے اس سمت دیکھنے لگا جدھر جھاڑیوں میں ہل چل ہوئی تھی۔ تین کتے غراتے

ہوئے جھاڑیوں سے نکل کر اس جگہ اس طرح جم گئے جیسے کسی پر اسرار نادیدہ موت نے ان کی ساری طاقت سلب کر لی ہو اور بے جان بنا دیا ہو۔

یہ کتے گل ناز بیگم کے سوا کسی کے ہو سکتے تھے۔ ان میں سے دو کتوں کو دیکھ چکا تھا۔ تیسرا کتا تو ان دونوں سے کہیں خطرناک اور خوں خوار معلوم ہوتا تھا۔ وہ تینوں میرے سامنے قدرے فاصلے پر اپنی لمبی لمبی زبانیں نکالے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی سرخ سرخ آنکھوں میں وحشیانہ پن کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی بھی لمحے مجھ پر جھپٹنے والے ہیں۔ بس کسی کے اشارے اور حکم کے منتظر ہیں۔

اس وقت میری تیزی، مستعدی اور پھرتی کا امتحان ہونے والا تھا۔ میرے ریوالور کی تین گولیاں ان کے لیے کافی تھیں۔ کیوں کہ یہ کوئی عام قسم کا ریوالور تھا اور نہ ہی اس کی گولیاں.... اس کی ایک گولی نہ صرف شیر ببر بلکہ گینڈے اور تیندوے کو موت کی نیند سلا سکتی تھی .... اس کے حملہ آور ہوتے ہی پل بھر کی تاخیر بھی مجھے موت کی نیند سلا سکتی تھی۔ میں چوکنا ہو کر پوزیشن لینے لگا۔ میری نگاہیں ان پر مرکوز تھیں۔ ادھر کوئی حرکت کرتا تو ادھر میرا ریوالور شعلہ اگل دیتا۔

یہ سوچ کر میرا بدن برف بن گیا تھا اور ہاتھ پیر سن ہو کر رہ گئے تھے کہ میں بیک وقت ان تینوں درندوں سے کیوں کر مقابلہ کر سکتا ہوں.... اگر تینوں بیک وقت مجھ پر ٹوٹ پڑے تو....؟ پھر فاصلہ بھی اتنا نہیں تھا کہ مجھے مہلت مل جاتی۔ مجھے اپنی نظروں کے سامنے موت رقص کرتی نظر آئی۔ اب کوئی معجزہ ہی مجھے ان وحشی جانوروں سے بچا سکتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ان سے کس طرح نمٹوں؟ میں غیر محسوس انداز سے ہٹ کر جو قریبی درخت تھا اسے ڈھال بھی تو نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ مجھے حرکت میں دیکھ کر خود بھی حرکت میں آجاتے.... ان کا خاموشی سے گھورنا کھڑے ہو کر میرے لیے تعجب خیز اور ناقابل یقین تھا۔ چوں کہ یہ پالتو کتے تھے اس لیے اپنے مالک کے حکم کے بغیر ہل بھی نہیں سکتے تھے۔ اگر یہ پالتو کتے نہ ہوتے تو وہ مجھ پر اب تک حملہ آور ہو چکے اور پل بھر کی تاخیر بھی نہ کرتے۔

میں نے اپنی پشت پر بہت سارے قدموں کی آوازیں سنیں تو میں اچھل پڑا۔ ایک مترنم سی ہنسی کا زیر و بم میری رگوں میں زہر بن کر سرایت کرنے لگا۔ اس ہنسی میں ایسا حقارت آمیز انداز صاف جھلک رہا تھا جیسے نفرت کی شدت کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی ہو۔

دوسرے لمحے بانو میری نظروں کے سامنے بڑی تمکنت سے کھڑی ہوئی تھی اور اس کے گداز ہونٹوں پر فاتحانہ تبسم رقصاں تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں چمک سی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے اپنے رحم و کرم پر دیکھ کر اندر ہی اندر مسرور ہو رہی ہو۔ اس کے ساتھ چار مسلح محافظ بھی تھے جنھوں نے مجھے اپنی بندوق کی زد میں لیا ہوا تھا۔

بانو کو دیکھتے ہی میں اپنے آپ کو بھول گیا۔ حسن و جمال کا ایک دلکش نمونہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے سفید ساڑی اور بغیر آستینوں کا سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ ہلکا اور نفیس سا میک اپ تھا۔ گلے میں سفید آب دار موتیوں کی مالا پڑی تھی۔ اس کا سراپا جلوہ دکھا رہا تھا اور انگ انگ سے مستی ابلی پڑی تھی۔ بلوریں، سڈول، مرمریں اور گداز بانہوں کے خنجر بے نیام تھے۔

"خوش آمدید کیپٹن ....!" اس کی آواز زہر میں بجھی ہوئی تھی۔

میں چونک کر اس کے سحر سے نکل آیا۔ اس کی آواز میں زہر تھا۔ لیکن وہ پھر بھی شیریں لگی۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔

"میں کل بھی تمہارا سراج تھا اور آج بھی وہی سراج ہوں جس کے قرب سے تم سرشار ہوتی تھیں۔ تم مجھے کیپٹن نہیں سراج کہو بانو!" میرا جواب بانو کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس کی شہابی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ چہرے کی مسکراہٹ زردی میں بدل گئی۔ وہ محافظوں کی موجودگی کی وجہ سے سٹ پٹا گئی تھی کہ کہیں میں سارا راز افشانہ کر دوں اور محبت کا اظہار کر

کے اسے بیوی ظاہر کر دوں۔ اس نے غصے اور سراسیمگی سے مجھے دیکھا اور موضوع بدل دیا۔ پھر وہ ترش روئی سے بولی۔ ”تم مجھے قتل کرنے کے ارادے سے آ رہے تھے۔ مجھے امید تھی کہ تم یقیناً“ اسی راستے سے آؤ گے.... یہ اتفاق تھا کہ میں نے دوربین کی مدد سے تمہیں اس جانب چوروں کی طرح آتے دیکھا۔ تم بہادر تھے تو بیرونی حصے سے آتے....“

”اس چور کے لیے تمہارے نزدیک کیا سزا ہو سکتی ہے جو دل جیسی انمول چیز چرا لے....؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ ”دل کے چور کسی بھی راستے سے آ سکتے ہیں ان کے راستے میں کوئی دیوار نہیں بن سکتا۔“

”میرے یہ جانور بہت دنوں سے کسی انسان کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے لیے بے چین اور بے قرار ہو رہے ہیں۔“ اس نے میرا سوال نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کے رخسار تمتما اٹھے تھے۔ اس عالم میں وہ اتنی پیاری لگی تھی اگر تنہا ہوتی تو اس کی تمتماہٹ کو ہونٹوں میں جذب کر لیتا۔ ”صرف میرے ایک اشارے کی دیر ہے تم ان درندوں کے ہاتھوں لقمہ اجل بن جاؤ‘ میں نے انہیں تم پر حملہ کرنے سے روکا ہوا تھا لیکن میں شاید اب ایسا نہ کر سکوں۔“

”محبت کی راہ میں کوئی مرد عورت کی طرح ایثار کر سکتا ہے.... قربانی دے سکتا ہے.... محبت ایک ایسا پاکیزہ اور بے لوث جذبہ ہے جس کی گہرائی اور گیرائی محبت کرنے والے ہی جانتے ہیں اور جب ایک آدمی محبت کی راہ پر قدم رکھ دیتا ہے پھر وہ کسی دھمکی میں نہیں آتا ہے اور نہ ہی موت سے دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔“ میں نے زیر لب مسکراہٹ سے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ تم گل ناز بیگم کے روپ میں میری منتظر رہیں۔ روز میری راہ تکتی رہیں بانو.... کیا اس کو محبت نہیں کہتے ہیں؟“

”کیپٹن....!“ وہ بگڑ کر بولی تو اس کا دل کش سراپا بل کھایا۔ اس کا لہجہ شکستہ تھا۔ ”تم بھول رہے ہو کہ میں بانو نہیں گل ناز بیگم ہوں۔“

”بانو....!“ میں جذباتی انداز میں گویا ہوا۔ اگر اس کے محافظ نہ ہوتے تو پھر میں اسے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں کس لیتا اور اس کے چہرے پر جھک کر ہونٹوں پر محبت کی مہر ثبت کر دیتا اور پھر اسے گود میں اٹھا کر حویلی میں چلا جاتا۔ پھر میرے ہونٹ اور بہکتے ہاتھ زیر جامے اور اس کے لباس تن سے جدا کر دیتے تو وہ خود سپردگی سے من مانیاں کرتی جب میں ماضی میں اسے حویلی لے جاتا تھا تو اس طرح چومتا تھا کہ وہ نشاط انگیز لمحات میں ڈوب جاتی تھی۔ شادی سے قبل وہ مجھے حد سے تجاوز کرنے نہیں دیتی تو پھر میں جذباتی ہو جاتا تو پھر وہ موم ہو جاتی۔ شادی کے بعد تو ایسا والہانہ پن اور وارفتگی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ہر طرح سے مجھے خوش کرتی تھی۔ مجھے کتوں کا ڈر خوف نہ تھا بلکہ ان محافظوں کی موجودگی نے مجھے باز رکھا تھا۔ ”دیکھو نام بدل جانے سے کیا انسان بھی بدل جاتے ہیں؟ محبت مر جاتی ہے؟ تم گل ناز بیگم! کسی ریاست کی مہارانی کیوں نہ بن جاؤ.... تم بانو ہی رہو گی.... وہی بانو جس نے مجھ سے ٹوٹ کر محبت کی.... تمہاری محبت جو آج بھی یادگار اور اس کے لمحات ناقابل فراموش ہیں۔ محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہوتی ہے۔ شادی پہلے جب تنہائی میں ہماری ملاقاتیں ہوتی تھیں تو میری جھولی میں کسی پکے ہوئے رسیلے پھل کی طرح ٹپک نہیں پڑتی تھیں۔ پھر ہم ان جانے راستے پر اتنی دور چلے جاتے تھے کہ واپسی کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ تم ایک عورت ہو اور عورت اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتی؟ کیا ہماری محبت بھلا دینے اور فراموش کر دینے والی ہے؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ میری بانو! میری زندگی.... میری محبت!“ بانو کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے رخساروں پر آتش فشاں دہکنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں ابھری ہوئی نفرت درندگی میں بدل گئی۔ اس نے بڑی سختی سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ پھر اس نے اپنی متعش آواز میں کہا۔

”میں نے بڑی حماقت کی تھی جو تمہیں زندہ رہنے دیا.... کاش! تمہیں چاند نگر کے دریا کی لہروں کے سپرد کر

دیا جاتا.... لانچ کی روشنی اچانک فنی خرابی کے باعث گل ہو گئی تھیں۔ اگر گل نہ ہوئی ہوتیں وہ لڑکی جس نے اندھیرے سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے اس کمینی سے کہا تھا کہ تم تمہاری حرکات پر نظر رکھے اور موقع پا کر دھکا دے دے۔ وہ تم سے من مانیاں کرنے لگی اور اس کے ہونٹ اور ہاتھ تمہیں لذت سے دوچار کرتے رہے۔ وہ باہم پیوست ہو جانا چاہتی تھی لیکن تم نے وہ لمحہ آنے نہیں دیا البتہ اس کے بدن اور زیر جامے تک محدود رکھے.... مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم ان لوگوں کے ہاتھوں سے پٹنے کے بعد زندہ رہو گے لیکن اب میں غلطی نہیں دہراؤں گی۔ مجھ سے ہر حماقت سرزد ہوئی جو میں نے...."

"بانو جان....! تم یہ بات بھول رہی ہو کہ میں ایک مرد ہی نہیں بلکہ سپاہی بھی ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں کہا۔ جو لوگ جینا اور محبت کرنا جانتے ہیں وہ موت سے نہیں ڈرتے.... میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی منزل پر پہنچ کر ہی دم لوں گا۔ میری منزل کیا ہے؟ تم میری منزل ہو۔ میں اب واپس نہیں جا سکتا۔ اس وقت تک تمہاری نفرت کو ماضی جیسی محبت میں تبدیل نہ کر دوں.... بانو! وہ رنگین لمحات' نشاط انگیز دن اور گھڑیاں آج بھی یاد ہوں گی جو حویلی میں بسر کرتے رہے۔"

"منزل....؟" وہ زیر خند انداز میں کھل کھلا ہنس پڑی۔ "اس شاعری سے تم مجھے فریب دے سکتے ہو اور نہ ہی میری نفرت اور انتقام کی آگ کو بجھا سکتے ہو.... اب تم صرف چند لمحوں کے مہمان ہو.... میرے ایک اشارے پر یہ درندے تم پر جھپٹ پڑیں گے.... میں یہ دلچسپ اور سنسنی خیز تماشا دیکھنے کے لیے برسوں سے بے قرار ہوں.... جب یہ درندے تمہارا گوشت کھا لیں گے تب میرے آدمی تمہاری قبر کھود کر اس میں تمہاری ہڈیاں دفن کر دیں گے۔ پھر کسی کو تمہارا نام و نشان نہیں ملے گا۔"

"بانو....! جب ہم آپس میں محبت کرتے ہیں اور سہاگ کی پہلی رات ہم دونوں نے ساتھ جینے مرنے کا عہد کیا تھا۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اتنی بڑی دنیا میں اکیلی نہیں رہوں گی۔ اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔ اس گھر سے دو جنازے ساتھ اٹھیں گے لہٰذا تمہیں میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا...." میں نے ان آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"وہ کس طرح....؟" اس کے لہجے میں طنز اور تمسخر تھا۔

میں نے اسے ریوالور کی زد میں لے کر کہا۔

"سب سے پہلے میں تمہیں گولیوں کا نشانہ بناؤں گا۔ مجھے ذرہ برابر بھی اپنی موت کی فکر اور پروا نہ ہو گی۔"

بانو کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے یہ سوچا نہیں تھا کہ میں اسے بھی موت کی نذر کر سکتا ہوں۔ وہ فوراً ہی سنبھل کر بولی۔

"لیکن تم اپنے دل میں ایک حسرت لیے مر جاؤ گے؟"

"کیسی حسرت....؟" میں نے چونک اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی جس پر فتح مندی ابھر آئی تھی۔

دوسرے لمحے بانو کے چہرے پر ایک کرب سا چھا گیا اور آنکھوں میں تاسف ابھر آیا وہ ان جانے احساس سے جواب دینے سے گریز کرنے لگی۔ اس کے بشرے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا اسے اپنے کہنے پر پچھتاوا سا ہو رہا ہے۔ اس نے قدرے توقف کے بعد تذبذب سے کہا۔

"کیا تم اپنی بیٹی کو دیکھنا اور اس سے ملنا پسند نہیں کرو گے.... وہ ایک لمبی مدت سے تمہارے انتظار کی مالا جپ رہی ہے.... وہ اس دنیا میں تمہیں زیادہ چاہتی ہے اور جان سے بھی بڑھ کر عزیز رکھتی ہے۔"

"میری بیٹی....؟"

میری زبان سے تحیر زدہ الفاظ نکلے۔ میں حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ میرے ہاتھ میں سرشاری کے عجیب جذبے سے ریوالور کانپنے لگا۔ میرا سر چکرایا تو میری آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی۔ میں اسے

اپنی سماعت کا فتور سمجھ رہا تھا۔ میں چند لمحوں تک سناٹے میں ڈرتا رہا۔ بانو کو سکتہ بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔۔۔ بانو کے لبوں کا تبسم مجھ پر بجلی بن کر گر رہا تھا۔

مجھے اپنے آپ پر بڑی حیرت ہوئی بہت زیادہ تعجب ہونے لگا۔ میں نے ایک ایسی حقیقت کو کیوں کر اور کیسے فراموش کر دیا تھا۔ بانو نے مجھے بتایا بھی تھا کہ اس پر اتنی ساری افتاد اس لیے آن پڑی تھیں کہ اس کی کوکھ میری نشانی پلنے لگی تھی۔ میرے وجود کے جنم نے اسے ذلت و رسوائی کے دلدل میں دھکیل دیا تھا۔۔۔ آخر مجھے اس ہستی کا خیال کیوں نہیں آیا تھا؟ کیا میں بانو کو پانے کے لیے اس قدر خود غرض کیوں بن گیا؟ تب ایک خیال میرے ذہن میں شعلہ بن کر لپکا۔

"کیا پارو میری بیٹی ہے؟"

میں نے اپنے سینے میں پھڑپھڑاتے ہوئے زخمی دل کو قابو میں کیا اور گہری سانس لے کر پوچھا۔

"کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ میں اس کا باپ ہوں؟ اٹھارہ برس کے بعد گاؤں لوٹ آیا ہوں؟"

"نہیں۔۔۔" اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ وہ بھونچکی ہو کر بولی۔ "تمہیں کیوں کر احساس ہوا کہ پارو تمہاری بیٹی ہے؟"

"ایک لمحاتی حادثہ نے مجھے اس سے ملایا۔ ایک ان جانے جذبے نے مجھے پارو سے بے حد قریب کر دیا تھا۔" میں نے جذباتی آواز میں کہا۔ "شاید پارو نے بھی اپنے دل کی اتھاہ گہرائی میں بھی ایسا ہی جذبہ محسوس کیا تھا۔۔۔ اس نے ایک سگی بیٹی کی طرح دن رات میری تیمارداری کی بلکہ اس سے بڑھ کر خدمت کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو شاید میں دنیا میں موجود نہ ہوتا۔۔۔ کاش! اس وقت مجھے معلوم ہوتا کہ یہ میرا خون ہے اور ہماری محبت کی نشانی ہے۔ میں اسے اپنے سینے سے لگا لیتا۔ اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے سے جدا نہیں کرتا۔"

بانو لمحہ بھر کے لیے کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو گئی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن میں کشمکش ہو رہی ہے۔ وہ شاید اس بات پر بھی حیران تھی کہ میری پارو سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ کاش! ایسا نہ ہوتا۔ اس نے اپنی گھنی سرمگیں پلکیں اوپر اٹھائیں تو اس کا لہجہ بے حد خطرناک اور سنبھلا ہوا تھا۔ دو دھاری تلوار کی طرح ہو رہا تھا۔

"تمہارے دل میں اس کے لیے اتنی محبت اور خون اس قدر جوش مار رہا ہے لہٰذا اب میں نے تمہیں اذیت سے تڑپا تڑپا کر مارنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ تم زندگی بھر اپنی بیٹی کو یاد کر کے روتے رہو گے۔۔۔ اس سے ملنے کے لیے ترستے اور تڑپتے رہو گے۔۔۔ میں پارو کو اعلا تعلیم کے بہانے امریکہ بھیج دوں گی۔ پھر تم کبھی بھی اس کی گرد نہ پا سکو گے۔۔۔"

"تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتیں۔۔۔" میں نے ہیجانی انداز سے چیخ کر کہا۔ "میری بیٹی ہے وہ۔۔۔ میرا خون ہے۔۔۔ میرا دل ہے۔ لخت جگر ہے۔"

"مجھے تمہارے اس خون سے کوئی ہم دردی اور محبت نہیں ہے۔" اس نے نخوت سے کہا۔ "اس سے نفرت ہے۔ کاش۔۔۔! میں نے اس کے پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیا ہوتا۔۔۔ کسی ندی، تالاب یا گٹر میں پھینک دیا ہوتا۔۔۔ میں آج سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ آخر اسے کیوں اور کس لیے زندہ رکھا؟ آخر اس کی کس لیے پرورش کی؟ میری ممتا نے کس لیے جنم لیا تھا؟ کیا اس دن کے لیے وہ اپنے باپ کے لیے پاگل ہو جائے؟"

بانو نے مجھے مزید کچھ کہنے کا کوئی موقع نہیں دیا۔ اس نے مجھے جیسے کرب ناکی کی دلدل میں پھینک دیا۔

وہ اپنی ایڑیوں کے سہارے تیزی سے کتوں کی طرف گھوم گئی۔ انداز بڑا شاہانہ تھا۔ ایک مہارانی کی طرح۔۔۔ اس نے اپنے مخصوص لہجے سے ایک ایسی آواز نکالی جو شاید جانور ہی سمجھتے تھے اور پھر اپنے خوب صورت ہاتھ سے واپسی کا اشارہ کیا تو وہ سارے درندے جدھر سے آئے تھے لوٹ گئے اور ان کی رفتار تیز تھی۔

بانو نے بھی اپنے محافظوں کے ساتھ اس راستے سے واپس ہو گئی۔ جس راستے سے آئی تھی۔ وہ کچا اور

ناہموار راستہ تھا جس سے آدمی گزر کے بیرونی دروازے پر جاتا تھا جب کہ کتے عقبی راستے سے آئے تھے۔ کھیتوں جھاڑیوں اور پگڈنڈیوں سے آئے تھے۔

میں اپنی جگہ پتھر کا مجسمہ بنا کھڑا رہ گیا۔ مجھ پر جیسے موت کا وحشت ناک سناٹا طاری تھا۔ میں پتھرائی آنکھوں سے بانو کو جاتے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے سراپا اور تناسب میں بجلیاں کوندرہی تھیں اور ایک عجیب سی لچک تھی جو دل میں ایک ان جانی حسرت کو جنم دے رہی تھی کہ کاش میں اسے آغوش میں لے پاتا۔ میں نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ اس وقت بانو کمرے میں تنہا ہوگی۔ میں اس کے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر کے اپنی محبت کی جذباتی کیفیت سے اس کے تن پر کچھ نہ رہنے دوں گا اور اسے بے بس کر کے باہم پیوست ہو جاؤں گا اور اسے کسی محاذ کی طرح فتح کرلوں گا۔ اس وقت وہ مزاحمت کرسکے گی اور نہ ہی کمرے سے نکال سکے گی۔ اس کے محافظ اور کتے بھی بے بس باہر کھڑے ہوئے ہوں گے۔ فتح یقینی میری ہوگی اور وہ سب کچھ ہار جائے گی۔ جب وہ اپنا سب کچھ سونپ دے گی تو مجھ سے محبت کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس کی سوئی ہوئی محبت جاگ جائے گی۔ جب عورت ہار جاتی ہے تو اس کے پاس پھر رہ کیا جاتا ہے؟ میں نے گاؤں پہنچ کر ابوبکر کا دماغ جھنجھنا دیا۔ وہ ششدر سا ہو گیا۔ اسے پہلے تو میری کہانی کے کسی لفظ پر یقین نہیں آیا۔ پھر اس نے چونک کر اور بے یقینی سے چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کہیں ایسا تو نہیں دوست.....! بانو نے تمہیں ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کے لیے جھوٹ بولا ہو؟"

"اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی.....؟" میں نے کہا۔ "میں نے جس لڑکی کا تم سے ذکر کیا تھا کہ جس کے سبب مجھے نئی زندگی ملی وہ میری بیٹی نکلی..... جس محبت اور چاہت سے اس نے میری تیمارداری کی اور میرا ہر لمحہ میرا خیال رکھا وہ ایک بیٹی سے بڑھ کر تھا..... ایک انجان لڑکی ایک اجنبی شخص سے کیا ایسی محبت اور بے غرض جذبے سے پیش آسکتی ہے؟ آخر کس چیز نے اسے میری بے لوث خدمت کرنے پر مجبور کیا..... جب کہ ہم دونوں کے بظاہر کوئی رشتہ نہ تھا نہ صلے کی کوئی تمنا تھی اور ستائش کی..... میں اس لڑکی کے جذبے کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچتا رہا ہوں۔"

"یہ خون کی کشش تھی جس نے تم دونوں کو ایک دوسرے کی طرف مائل اور قریب کیا..... وہ پدری محبت کی بھوکی تھی اور تمہیں بیٹی کی.....! خون کی کشش نہ ہوتی تو وہ اس پر خلوص جذبے سے کام نہ لیتی۔" ابوبکر نے کہا۔ "خون بھی کیا چیز ہے؟"

"اگر میرے علم میں ہوتا کہ بانو نے ایک بیٹی کو جنم دیا ہے تو اسے میں اپنی بیٹی ہی سمجھ لیتا۔" میں نے کہا۔

"کیا اس کے بارے میں کچھ علم ہے کہ وہ کہاں ہے؟" ابوبکر نے پوچھا۔ "عجیب سی بات ہے کہ وہ لڑکی گاؤں میں کسی کو کبھی کیوں نہ نظر آئی؟"

ابوبکر کتنی دیر تک اپنے ذہن کے گوشوں میں کسی تدبیر کو پانے کے لیے بھٹکتا رہا کہ بانو کو کس طرح زیر کیا جاسکتا ہے؟ وہ اپنی ہر تدبیر پر مجھ سے صلاح مشورہ کرتا رہا لیکن اس کی کوئی تدبیر ایسی نہ تھی جو قابل عمل اور بے عیب ہو۔ ہر تدبیر میں کوئی نہ کوئی جھول تھا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ پارو اب بھی اس جگہ موجود ہو اور ہم کیوں نہ وہاں جا کر اسے دیکھ آئیں؟" ابوبکر نے تجویز پیش کی۔ "چلو گے کیا.....؟"

"شاید وہ حویلی میں ہو؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "وہ ایک پراسرار لڑکی ہے ورنہ میرے ساتھ ایسی حرکت نہ کرتی۔"

"اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا؟" ابوبکر بولا۔ "بانو کے علم میں سارے واقعات ہوں گے۔ اس نے پارو کو تمہاری نگہداشت پر اس لیے مامور کیا کہ تم صحت مند ہو کر گاؤں آؤ تاکہ تم سے انتقام لے سکے۔ اس نے اپنی بیٹی کو تاکید کی ہوگی کہ وہ کسی کو اس کے اور اپنے بارے میں نہ بتائے۔ اس لیے پارو نے تمہیں اپنی ماں اور حویلی کے بارے میں نہیں بتایا اور اس بات

سے احتراز کیا۔"

دوسرے دن ابوبکر نے ایک موٹر بوٹ کا بندوبست کیا۔ ہم دونوں اس جگہ پہنچے جہاں میں پارو کی زیر نگرانی میں زیر علاج رہا تھا۔ وہاں کچھ ٹیلے تھے جن پر مکان بنے ہوئے تھے۔ تاہم میں نے کچھ چیزوں کی مدد سے وہ جگہ شناخت کرلی۔ جب ہم اوپر پہنچے تو وہ مکان مقفل تھا۔ میرے ساتھ چونکا دینے اور سنسنی خیز اور عجیب و غریب واقعات قدم قدم پر پیش آرہے تھے۔ میں بددل ہو کر رہ گیا تھا۔ میں جذبوں کی ایک ایسی آگ میں جلنے لگا تھا کہ اس سے پہلے کبھی اپنے سینے میں ایسی آنچ بھی محسوس نہیں کی تھی۔ میں اب کیپٹن سراج بیگ نہیں تھا بلکہ ایک باپ اور شوہر تھا.... میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ میں اپنے خون سے محروم ہوگیا تھا۔

ابوبکر اور میں نے ایک دن حویلی کے قرب و جوار میں سارا دن بیٹھ کر پارو کا انتظار کیا اس امید پر کہ شاید وہ دکھائی دے دے۔ وہ حویلی میں دن رات قید ہو کر رہنے سے رہی۔ نوجوان لڑکی ہے کسی کام سے نکلتی تو ہوگی....

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میرے لیے ایک ایک دن برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ میں چوتھے دن رات کے گہرے سناٹے اور اندھیرے میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر حویلی پہنچا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ راستے میں کوئی کتا پہرا دیتے ہوئے نہیں ملا۔ میں نے بہت سنبھل کر اور محتاط انداز سے راستہ طے کیا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر اس حویلی کے عقبی چور راستے سے حویلی میں داخل ہوگیا۔

رات زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ اندر کا گہرا سکوت بتا رہا تھا کہ حویلی کے مکین جلدی سو گئے ہیں۔ راہ داریاں ہول سناٹے میں ڈری ہوئی تھیں اور ایک دہشت ناک پراسراریت ہر سمت برس رہی تھی جس سے دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ دہشت کتوں کی تھی کہ کہیں کوئی کسی کمرے سے میری بو سونگھ کر باہر نہ نکل آئے۔ وہ ایک اجنبی کی بو پا کر بھونک سکتے تھے۔ پھر بھی میں دبے پاؤں بے آواز چل رہا تھا۔ ان کمروں سے جہاں کتے بندھے ہوئے تھے غرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن میری پدرانہ محبت کہہ رہی تھی کہ پارو حویلی کے کسی کمرے میں موجود ہوگی.... گہری نیند میں غرق اس سنسان رات میں جگمگاتے سپنوں کی رنگین اور حسین وادیوں میں کھو گئی ہوگی۔

میں بالائی منزل کی اس خواب گاہ کی طرف کس قدر احتیاط سے دبے پاؤں بڑھا جس میں بانو کی رہائش گاہ کا گمان تھا۔

راہ داریاں سنسان اور ہولناک ویرانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں اس خواب گاہ کے دروازے کے پاس پہنچ کر اور کان دروازے سے لگا دیے۔ کمرے کے اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسا لگا کہ گہری سانسیں لی جا رہی ہوں۔

یک بارگی میرے جی میں آیا کہ ایک دم پارو کا نام لے کر چیخنا شروع کردوں۔ پارو بیٹی! تم کہاں ہو....؟ میں تمہارا باپ ہوں.... میری بچی آجاؤ.... میرے سینے میں جلتی آگ ٹھنڈی کردو.... لیکن میں جانتا تھا کہ یہ آواز صدا بہ صحرا ثابت نہ ہو.... اگر یہاں پارو ہو تو کسی بات کا خطرہ نہ ہوگا.... اگر نہ ہوئی تو پھر میری موت واقع ہوگی۔

میں نے اس خیال کو ترک کردیا۔ میں نے دروازے کے ہینڈل کو غیر محسوس طریقے سے گھمایا اور بڑی احتیاط سے دروازے کو اندر کی طرف آہستہ سے دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ مقفل نہیں تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کردیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔

کمرے میں چاندی کے ایک بڑے شمع دان میں موم بتی جل رہی تھی جو کمرے کے وسطی میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی روشنی کمرے میں چاروں اطراف پھیلی ہوئی تھی.... ایک گوشے میں اتنی بڑی مسہری تھی کہ اس کے بستر پر بیک وقت چار پانچ آدمی با آسانی دراز ہو سکتے تھے۔ الماری، بڑی سنگار میز اور تخت جس پر پھول دار خوب صورت چادر بچھی ہوئی تھی۔ پھول دار

غلاف گاؤ تکیے پر چڑھا ہوا تھا۔ مسہری کے پاس عقبی کھڑکی کے پردے اتنے بڑے تھے کہ چھت سے فرش تک پہنچ رہے تھے اور عقبی کھڑکی ان کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ اس کمرے سے ملحق غسل خانے سے پانی گرنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ بانو شاید غسل خانے میں تھی۔

میں نے دیکھا کہ غسل خانے کا دروازہ اس قدر کھلا ہوا کہ اس میں روشنی ہو رہی ہے۔ بانو نے ایک بڑی موم بتی ایک طرف غسل خانے میں رکھی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں وہ غسل کر رہی تھی اور اس کے بدن پر کوئی پردہ نہ تھا۔ فطری حالت میں تھی۔ ماضی میں ہم دونوں ساتھ نہاتے تھے۔ کل کی بانو میں اور آج کی بانو میں نمایاں فرق تھا۔ وہ ماضی میں ایک کچی کیری کی طرح تھی اور آج ایک پکے رسیلے آم کی طرح.... ایک عجیب سا تیکھاپن اور گداز اس کے سراپا اور نشیب و فراز میں ابل رہا تھا' سنہرا موقع تھا۔ میں نے سوچا کہ میں اپنا لباس اتار کر غسل خانے میں گھس جاؤں اور اسے اسی حالت میں گود میں اٹھا کر بستر پر لے آؤں۔ وہ خیں خیں کرتی رہے گی اور میں ہر طرح سے اس سے سرفراز ہونے لگوں گا۔ باہم پیوست ہو کر اسے انجان دنیا میں لے جاؤں گا۔

اس سے پہلے کہ میں اپنے ارادے پر عمل کرتا میں نے اچانک راہ داری میں پیروں کی آہٹیں گونجتی محسوس کیں تو ایسا لگا کہ جیسے کوئی اس طرف آ رہا ہو۔ کاش! یہ نہ آتا ہوتا یا پھر اس وقت آتا جب میں نے اپنے دل کے سارے ارمان ایک ایک کر کے پورے کر لیے ہوتے اور کوئی حسرت باقی نہ رہنے دی ہوتی۔ میں سراسیمہ پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ اس کمرے میں بھی ایک محفوظ گوشہ تھا اس طرف گھرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے دونوں پردے ملا کر انہیں اس قدر سرکایا کہ وہ باہم مل جائیں اور میں ایک آنکھ سے جھری بنا کر جھانک سکوں۔ اس اثنا میں بانو نے غسل خانے کا دروازہ بند کر لیا۔ وہ نہاتے وقت مجھے اس لیے نہ دیکھ سکی تھی کہ اس کے منہ پر صابن لگا ہوا تھا۔ نہ ہی اس نے میری آہٹ سنی۔ اس لیے کہ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ میں اس وقت حیرانی سے سوچ رہا تھا کہ کون آیا ہو گا؟ دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ پارو اندر داخل ہوئی.... میری بیٹی.... میں نے اسے چونک کر حیرت اور خوشی سے دیکھا۔ میرے سینے میں طوفان بپھرنے لگا۔ آنکھوں میں آرزوئیں بھرنے لگیں۔ پھر نس نس میں لہو جوش میں آ گیا۔

میں نے سوچا کہ پردے سے باہر آ کر اسے بیٹی کہہ کر سینے سے لگاؤں.... پدری محبت کی آگ جو دل میں لگی ہے اسے بجھاؤں لیکن وقت کی نزاکت نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ اس خیال نے مجھے روکا کہ پارو کے جانے کے بعد میں بانو کو قابو میں کر کے بے بس کر دوں گا۔ پھر ہم دونوں نشاط انگیز لمحات میں ڈوب جائیں گے۔ پھر میرے دل میں جو تمام ارمان بھرے ہوئے ہیں ان میں ایک بھی باقی نہ رہے گا۔ پارو نے جس انداز سے کمرے کا جائزہ لیا اس نے مجھے نہ صرف مشکوک بلکہ چونکا دیا تھا۔ اس کی یہ حرکت مجھے پراسرار لگی کیونکہ وہ دوسرے لمحے تیزی سے الماری کی طرف بڑھی تھی۔ اس نے الماری کھولنے سے پہلے غسل خانہ کی طرف دیکھا اور پھر چوروں کے انداز سے الماری کھول کر کوئی چیز نکالی۔ جب اس نے الماری بند کی تو دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا لیکن جدید ترین آٹومیٹک پستول تھا۔

دوسرے لمحے وہ مجھے بے حد خطرناک اور پراسرار سی لگی۔ اس نے پستول گریبان میں رکھا اور اس پر ساڑی کا پلو اسی طرح پھیلا لیا کہ پستول نظر نہ آ سکے اور پھر اس نے سنگھار میز کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جائزہ لیا کہ کہیں پستول نظر تو نہیں آتا ہے؟

میری آنکھیں حیرت اور ان جانے خوف سے پھٹنے لگیں کہ پارو نے اپنی ماں کی الماری سے پستول کس لیے نکالا ہے؟ آخر اسے کس چیز کا خطرہ ہے؟ اگر کسی بات کا خطرہ تھا تو وہ اپنی ماں سے پستول مانگ سکتی تھی؟ چرایا کس لیے اور کیوں؟ اس حویلی میں جانے کیسے

کیسے اسرار پوشیدہ ہیں۔۔۔؟ آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟

یہ سب کچھ سوچ سوچ کر میرا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ دل کے کسی گوشے میں ایک نامعلوم سا خوف کسی سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی کوئی سنگین اور لرزہ خیز واقعہ پیش آنے والا ہے۔ پارو کا چہرہ اس وقت سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ بانو غسل خانہ سے باہر آئی۔ وہ نہا کر نکلی تھی۔ اس کی بھیگی بھیگی زلفیں اس کی مخملیں شانوں پر دراز تھیں اور اس وقت میں بہت حسین دکھائی دی۔ وہ روز بروز جیسے جوان ہوتی جارہی تھی اور اس پر نوجوان دوشیزہ کا دھوکا ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی تازگی اور شادابی تھی۔ دل کر رہا تھا اس کے رخساروں کی ساری شادابی اور ہونٹوں کا رس اپنے ہونٹوں میں جذب کرلوں۔

پارو نے بڑی ناگواری سے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے بڑی بے زاری سے پوچھا۔

"کیا آپ نے مجھے بلایا ہے؟ آپ صبح بھی ناشتے کی میز پر بات کرسکتی تھیں آپ نے خواہ مخواہ میری نیند خراب کردی؟"

"ہاں۔۔۔" بانو نے اپنا خوش نما سر ہلاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "اس وقت بلالیا تو کون سی قیامت آگئی؟"

"ایسا کیا ضروری کام تھا جو صبح تک صبر نہ ہوسکا؟" پارو نے تیز لہجے میں کہا۔ "آپ کو کسی کے آرام کا خیال کیوں نہیں رہتا؟"

"ہاں بہت ضروری کام تھا۔" بانو نے زہر خند کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ سورج نکلنے سے پہلے تم یہاں سے ڈھاکا روانہ ہوجاؤں۔"

"وہ کس لیے۔۔۔؟" پارو نے تنک کر پوچھا "میں کچھ دنوں پہلے تو وہاں سے آئی ہوں اور ابھی میری دس دن کی چھٹیاں ابھی باقی ہیں۔ اس وقت تو ہاسٹل میں ایک لڑکی بھی نہیں ہوگی۔ وہاں جاکر میں پاگل ہوجاؤں گی۔"

"وہاں تمہارا پاسپورٹ، ہوائی جہاز کا ٹکٹ اور سفری کاغذات تیار ہوں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ جتنا جلد ہوسکے سوئٹزرلینڈ چلی جاؤ اور وہاں تم اپنی تعلیم مکمل کرو۔ میں پندرہ بیس دن بعد آجاؤں گی۔"

"میں سوئٹزرلینڈ تو کیا امریکہ بھی نہیں جاؤں گی۔" پارو نے پھر تنک کر کہا۔

"کیا کہا۔۔۔؟" بانو کے لہجے میں حیرت اور غصہ عود کر آیا۔ "تم وہاں جاکر تعلیم حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ تمہاری خواہش پر وہاں کی یونی ورسٹی میں تمہارا داخلہ کرایا گیا اور اب تم وہاں جانے کے لیے انکاری ہو۔"

"اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔" اس نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ "اب میں اسی گاؤں میں رہوں گی اور جاری سال یونی ورسٹی میں داخلہ لوں گی اور ڈھاکا شہر بھی کسی قیمت پر نہیں جاؤں گی۔۔۔ آپ سن لیں۔۔۔؟"

"وہ کس لیے۔۔۔؟" بانو کا پارہ چڑھ گیا اور اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"اس لیے کہ میرے پیارے پیارے ابو لوٹ کر آنے والے ہیں۔" پارو نے بڑے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"کیا۔۔۔؟" بانو بری طرح چونکی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ اس نے سنبھل کر تیز لہجے میں پوچھا۔ "کس نے کہا۔"

"سپنا نے۔۔۔" پارو نے جواب دیا۔

"سپنا؟ کیا یہ تمہاری کوئی سہیلی ہے؟ اس کے علم میں یہ بات کیسے آئی؟" بانو نے چکرا کر کہا۔

"نہیں سپنا نام کی میری کوئی سہیلی نہیں ہے۔" پارو مسکرادی۔ "میں اس سپنا کی بات کر رہی ہوں جو میں نے دو دن پہلے دیکھا تھا۔"

"کیا سپنا دیکھا تھا تم نے۔۔۔؟" بانو کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"میں نے وہ سپنا دیکھا جو ہر شخص دیکھتا ہے آپ جانتی ہیں میں کب سے ابو کا سپنا دیکھتی آرہی ہوں۔

لیکن جب بھی وہ میرے سپنے میں آئے گاؤں آنے کی بات نہیں کی لیکن دو دن پہلے میں نے جو سپنا دیکھا اس میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں بہت جلد گاؤں آنے والا ہوں۔ تم میرا انتظار کرنا.... اس لیے میں ان کا انتظار کروں گی۔ گاؤں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

"ہشت ....!" بانو نے منہ بنا کر تلخی سے کہا۔ "تمہاری عقل ٹھکانے ہے؟ خواب اور سپنے کبھی سچے نہیں ہوتے ہیں۔ بڑے دغاباز ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ کیا ہوا۔ میں نے جو خواب دیکھے تھے وہ کبھی سچے نہیں ہوئے۔ ان کی تعبیر بڑی بھیانک نکلی۔"

میں سچے دل سے دعا مانگتی رہی ہوں کہ میرے ابو سے مجھے ملا دے۔ امی آپ دیکھ لینا۔ میرے ابو ضرور آئیں گے۔"

"ابو....!" بانو تلخی سے بولی۔ "تم برسوں سے اپنے جس باپ کے انتظار میں سلگ رہی ہو وہ کبھی نہیں آئے گا۔ خدا نیک لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ پاپی اور سیاہ کار ہے۔ اسے صرف میری جوانی سے غرض رہی تھی۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ ایک بیٹی کا باپ بن گیا ہے۔"

"امی!" پارو جیسے اک دم سے بلک پڑی۔ "آپ میرے زخم کیوں نہیں دیکھتیں؟ میں کب تک اپنی سہیلیوں کے سوالوں کا گول مول جواب دیتی رہوں گی۔ میرے پیچھے یہ چہ میگوئیاں ہوتی ہیں کہ پروین کا کوئی باپ ہی نہیں ہے۔ کیا کوئی باپ اپنی اولاد سے جدا رہتا ہے؟"

"تم اپنی سہیلیوں سے کہہ دینا کہ تمہارا باپ کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔" بانو نے سفاک لہجے میں کہا۔ "پھر سب کے منہ بند ہو جائیں گے۔" پارو پریشان ہو کر رہ گئی۔ اس پر چند لمحوں تک سکتہ طاری رہا۔ پھر اس نے تڑپ کر ماں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے لپکنے لگے۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخ کر اور مٹھیاں بھینچ کر بولی۔

"آپ نے اس دن یہ بات کیوں نہیں کہی جب میں نے پہلی مرتبہ آپ سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھا تھا.... آپ اسی دن صاف صاف کہہ دیتیں کہ تمہارا کوئی باپ نہیں ہے تم بن باپ کی ہو پھر میں صبر کر لیتی بے غیرت اور بے شرم بن کر جی لیتی۔"

بانو کے سراپے میں یکایک ایک لہر سی اٹھی۔ اس کا پارہ چڑھنے لگا۔ وہ تقریباً چیختے ہوئے بولی۔

"تم اپنی زبان کو لگام دو.... تم مجھے ایک فاحشہ عورت ثابت کرنا چاہتی ہو؟"

"مجھے میرے ابو کا پتا بتا دیں.... میں ان کے پاس چلی جاتی ہوں۔" پارو نے وحشت کے انداز میں بے قراری سے کہا۔ "آپ نے مجھے ماں کہا تو ایک عورت کا بھی پیار نہیں دیا۔ مجھ سے اس لیے نفرت کرتی چلی آ رہی ہیں کہ میں اس شخص کی نشانی ہوں۔"

"تم کبھی اس کی گرد بھی نہیں پا سکو گی۔" بانو کا لہجہ بے رحم تھا۔ "میں اس شخص کو اپنے دل میں ایک حسرت لیے مرجانے دوں گی۔"

"آج آپ کو بتانا ہی ہو گا کہ میرے ابو کہاں ہیں؟" پارو نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"ورنہ کیا؟" بانو پر ایک ہیجان سا طاری ہو گیا۔ "تم اپنی ماں کو دھمکی دے رہی ہو؟"

"آپ میرے اور ابو کے درمیان نفرت کی دیوار کیوں قائم رکھنا چاہتی ہیں؟" پارو کی آواز لرزتی چلی گئی۔

"وہی ہو گا جو میں چاہوں گی۔" بانو نے بڑی رعونت سے کہا۔

"لیکن آج ایسا نہیں ہو گا امی جان!" پارو کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ "میں آج اس نفرت کی دیوار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گرا دوں گی۔ اگر آپ نے کوئی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو اس کا انجام عبرتناک ہو گا۔"

"تم کیا کرو گی....؟" بانو نے زہر بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں.... میں۔" پارو نے جلتی کانپتی آواز میں کہا اور اپنے گریبان سے پستول نکال لیا۔ پھر اس نے لبلبی پر انگلی رکھ دی۔ "آپ برسوں سے میرے ارمانوں کا

خون کرتی چلی آرہی ہیں.... لیکن آج میں آپ کا خون کردوں گی اس لیے کہ اب میں زمانے کے طعنے سن نہیں سکتی۔"

"بانو بیٹی کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر چونکی لیکن وہ ذرا برابر بھی نہیں گھبرائی بلکہ اپنی تمکنت سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔ پھر وہ نفرت سے بولی۔

"موت بھی میری زبان نہیں کھلوا سکتی.... میں آخری سانس تک تمہارے باپ کے بارے میں نہیں بتاؤں گی۔ اگر تمہیں میری آزمائش کوئی حسرت دل میں ہے تو پوری کرلو۔"

پارو کی آنکھوں میں درندگی جنون بن کر ابھرنے لگی۔ چہرے پر سفاکی نے جگہ لے لی۔ اس نے ماں کو نشانے کی زد میں لے لیا۔ اس کے مرتعش ہاتھ میں پستول کانپ رہا تھا۔ میں پردے کے پیچھے سے بجلی بن کر اس کی طرف لپکا اور ہیجان لہجے میں چیختا گیا۔

"پارو میری بیٹی! رک جاؤ' رک جاؤ....."

مجھے لحظہ بھر کی تاخیر ہو چکی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ پستول نے ایک ننھا سا شعلہ اگل دیا تھا۔ بانو سینے پر دل کی جگہ رکھ دیا۔ وہ کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح فرش پر دل خراش چیخ کے ساتھ گری۔

پارو نے فائر کرتے ہی میری آواز سن کر اپنی ساری توجہ میری طرف مرکوز کردی تھی۔ اس نے ماں کو زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے گرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے مجھے پھٹی پھٹی اور حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا۔ وہ میری طرف دیوانہ وار لپکی اور ابو کہہ کر میرے سینے سے آلگی۔

"آپ میرے ابو ہیں؟" اس نے خوشی سے لرزاں آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔ ان میں ہزاروں چراغ جل اٹھے تھے۔

"ہاں میری بیٹی! میں ہی تمہارا بدنصیب باپ ہوں.... بیٹی! تم نے بڑی جلد بازی کی۔" میں نے رندھی آواز میں کہا۔ "کاش! تم ایک لمحہ صبر کر لیتیں۔" میں نے پارو کو سینے سے الگ کیا اور اسے لے کر تیزی سے بانو کی طرف تیزی سے بڑھا۔ بانو کا سفید بلاؤز گلابی سینہ اور اس کا ایک ہاتھ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت ناک کرب چھایا ہوا تھا اور وہ اپنا سینہ پکڑے فرش پر تڑپ رہی تھی۔

پارو نے ماں کو خون میں لت پت دیکھا تو وہ ہذیانی لہجے میں چیخی۔ "امی!"

ہم دونوں بانو کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ بانو کے چہرے پر وحشت برسنے لگی۔ وہ تھرتھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"امی..... ! مجھے معاف کردیں.... میں باپ کی تلاش میں اتنی آگے نکل گئی کہ میری آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی۔ مجھے کچھ بجھائی نہیں دیا تھا۔" پارو بلک بلک کر رونے لگی۔

میں نے بانو کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس پر جھک گیا۔

"میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا میری بانو.....!"

بانو نے ہم دونوں کو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ہم دونوں کو باری باری دیکھا۔ اس کے لب کچھ کہنے کے لیے وا ہوئے.... کپکپائے لیکن اس کے سانسوں نے اس کا ساتھ سدا کے لیے چھوڑ دیا۔ ایک لفظ بھی منہ سے نکل نہ سکا۔ اس نے اپنی آنکھیں پر سکون انداز سے بند کرلیں اور اس کا سر میرے زانو پر ڈھلک گیا۔

پارو نے ایک دہلتی ہوئی چیخ ماری اور بانو کی لاش سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دیر تک ہچکیاں لے کر روتی رہی۔ جب میں نے اسے بانو کی لاش سے الگ کیا تو وہ میرے سینے سے لگ کر بلکتی ہوئی بولی۔

"ابو! میں کس قدر بدنصیب ہوں۔ میں نے ایک کھوئی ہوئی ایک نایاب چیز پا کر دوسری انمول شے کھو دی۔" میں نے اس کے ہاتھ سے پستول لے کر جیب میں رکھ لیا۔

میں پارو کو اس وقت یہ بتانا چاہتا تھا کہ جب میں بانو کے قتل کا الزام اپنے سر لے کر خود کو قانون کے حوالے کردوں گا تو وہ اتنی بڑی دنیا میں تنہا رہ جائے گی۔

✡ ✡

خونی رات

عمارہ خان

سسپنس اور ایڈونچر سے بھرپور ایک خوانی رات کا احوال ایک بے بس اور مجبور شخص کی سر گزشت۔ قبرستان میں ہونے والے خوفناک اور لرزہ خیز واقعات۔

غیر متوقع انجام جو آپ کو ہنسنے پر مجبور کر دے گا۔



وہ پرندہ مجھے دیکھ کے ایک دم میری سمت اڑان بھرنے کے انداز میں جھکا۔ اس کے کالے پنجے اور عجب طوطے کی طرح مڑی چونچ دیکھ کے ہی میری سٹی گم ہو گئی تھی۔

اب جب کہ وہ میری سمت ہی آرہا تھا تو میرا بھاگنا بنتا تھا سو میں نے آؤ دیکھا نا تاؤ اور ناک کی سیدھ میں بھاگ لیا۔

آپس کی بات ہے، ناک کی سیدھ میں ہی بھاگا جاسکتا تھا کیونکہ ایک سمت اجاڑ قبرستان کی ٹوٹی ہوئی دیوار تھی تو دوسری طرف جنگل کی سرحد شروع تھی جو رات کے اس سمے قبرستان کی ہی ٹکر کا بھیانک لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا دم اکھڑتا میرے سر کے عین اوپر پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز آئی اور میں بروقت جھک گیا ورنہ شاید وہ شیطان صفت پرندہ جو بال سمیت مجھے اٹھانے پہ قادر لگتا تھا وہ لازمی اپنی مڑی ہوئی لمبی چونچ سے مجھے زخمی کر دیتا میں ہانپتے کانپتے جیسے ہی اس سیدھی ٹوٹی پھوٹی روڈ تک گیا چاروں طرف ایک دم اندھیرا سا چھا گیا۔

میں نے بے ساختہ اوپر دیکھا تو وہ چاند جو تھوڑی دیر پہلے چمک رہا تھا اور محبوبہ نمبر تین یعنی چندا کی یاد دلا رہا تھا، اب ایزی لوڈ یعنی میرے رقیب جیسی حرکتیں کرتا ٹیکسوں یعنی بدلیوں میں گھرا ہوا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک دم غائب ہو گیا ساتھ ہی میرے پیروں تلے زمین بھی غائب ہو گئی اور میں دھڑام سے کسی کھلے ہوئے کھڈے میں گر گیا جو شاید کسی کی قبر تھی لیکن اس وقت میرے لیے میرے بچاؤ کا واحد ذریعہ بنے جا رہی تھی۔۔۔

میں نے ایک لاچاری نظر اوپر آسمان کی سمت کی اور جیسے بے آواز التجا کی۔

''بادلوں سے وہ ابھی چاند کو نہیں ڈھانپیں۔۔

''لیکن۔۔۔ کیونکہ میرا برا وقت ہی چل رہا تھا تو چاند بھی اپنا نہ تھا اسی لیے رفتہ رفتہ وہ بدلیوں میں چھپتا رہا اور میں دم سادھے ادھر قبر میں پڑا رہا۔۔۔ اور بالآخر ایک دم اندھیرا ہو ہی گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دے رہا تھا اور اب مجھے اس چھلاوے پیری کے لباس کی سرسراہٹ بھی سنائی دینے لگی تھی۔

''بہت ہی ڈھیٹ قسم کی چھل پیری لگتی ہے''

میں نے سوچا۔ جب میں نظر نہیں آرہا تو کسی اور شکار کو تلاش کر لے لیکن نہیں۔۔۔

ہاتھ آیا شکار وہ بھی مردانہ شکار شاید اس کی نسوانی انا کو چکنا چور کرنے کا سبب بن رہا تھا، بے شک منحوس چھل پیری ہی سہی، تھی تو زنانہ نا۔ اسی لیے پورے شدومد سے وہ مجھے تلاش کرنے پہ تلی ہوئی تھی، کہیں اس کی ناک نا کٹ جائے، اپنی چھل پیریوں کے خاندان میں، اور اس کے بال بچے اپنے بال بچوں کو کہانیاں سنائیں، کیسے ایک "مرد" اس کے مڑے ہوئے پاؤں سے بچ کے نکل گیا،

''ہنہ یہ عورت ذات بھی۔''

ایک طرف میں بے چارہ اس بے تکے پرندے سے بچنے کی کوشش میں ہلکان ہوا جا رہا تھا تو دوسری طرف وہ اپنے سفید لبادے کو لہراتی بل کھاتی چھل پیری میری ننھی سی جان کو ڈھونڈنے میں لگی ہوئی تھی، عجیب ہی کو صورتحال تھی گویا۔

☆☆☆

اب میں اس کھڈے میں خاموشی سے لیٹا اس چھل پیری کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا کہ ایک دم خطرناک آواز سے بادل گرجے اور میرے اوسان خطا ہو گئے شکر ہے کہ صرف اوسان ہی خطا ہوئے ورنہ تو۔۔۔ خیر۔۔۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں، ویسے نا بھی کرتا تو کچھ نظر نہیں آرہا تھا بس اپنے دل کی تسلی کے لیے آنکھیں میچ کے خوف سے تھرتھرانا مناسب جانا۔

لمحے بھر کے وقفے سے جب کوئی سرسراہٹ اور پھڑپھڑاہٹ نہیں سنائی دی تو میں نے چپکے سے پہلے آنکھوں کی ایک جھری سے کھڈے سے اوپر تاکہ جھانکنے کی کوشش کی،

کیونکہ بالآخر چاند میاں کو مجھ پہ ترس آ گیا تھا، وہ بدلیوں کو پچھاڑ کے باہر نکل کے میرے لیے خضر بن چکے تھے۔

آہستگی سے دونوں آنکھوں کو ممکن حد تک کھول کھال کے میں نے اس قبر سے اوپر کی طرف جھانک کے ان دونوں نامعقول دشمنوں کو دیکھنا چاہا جو بلاوجہ میری معصوم جان کے پیچھے پڑ گئے تھے، لیکن کچھ خاص نظر نہیں آیا تو جان ہتھیلی پہ رکھ کے میں نے کھڈے سے باہر نکلنے کی جستجو کی۔

بڑی مشکل سے اونچی نیچی گھاس کو پکڑ کے کھینچ تان کے میں کسی طرح باہر نکل ہی آیا۔ لیکن اب مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کس طرف کو جاؤں کہ جان کی امان پاؤں۔

ایک دم مجھے زمین پہ کچھ رینگنے کی سی آواز آئی،

''یا اللہ۔۔۔''

میں کراہ سا اٹھا، اب کون سی نسل کی بلا رہ گئی جو اس وقت نظر آنا ضروری ہے۔

جنات اور پرند تو پیچھے پڑے ہی ہیں، شاید کسی مچھلی کی باری رہ گئی، کیا پتا کوئی ڈولفن ہوا میں چھلانگیں لگاتی آئے اور مجھے کیچ کرتی دوبارہ پانی میں ڈوب جائے، اس کی بلا سے پھر مجھے کوئی آکٹوپس جکڑ لے یا جیلی فش یا کوئی سانپ ہوا میں رینگتا رینگتا اچانک لہراتا بل کھاتا مجھ سے چمٹ جائے جیسے میری خواہش تھی۔

محبوبہ نمبر ساڑھے تین کلثوم بانو عرف کلو کے بھرے بھرے جسم سے چمٹنے کی۔۔۔ ویسے ساڑھے تین اسی لیے کیونکہ میرے طرف سے ہاں تھی لیکن اس کی طرف سے فی الحال گھاس نا ڈالنے کا پروگرام جاری تھا۔ مگر ٹرائے اگین ٹرائے اگین کا فارمولا میں اسی وقت کے لیے اپنا حوصلہ بڑھانے کے واسطے دہراتا رہتا تھا۔۔۔

''اوہ آہ توبہ توبہ''

میں نے ایک جھرجھری لیکے فاسد خیالات کو ذہن سے جھاڑا اور ایسے ہی پلٹ کے دیکھا، تو وہ الٹے پیروں والی بلا میرے پیچھے جیسے ہوا میں تیرتی آ رہی تھی۔۔۔ اسی کے واہیات لباس کا جو ایک حصہ پیچھے زمین پہ گھیسٹ رہا تھا جس کی بدولت رینگنے جیسی آواز بلند ہو رہی تھی۔۔۔

خیر میں نے وقت ضائع کیے بغیر، ہوا سے شرط باندھی اور لگا پھر سے بھاگنے،

یہ الگ بات ہے کہ بھاگتے بھاگتے میرا سانس پھول چکا تھا۔۔۔ ٹانگوں کا ستیاناس ہو چلا تھا، ہوا کی کمی سے پھیپھڑے الگ دہائی دے رہے تھے لیکن لگتا تھا وہ لڑکی نما چڑیل یا چڑیل نما لڑکی پیدا ہی میرا خون پینے کے لیے ہوئی تھی کچھ بھی ہو جائے وہ میرا خون پی کے دم لے گی۔۔۔ کچھ بھی تھا میری جان کی دشمن بنی ہوئی تھی وہ اور بے دم ہوتے میں کوس کے رہ گیا اس وقت کو جب شارٹ کٹ کے چکر میں قبرستان والی گلی کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن اب مجھے بھی کیا معلوم تھا لیلی سے ایک دلفریب ملاقات کے بعد کسی ڈائن سے ملنا پڑ جائے گا۔۔۔

کاش میں اس " پان گلکے " والی شاپ کے پاس کھڑی اس حسین لڑکی کو دیکھ کے لفٹ دینے کے چکر میں بائیک نہیں روکتا تو شاید اس وقت اپنے گھر بیٹھا نائٹ پیکج کے تحت لیلی سے باتیں کر رہا ہوتا۔۔۔

لیکن یہ نا تھی ہماری قسمت کے تحت ابھی تو صرف میں اپنے دو پیروں سے جتنا بھاگ سکتا تھا بھاگ رہا تھا، مگر عنقریب میرا دم مزید اکھڑنے لگ جاتا اور میں اس ویرانے میں ایک چھل پیری کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا ہوتا۔۔۔ اور کچھ ہی عرصے بعد لیلی کسی اور مجنوں کی لیلی بنی مجھے بھول چکی ہوتی۔

" ارررر ہیہ یہ کیا"

ایک دم میرا پاؤں کسی جھاڑی میں پھنسا اور میں سیدھا ایک اور ٹوٹی ہوئی

بوسیدہ سی قبر کے اندر جا پہنچا۔۔۔ سامنے ہی کسی انسان کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔۔۔

وہ بھی یقیناً اس وقت مجھے اپنا پڑوسی بنا دیکھ

کے حیران ہو رہا ہوگا۔۔ رات کے دو بجے کون قبرستان کے اندر آ سکتا تھا بھلا۔۔

اب میں سکتے میں تھا اپنے پاس پڑے ڈھانچے سے نظریں ہٹانے کی ہمت نہیں جتا پا رہا تھا اور میرے پیچھے جو بلا لگی تھی وہ یقیناً مجھے ڈھونڈ رہی تھی کیونکہ اس کے سفید لبادے کی سرسراہٹ مجھے صاف سنائی دے رہی تھی کہ اچانک۔۔۔

اچانک ایک مکروہ چیخ نے میری بھی چیخ نکلوادی،

یقیناً اس بدشکلے پرندے نے بے حد نیچی اڑان بھری تھی، کیونکہ اس کے پروں کی آواز مجھے صاف سناء دے رہی تھی، لیکن اگر اس وقت وہ اس چھل پیری کو جان سے مارتے ہوئے خود بھی مر جاتا تو شاید میں اس کے نام کا ایک شاندار کتبہ بنا ڈالتا۔اور جیب اجازت دیتی تو اس کے نام کا کوئی اچھا سا عرس بھی کر ڈالتا لیکن ان کاموں کے لیے شرط ان دونوں منحوسوں کا مرنا تھا۔۔

لیکن اس وقت مجھے اس بے تکے پرندے پہ شدید خار چڑھی ہوئی تھی جو نجانے کہاں سے آن مرا تھا عین اس وقت جب میں اس چھل پیری سے بچ بچا کے قبرستان سے باہر نکلنے ہی لگا تھا، اس کی وجہ سے واپس قبرستان کی سمت آنے کے بعد اب تو میں راستہ تک بھٹک گیا تھا کہ دائیں سمت جانا ہے یا بائیں سمت، خیر یہ تو معمولی بات تھی ابھی اہمیت ان دونوں میں سے کسی ایک کا مرنا تھا تاکہ میں ناک کی سیدھ میں یا آڑھا ترچھا ہو کے اس جگہ سے تو نکلوں۔یا کم از اپنے پڑوسی ڈھانچے کی تنہائی میں مخل ہونے کی معافی طلب کرلوں،

ایسے ہی نازک صورتحال میں الٹے سیدھے ناپاک خیالات نے مجھے جکڑ لیا تھا اور میں ٹک ٹک دیکدم دم نہ کشیدم، پاس پڑے کسی مرحوم انسان کی باقیات سے نظریں چرانے کی کوشش میں ہلکان ہوا جا رہا تھا۔

ایک دم مجھے لگا ڈھانچے کا بایاں ہاتھ ہل رہا ہے، لو جی جو ایک انچ کی کسر بھی باقی رہ گئی ہوگی وہ اب پوری ہونے جا رہی تھی۔

میں نے سب سے پہلے اپنے چہرے پہ یتیمی طاری کرلی کہ شاید کسی بھوت کو ترس آجائے مجھ پہ اور لرزتے لرزتے اپنے ناتواں جسم کو گھسیٹتے ہوئے ڈھانچے کے پاس سے دور ہونے کی کوشش کی آپس کی بات ہے شدید قسم کے ڈر سے مجھ پہ کپکپی لگ چکی تھی۔تو کپکاتے ہوئے ہاتھ پاوں سے میں نے ڈرتے ڈرتے زیرلب اس لاش جی سے معافی مانگی اور قسم کھائی کہ آئندہ بھی ان کے پاس اس طرح چھلانگ نہیں ماروں گا اور قبر سے اوپر تا کا جھانکی شروع کی جس کی مجھے زبردست پریکٹس تھی۔

”دیکھا بڑے بوڑے ہمیشہ درست بولتے ہیں ہر کام اچھا ہوتا ہے اب اگر میں بچپن سے تا کا جھانکی نہیں کرتا تو اس وقت کیسے ایک مردے کی بغل میں پڑا رہ کے یہ کام ماہرانہ انداز میں کر سکتا تھا“

خیر میں نے اپنی صلاحیتوں پہ پوری طرح یقین رکھتے ہوئے جیسے ہی اوپر جھانکا تو میرا بچا کچا دم بھی بس ایک نکلتے نکلتے رہ گیا۔جی ہاں سامنے بلکل میری دو آنکھوں کے سامنے وہ چھل پیری کی بدشکل سردار اور پرندوں کو بدنام کرنے والا وہ واہیات مڑی ہوئی چونچ کا مالک دنگل کرنے آمنے سامنے بروس لی قسم کا انداز اپنائے کھڑے تھے۔

یقیناً دونوں نے میرے لیے ایک دوسرے کو جان سے مارنے کا فیصلہ لیا ہوگا۔۔

”داہ واہ کیا شاندار قسمت پاء ہے میں نے بھی لوگوں کے لیے خوب صورت لڑکے یا اتفاق سے کچھ لڑکیاں کسی وجاہت سے بھرے لڑکے کے لیے شرط لگاتی ہیں یا ڈوئل لڑا جاتا ہے اور ادھر میرے لیے ایک عدد چڑیل اور ایک عجیب نسل کا پرندہ ڈوئل لڑ رہے تھے۔

میں نے دونوں پہ لعنت بھیجی نا صرف دل ہی

ل میں بلکہ الٹے ہاتھ سے عملی طور پہ بھی اور آہستگی
ے لڑکھڑاتے ہوئے ڈگمگاتے قدموں سے اس قبر
ے باہر نکلا۔ نکلتے ہی ان دونوں کو دیکھا جو اسٹار
س کے کسی پٹے ہوئے ڈرامے کی طرح ابھی تک
ینترے ہی بدلے جا رہے تھے۔۔ تو یہ ہمت نہیں
ہے، تو ایسے خوفناک ماحول میں لڑنے کیوں نکلتے
یں یہ لوگ۔۔ خود کو بمشکل ان دونوں کو جوش
لانے سے روکا اور خاموشی سے رفتہ رفتہ ان سے
ور ہوتا چلا گیا۔

"آہ۔۔۔۔۔شکر ہے"

میں نے جیسے ہی فتو دھوبی کا گدھا دیکھا بے
اختہ اس کے گلے لگ گیا اور مستقل اس کو چومتے
وئے شکر ادا کرتا رہا دس منٹ بعد جب میں اپنے
واسوں میں آیا تو خیال آیا میں کر کیا رہا تھا۔۔

"دفع ہو گدھا کہیں کا"

میں نے ہلکے سا دھکا دیا تو فتو دھوبی کا گدھا
یک دم غصیلی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔۔ میں جو
بھی کچھ وقت پہلے ہی اپنی جان عجیب و غریب
خلوق سے بچا کے آیا تھا اس بچپن سے دیکھنے والے
گدھے کو بھی آسمانی بلا سمجھنے لگا اور فوراً معافی مانگ
کے اس کے سائڈ سے بھاگتا چلا گیا

☆☆☆

مجھے شاید بھاگنے کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ
پنا گھر دیکھ کے بھی پاؤں نہیں رکے۔۔ رکتے رکتے
ں چار چھ گھر کراس کر گیا۔

واپس پلٹتے ہوئے ایک بار پھر میرے کانوں
ں سرسراہٹ کی آواز گونجی اور میں نے پھرتی سے
یب سے گھر کی چابی نکالی اور دروازہ کھولتے ہی
ندر چھلانگ لگا کے گہری گہری سانس لینے لگا

میں شاید اس غلط فہمی میں تھا کہ اپنے گھر ہر قسم
ی آفات سے بچ سکونگا لیکن یہ بھول گیا تھا گھریلو
آفات کا مقابلہ تو پہلوانوں کو بھی مٹی چٹا دیتی ہے
ھ جیسا ڈیڑھ پسلی کیا حیثیت رکھتا ہے

☆☆☆

"پپو کے ابا او پپو کے ابا"

میری آنکھ کانوں کو چھبتی آواز سے کھلی تو
ہڑبڑا کے میں نے ادھر ادھر دیکھا "اٹھ گئے ہو تو
پایے لا دو میں چائے رکھ دوں۔۔ پھر قصائی کو بھی
دیکھ لو۔۔

کل اتنی بار بکواس کی تھی قبرستان والی گلی میں
لوگ دھڑا دھڑا جا کے قصائیوں سے وقت لے رہے
ہیں لیکن تم نے تو بات نا سننے کی قسم کھا رکھی ہے
جیسے۔۔ پوری رات موئی کتاب پڑھتے رہے۔۔
اے آگ لگا دوں گی اب ان کتابوں کو سمجھے کہ
نہیں قصائی۔ قبرستان۔ گلی۔ کتاب۔ بقرعید "اووو
ہووو" اچانک میرے چہرے پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

تو وہ سب ایک خواب تھا میں نے پاس رکھی
کتاب " خونی رات " کو اٹھاتے ہوئے سوچا لیکن
محبوبہ نمبر ایک دو کہاں گئی اور وہ میری ادھوری محبت
میری کلو پری۔

شاید میں پوری طرح جاگا نہیں تھا اسی لیے
ایسے خیالات آ رہے تھے۔

"پپو کے ابا کیا میری آواز نہیں آ رہی
تمہارے کو؟؟"

"آہ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کے ہر سو بکھرتا
چلا گیا اور فوراً سے پیشتر میری یادداشت واپس آ گئی
سامنے سترکلو کی میری ذاتی بیوی اپنی کمرے
جیسی کمر پہ ایک ہاتھ ٹکائے مجھے گھور رہی تھی اور میں
اس میں اپنی تین سالہ پرانی محبوبہ نمبر ساڑھے تین کو
ڈھونڈ رہا تھا جو اے کاش ادھوری محبت ہی
رہتی کم از کم مجھے یاد تو رہتی یہ تو محبوبہ سے سیدھا فل
وقتی بیوی بن کے میرے سینے پہ سانپ بن کے بیٹھ
گئی تھی اور وقفے وقفے سے ڈسنا اپنا فرض سمجھتی تھی

"آہ! کاش وہ چھل پیری لے جاتی مجھے
اپنے ساتھ" میں نے چارپائی کے نیچے اپنے سلیپر
ڈھونڈتے ہوئے سوچا۔

☆☆

بغلی گھونسا

ایچ اقبال

معاشرتی انحطاط اس مقام تک پہنچ چکا ہے جہاں عورت عورت تنہا' بغیر مرد کے زندگی نہیں گزار سکتی' حالات اگر اسے ایسے موڑ پر لے آئیں جہاں اسے اپنی اور اپنے اہل خانہ کی گزر بسر کے لیے روزگار کی تلاش میں نکلنا پڑے تو ہر قدم پر ہوس ناکیاں اس کی منتظر ہوتی ہیں۔ایسی ہی ایک خوب رو لڑکی کی داستان الم جسے ایک خطرناك انسان سے واسطہ پڑ گیا تھا اور وہ اس سے نجات کے لیے ایک طاقت ور سہارا دھونڈنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

معاشرے کی ناہمواریوں سے عبارت ایک ہوس ناک داستان





فرح نے آئینے میں چہرا دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر جو ہلکی سی مسکراہٹ تھی' وہ پل بھر میں غائب ہو گئی اور وہ اپنے منہ سے نکلنے والی چیخ بھی نہیں روک سکی۔

آئینے میں اس کا صرف آدھا چہرا دکھائی دے رہا تھا۔ باقی آدھا چہرا ڈھانچے کی کھوپڑی کی طرح تھا۔ بے اختیار اس کے ہاتھ اپنے چہرے کی طرف گئے۔ وہ اس آدھی کھوپڑی کو اپنے چہرے سے الگ کر دینا چاہتی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" فرنانڈس نے جھپٹ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ "کیا تم میری اتنی قیمتی چیز برباد کر دینا چاہتی ہو؟"

"یہ ہٹاؤ' اسے ہٹاؤ!" فرح ہذیانی انداز میں چیخی۔

"تم اپنے ہاتھ نیچے ہی رکھو۔" فرنانڈس نے سخت لہجے میں کہا۔

"اسے فوراً" الگ کرو میرے چہرے سے۔" فرح اس مرتبہ بھی چیختی ہوئی سی آواز میں بولی۔ اس نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔

"عجیب بے وقوف لڑکی ہو!" فرنانڈس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

فرح اس مرتبہ خاموش رہی۔ اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ پھیلی ہوئی تھی اور دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

فرنانڈس نے بڑی احتیاط کے ساتھ وہ ماسک اتارا جو فرح کے نصف چہرے سے اس کے سر کے پچھلے حصے تک چڑھا ہوا تھا۔ فرح نے جلدی سے آئینے پر نظر ڈالی۔ ان چند لمحوں میں اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کا نصف چہرہ سچ مچ ڈھانچا بن گیا ہو' لیکن جب اس نے آئینہ دیکھا تو اسے اپنا خوب صورت چہرا پورا دکھائی دیا۔ آئینے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ اس ماسک کی طرف دیکھنے لگی' جیسے وہ کوئی شیطانی چیز ہو۔

فرنانڈس نے وہ ماسک اپنے اسسٹنٹ سلمان رضا کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ وہ فرح سے بولا۔ "میں نے تمہیں پہلے یہ بتا دیا تھا کہ میں تمہارے چہرے پر ایک ماسک چڑھا کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے چہرے کے عین مطابق ہے یا نہیں۔"

"آپ نے.... آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ماسک کیسا ہے!" فرح کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔

"میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس ماسک کے ساتھ اپنا چہرا دیکھ کر کیا محسوس ہوتا ہے۔ اب میں مطمئن ہو گیا ہوں۔ لوگ وہ چہرا دیکھ کر یقیناً" خوف محسوس کریں گے۔ میری فلم میں تم یہ ہی ماسک اپنے چہرے پر لگا کر کام کرو گی۔"

"نہیں۔" فرح نے بے اختیار کہا۔ "میں یہ اپنے چہرے پر لگانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"تم وقتی طور پر ڈر گئی ہو۔" فرنانڈس نے اپنا لہجہ نرم کیا۔ "تم سکون سے تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لیے کوئی ٹھنڈی چیز منگواتا ہوں۔"

"نہیں۔" فرح کی آواز کانپ گئی۔ "میں یہ بہروپ نہیں بھر سکتی۔"

"اس بہروپ میں کام کرنے کے بعد تم اپنی پہلی فلم سے مقبولیت حاصل کر لو گی۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہارا چہرا اس ماسک کے عین مطابق ہے۔ تم سے پہلے میں پانچ لڑکیوں کو آزما چکا ہوں اور ان پانچوں کو میں نے اسی لیے مسترد کیا تھا کہ ان میں سے کسی کا چہرا بھی اس ماسک کے مطابق نہیں تھا۔ اب میں باقی چاروں لڑکیوں کا انٹرویو بس رسما" لوں گا۔ تم سمجھ لو کہ میں نے تمہیں اپنی فلم کے لیے منتخب کر لیا ہے۔"

"آپ مجھے منتخب نہ کیجئے۔" فرح ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"میں پھر کہوں گا کہ تم ذرا دیر کے لیے سکون سے ایک طرف بیٹھ جاؤ۔"

"میں جا رہی ہوں۔" فرح بہت تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

"سنو' میری بات سنو۔" فرنانڈس جلدی سے کھڑا

ہوا۔
لیکن فرح دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی۔
وہاں کمرے میں بیٹھی ہوئی باقی چاروں لڑکیوں اور دروازے پر کھڑے ہوئے چپڑاسی نے حیرت سے فرح کو دیکھا جو کمرے سے اس طرح نکلی تھی جیسے بدروحیں اس کے تعاقب میں ہوں اور وہ جلد از جلد ان سے دور نکل جانا چاہتی ہو۔

ماسٹر فلمز کا دفتر اس عمارت کی تیسری منزل پر تھا' جس میں لفٹ بھی لگی ہوئی تھی' لیکن فرح کا دماغ اس وقت اتنا منتشر تھا کہ وہ لفٹ کی طرف جانے کے بجائے تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

نیچے پہنچ کر اس نے سڑک پر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اسے کسی ٹیکسی کی تلاش تھی۔ اسے ٹریفک کے ہجوم میں ٹیکسیاں نظر تو آئیں' مگر ان میں کوئی بھی خالی نہیں تھی۔ فرح فٹ پاتھ پر پیدل ہی چل پڑی۔ وہ جلد از جلد فرنانڈس کے دفتر سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

فرح کے اس طرح چلے جانے سے فرنانڈس کے چہرے پر تکدر دکھائی دیا تھا' لیکن وہ جلد ہی پرسکون ہوگیا۔

"اب کیا کرنا ہے سر!" سلمان رضا نے ادب سے پوچھا۔

"باقی چاروں لڑکیوں کا بھی انٹرویو تو لینا ہی ہے' لیکن میری فلم میں کام فرح ہی کرے گی۔"

"لیکن وہ تو بہت ڈر گئی ہے۔ وہ شاید ہی لوٹے۔"

"وہ ضرور لوٹے گی۔" فرنانڈس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "اور اگر وہ نہیں لوٹے گی تو میں اسے لینے اس کے گھر جاؤں گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ خود ہی آجائے گی۔ نئی لڑکیوں کو کسی فلم میں پہلی بار مرکزی کردار آسانی سے نہیں ملتے۔"

"لیکن وہ بہت ڈر گئی ہے سر۔"

"وہ وقتی بات ہے۔ وہ کچھ زیادہ ہی حساس ہے اس لیے مجھے امید ہے کہ وہ کام بھی اچھا کرے گی۔ اگر وہ تھوڑی دیر یہاں رک جاتی تو اس کا خوف ختم ہوجاتا۔"

"مجھے بڑا تجسس ہوگیا ہے سر کہ آپ اس مرتبہ کس قسم کی فلم بنانا چاہتے ہیں۔ آپ نے پہلے کبھی کوئی خوف ناک فلم نہیں بنائی۔"

"خوف ناک چیز بس اس لڑکی کا کردار ہوگا' ورنہ فلم تو بس دہشت گردی کے موضوع پر ہوگی۔"

"یہ پہلا موقع ہے کہ آپ نے مجھے ابھی تک اس فلم کی کہانی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"یہ باتیں بعد میں کرلینا' پہلے ان چاروں لڑکیوں کو نپٹاؤ۔"

"بہتر ہے۔"

پھر ایک ایک کرکے ان چاروں لڑکیوں کو بلایا گیا۔ ماسک ان کے چہروں پر بھی لگا کر دیکھا گیا تھا' مگر ان میں سے کسی کا چہرا بھی ماسک کے مطابق نہیں تھا۔ فرنانڈس نے ان میں...... کچھ ایسی دلچسپی اس لیے بھی نہیں لی کہ وہ چاروں ہی انیس بیس سال کی تھیں۔ پہلے تو فرنانڈس نے سوچا تھا کہ اس کی مطلوبہ لڑکی اگر کم عمر ہوئی تو میک اپ سے اس کا چہرا ایسا بنا دیا جائے گا کہ وہ اٹھائیس تیس سال کی معلوم ہو' لیکن اب وہ ذہنی طور پر فرح کو منتخب کرچکا تھا۔ وہ تھی ہی اٹھائیس تیس سال کی۔

چاروں لڑکیوں کو یہ کہہ کر رخصت کردیا گیا کہ انہیں بذریعہ خط' نتیجے سے آگاہ کردیا جائے گا۔ جاتے وقت ان چاروں ہی کے چہروں پر مایوسی نظر آئی تھی۔ غالباً انہیں یہ تجربہ پہلے ہی تھا کہ اس قسم کے رویے کا سبب ٹالنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

"بہت تھکن ہوگئی۔" فرنانڈس نے اپنی کرسی پر نیم دراز ہونے کی کوشش کی۔ "چپڑاسی سے کافی بنواؤ۔"

سلمان رضا نے چپڑاسی کو بلا کر اس سے کافی بنانے کے لیے کہا۔

فرنانڈس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ "چھ بج رہے ہیں۔ جمالی صاحب کو اب

تک آجانا چاہیے تھا۔"

"کہانی انہوں نے ہی لکھی ہے؟" سلمان رضا نے پوچھا۔

"کہانی ابھی نہیں لکھی گئی' لیکن آئیڈیا ہے میرے ذہن میں' جمالی صاحب بہت تیز لکھتے ہیں۔ آئیڈیا تو انہیں سوچنا ہی نہیں ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں لکھ دیں گے۔ کہانی زیادہ بڑی بھی نہیں ہوگی۔ زیادہ تر دہشت گردی کے مناظر فلمانا ہیں مجھے۔ چند مہینے سے شہر میں جو دہشت گردی پھیلی ہوئی ہے' اس کی وجہ سے فلم سپرہٹ جائے گی۔"

"دہشت گردی کی کہانی میں اس لڑکی کا کیا کردار ہوگا جس کا آدھا چہرا ہڈیوں کا ہو؟"

"وہی تو اس کہانی کی انوکھی چیز ہوگی۔" فرنانڈس مسکرایا۔ "ابھی جمالی صاحب سے بات ہوگی تو سن لینا کہ میرا آئیڈیا کتنا جان دار ہے۔"

"آپ نے یہ ماسک پہلے ہی سے بنوالیا تھا؟"

"یہ ماسک اس فلم کے لیے نہیں بنوایا تھا۔ چھ مہینے پہلے جب میں امریکہ گیا تھا تو ہالی ووڈ کے لیے اس قسم کی چیزیں تیار کرنے والی ایک کمپنی دیکھنے گیا تھا۔ وہاں میں نے ایسی کھوپڑیاں دیکھی تھیں' جو اندر سے کھوکھلی تھیں اور دو حصوں میں تھیں' تاکہ انہیں کسی شخص کے چہرے پر آسانی سے چڑھایا جاسکے۔ وہ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اگر میں نے کبھی کوئی خوف ناک فلم بنانے کا پروگرام بنایا تو اس میں آدھی کھوپڑی کا کوئی انسان دکھاؤں گا۔ اسی خیال سے میں نے اس کمپنی سے آدھی کھوپڑی بنوالی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں وہ آئیڈیا نہیں تھا جو ابھی کچھ دن پہلے ہی میرے ذہن میں آیا ہے۔"

"جب وہ کھوپڑیاں دو حصوں میں تقسیم تھیں تو پوری ایک کھوپڑی بنوالیتے۔"

"نہیں۔" فرنانڈس نے جواب دیا۔ "وہ دونوں حصے آپس میں ملنے کے بعد ہی کسی چہرے پر ٹکے رہ سکتے تھے۔ یہ آدھی کھوپڑی جو میں نے بنوائی ہے' وہ آدھے سر اور چہرے پر کسی جوڑ کے بغیر بھی رہ سکتی ہے۔"

اسی وقت چپڑاسی نے کمرے میں آکر جمالی کی آمد کے بارے میں بتایا۔

"انہیں اندر بھیج دو۔" فرنانڈس نے کہا۔ "ام بھی ایک زیادہ بنانا۔"

چپڑاسی چلا گیا۔ چند لمحے بعد جمالی کمرے میں آیا۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ چہرے سے وہ خاصا متین اور سلجھا ہوا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی لکھی ہوئی کہانیاں پر زیادہ فلمیں تو نہیں بنی تھیں' لیکن جو بنی تھیں' وہ بہت کامیاب رہی تھیں۔ رسمی علیک سلیک کے بعد جمالی نے کہا۔ "آپ نے یاد فرمایا تھا تو میں حاضر ہوگیا' لیکن مجھے تعجب ہے کہ آپ کو میری یاد کیسے آگئی۔ آپ تو اب تک صرف تاج صاحب سے کہانیاں لکھواتے رہے ہیں۔"

"اس مرتبہ میرے ذہن میں ایک ایسا آئیڈیا ہے کہ اس پر آپ جیسا آدمی بہت اچھی کہانی لکھے گا۔"

"تو آئیڈیا آپ سوچ چکے ہیں۔" جمالی خفیف سا مسکرایا۔

اس مسکراہٹ میں جو ہلکا سا طنز تھا' وہ فرنانڈس نہیں بھانپ سکا اور سلمان رضا سے بولا۔ "جمالی صاحب کو ماسک دکھاؤ۔"

سلمان رضا نے وہ ماسک ایک الماری میں رکھ دیا تھا۔ فرنانڈس کی ہدایت پر اس نے الماری سے وہ ماسک نکالا اور قریب آکے میز پر جمالی کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا؟" جمالی نے ماسک کو ہاتھ لگائے بغیر کچھ تعجب سے پوچھا۔

"اس کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسی لڑکی ہوگی جس کے آدھے چہرے کا گوشت گل چکا ہے۔" یہ آئیڈیا بتاتے ہوئے فرنانڈس کا لہجہ کچھ فخریہ تھا۔ "ایسی لڑکی اگر کم عمر ہوتی تو وہ زیادہ خوف ناک نہیں معلوم ہوتی' اس لیے میں نے ایک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا ہے جو اٹھائیس تیس سال کی ہے۔"

"تو اس مرتبہ آپ کوئی خوف ناک فلم بنانا چاہتے ہیں؟"

"فلم کا موضوع تو دہشت گردی ہوگی۔ یعنی وہ ملامت جو آج کل ہیں، لیکن اس لڑکی کے کردار کی وجہ سے فلم کچھ خوف ناک بھی معلوم ہوگی۔"

"میں تو صرف معاشرتی کہانیاں لکھتا ہوں فرنانڈس صاحب۔"

"اس مرتبہ کچھ نئی چیز لکھیے جناب!" فرنانڈس نے کہا۔ "اچھا رائٹر تو ہر موضوع پر لکھ سکتا ہے۔"

"آپ کا آئیڈیا کیا ہے؟" جمالی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آئیڈیا ہی اصل چیز ہوتی ہے جمالی صاحب۔" فرنانڈس نے اپنا لہجہ کچھ گمبھیر کرلیا۔ "میں تاج احمد کے بعد بس آپ پر ہی اعتماد کر سکتا ہوں۔ آپ انڈسٹری کے واحد رائٹر ہیں جس پر میں بھروسا کر سکتا ہوں۔"

"میں نے کبھی کسی کے بھروسے کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔"

"اسی لیے تو میں نے آپ کو فون کیا تھا۔ میرا آئیڈیا ایسا ہے کہ آپ اس پر بڑی کمال کی کہانی لکھ سکتے ہیں۔"

"آپ آئیڈیا تو بتایئے!" جمالی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔

"اس میں ایک چھوٹا سا رول ایک سائنس داں کا بھی ہوگا۔ دکھانا یہ ہے کہ اس نے ایک خاص قسم کا محلول بنایا ہے۔ اس محلول کی خاصیت یہ ہے کہ وہ کسی جان دار کے جسم پر جہاں لگایا جاتا ہے، صرف اس حصے کا گوشت گلا دیتا ہے۔ سائنس داں چند جانوروں پر اس کا تجربہ کرنے کے بعد وہ تجربہ کسی انسان پر کرنے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تجربے کے لیے کوئی بھی انسان تیار نہیں ہو سکتا، لیکن سائنس داں پر جنون طاری ہے۔ وہ اپنی خوب صورت سیکریٹری کو بے ہوش کر کے اپنی تجربہ گاہ میں لے جاتا ہے اور اپنے محلول سے اس لڑکی کے آدھے چہرے کا گوشت گلا دیتا ہے۔ لڑکی جب ہوش میں آکر اپنی حالت دیکھتی ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس داں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے تو اس پر دیوانگی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ سائنس داں کو قتل کر دیتی ہے اور پھر دہشت گرد بن جاتی ہے۔ یہ میں نے ابھی نہیں سوچا کہ وہ دہشت گرد کیوں بنتی ہے۔ یہ آپ کو سوچنا ہوگا کہ کس قسم کے حالات اس کے جذبات کو اتنا بھڑکاتے ہیں کہ وہ ساری دنیا کو برباد کرنے پر تل جاتی ہے۔ اسے بین الاقوامی دہشت گرد بنانا ہوگا۔" فرنانڈس نے خاموش ہو کر فخریہ انداز میں جمالی کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا۔ "کیسا آئیڈیا ہے؟"

"بہت خوب ہے۔" جمالی کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص، پوشیدہ سی طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ "لیکن فلم میں یہ بھی تو بتانا ہوگا کہ وہ اپنے چہرے کا گوشت گل جانے کی وجہ سے اذیت کا شکار رہنے کے بجائے دہشت گرد کیسے بن گئی۔ اسے تو تڑپ تڑپ کر مر جانا چاہیے۔"

"آج کل فلم دیکھنے والے یہ سب کچھ نہیں سوچتے جمالی صاحب۔ وہ تو بس یہ دیکھنے میں کھو جائیں گے کہ ایک مظلوم لڑکی کس طرح ساری دنیا سے انتقام لے رہی ہے۔ میں تو اس فلم کے پوسٹر بھی ایسے بنواؤں گا جن میں اس لڑکی کے چہرے پر ایک کلاشنکوف اسی طرح بنائی جائے گی کہ لڑکی کا آدھا خوب صورت چہرا کلاشنکوف کی ایک طرف اور گوشت کے بغیر کھوپڑی دوسری طرف۔ لڑکی کے چہرے کے پیچھے گلوب یا ایسی ہی کوئی چیز بنواؤں گا جو اس بات کی علامت ہو کہ وہ بین الاقوامی دہشت گرد ہے۔ اس کے بیک گراؤنڈ میں ایک عمارت شعلوں میں گھری ہوئی ہوگی اور ایک مرد دہشت گرد ایک ہاتھ میں گن لیے ہوئے دکھائی دے گا۔ کہانی میں اس دہشت گرد کو لڑکی کا محبوب بتانا ہوگا۔ یہ پوسٹر ہی کمال کر دے گا جمالی صاحب! لوگ فلم دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑیں گے۔"

"معاف کیجیے گا فرنانڈس صاحب! مجھے آپ کے

اس خیال سے اتفاق نہیں کہ کل لوگ فلم دیکھ کر اس کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔ کہانی کے ہر واقعے کی کوئی وجہ ضرور ہونا چاہیے۔"

فرنانڈس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے وہ جمالی کی باتوں سے اکتا گیا ہو۔ اس نے بے زاری کے سے انداز میں کہا۔ "تو پھر آپ ہی سوچ لیجیے گا کہ اس کی وجہ کیا بتائی جائے۔"

"شاید میں اس کا جواز نہیں سوچ سکوں گا کہ وہ لڑکی اذیت سے تڑپ تڑپ کر مر کیوں نہیں گئی۔" جمالی نے کہا۔ "مگر کوئی مصنف اس کا جواز تلاشے گا بھی تو وہ کسی قسم کی فنتاسی بن جائے گی اور میرا دل و دماغ اس قسم کی کہانیاں لکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔"

"سوچ لیجیے جمالی صاحب! میں آپ کو اس کہانی کا منہ مانگا معاوضہ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"منہ مانگے معاوضے کی بات نہ کیجیے فرنانڈس صاحب! مجھے یہ احساس زیادہ رہتا ہے کہ میرے ہاتھ میں جو قلم ہے، مجھے اس کی لاج رکھنا چاہیے۔"

"تو یہ کہانی آپ کے قلم کی لاج لوٹ لے گی؟" فرنانڈس نے جھنجلا کر ایک گھٹیا بات کی۔

جمالی کے چہرے سے ایسے معلوم ہوا جیسے اسے غصہ آ گیا ہو، لیکن اس نے زبان سے اپنے غصے کا اظہار نہیں کیا اور کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "میں اب اجازت چاہوں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کا کچھ وقت ضائع ہوا۔"

فرنانڈس منہ بنا کر بولا۔ "آپ دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے آپ کا وقت ضائع کیا ہے۔"

جمالی نے جواب میں کچھ کہے بغیر مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ فرنانڈس کے بعد اس نے سلمان رضا سے بھی ہاتھ ملایا اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

"لعنت ہو اس پر۔" فرنانڈس نے غصے میں میز پر ہاتھ مارا۔ "چند فلموں کی کامیابی سے اس کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا ہے۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے سر!" سلمان رضا "مصاحبت" کرنا خوب جانتا تھا۔

"اپنا تاج احمد ہی ٹھیک ہے۔" فرنانڈس نے بدلا۔ "اس کو بھی ہمیشہ میں نے ہی آئیڈیا دیا ہے لیکن اس نے کبھی میری کسی بات میں مین میخ نہیں نکالی۔"

"وہ سمجھ دار آدمی ہیں سر!" سلمان رضا نے جلدی سے کہا۔ "میں تو الجھن میں تھا کہ آپ نے جمالی جیسے آدمی کو کیوں بلا لیا۔ ان جیسا رائٹر آپ کے آئیڈیا کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔"

"غلطی ہو گئی مجھ سے۔" فرنانڈس بڑبڑایا اور پھر یکایک گرجا۔ "یہ چپڑاسی کہاں مر گیا۔ اب تک کافی نہیں آئی۔"

"میں دیکھتا ہوں جا کر۔" سلمان رضا جلدی سے بولا۔

اسی وقت چپڑاسی کافی کی ٹرے سنبھالے کمرے میں آیا۔

"اتنی دیر کیوں لگا دی تم نے؟" سلمان رضا نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"کافی ختم ہو گئی صاحب۔" چپڑاسی نے جواب دیا۔ "مجھ سے غلطی بس یہ ہوئی کہ آپ کو بتائے بغیر کافی خریدنے نیچے چلا گیا۔"

"اب میز پر تو رکھو۔" فرنانڈس دہاڑا۔ جمالی کی باتوں سے اس کا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا، پھر فوراً ہی اس نے سلمان رضا کی طرف رخ کیا۔ "تاج کو فون کرو۔ اسے فوراً بلاؤ۔ میرا آئیڈیا سن کر پھڑک اٹھے گا وہ اور پندرہ دن میں کہانی لکھ دے گا۔"

"جی ہاں، یہ خوبی تو ہے ان میں۔" سلمان رضا نے تائید کی اور جلدی سے ٹیلی فون اپنی طرف سرکا کے تاج احمد کے نمبر ملانے لگا۔

☆ ☆ ☆

ان دنوں شہر میں دہشت گردی کی ایسی فضا بنی ہوئی تھی کہ نواحی علاقوں میں سرِ شام ہی سناٹا چھانے لگتا تھا اور آٹھ نو بجے تک ایسی ویرانی ہو جاتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کرفیو کا نفاذ ہو۔ شہر کے صرف مرکزی

...وں میں بھی نو دس بجے کے بعد خاصا سناٹا ہوجاتا تھا البتہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی گاڑیوں کی آوازیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہر جگہ اور ساری رات سنائی دیتی رہتی تھیں۔

فرح کا گھر ایک نواحی علاقے میں تھا۔ اس لیے وہ شام ہونے سے پہلے گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ فرنانڈس کے دفتر سے نکلنے کے بعد وہ تھوڑی دور تک پیدل چلی اور جب ٹیکسی ملنے کے آثار نہیں دکھائی دیے تو وہ ایک بس میں سوار ہوگئی۔

خوف کی سنسناہٹ اس وقت بھی فرح کے رگ و پے میں پھیلی ہوئی تھی۔

انسانی کھوپڑی کے صرف ایک ماسک سے کسی کا اتنا خوف زدہ ہوجانا بظاہر ایک ناقابل فہم سی بات تھی، لیکن جو لوگ فرح کو قریب سے جانتے تھے انہیں فرح کی اس کیفیت کا علم تھا جو انسانی کھوپڑی دیکھ کر اس پر طاری ہوجاتی تھی۔ وہ معاملہ ایک نفسیاتی گرہ کا تھا۔ وہ گرہ تھی بھی بہت پرانی۔ فرح سات آٹھ سال کی تھی جب وہ گرہ اس کے ذہن میں پڑ گئی تھی۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ ایک اردو فلم دیکھنے گئی تھی۔ جس میں انٹرویل کے بعد ایک خوف ناک فلم کا ٹریلر دکھایا گیا تھا۔ اس ٹریلر میں انسانی کھوپڑیوں کا ایک منظر اتنا دہشت ناک تھا کہ فرح خوف سے چیخ پڑی تھی اور بے ہوش ہوگئی تھی۔ اسے فوراً ایک اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ جہاں ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ منظر اس کے ذہن میں چکراتا رہا تھا۔ وہ کئی دن تک سہمی سہمی سی رہی تھی، پھر دھیرے دھیرے اس کا خوف ختم ہوا تھا، لیکن اس دہشت ناک منظر نے اس کے دماغ پر ایسی نہ جانے کیا کیفیت طاری کردی تھی کہ بعد میں کسی انسانی کھوپڑی کی تصویر دکھائی دے جانا بھی اس کے لیے خوف کا سبب بنتا تھا۔ راہ چلتے کسی الیکٹرک پول پر دو انسانی ہڈیوں کے کراس کے ساتھ بنی ہوئی کھوپڑی دیکھ کر بھی اس کا جسم سنسنانے لگتا تھا۔ اس کے والدین اس حد تک احتیاط برت سکتے تھے کہ گھر میں آنے والے اخبار یا رسائل کو جب تک خود نہیں دیکھ لیتے تھے، اس وقت تک انہیں اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ اگر کسی رسالے یا اخبار میں ایسی کوئی تصویر چھپی نظر آجاتی تھی تو وہ تصویر کا ورق پھاڑ کر جلا دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فرح جیسے جیسے بڑی ہوگی اس کے دماغ سے وہ خوف نکل جائے گا، لیکن یہ ان کی غلطی تھی۔ اگر وہ ابتدا ہی میں کسی ماہر نفسیات سے رابطہ کرلیتے تو اس کا قوی امکان تھا کہ فرح کے ذہن میں پڑی ہوئی وہ نفسیاتی گرہ کھل جاتی اور انسانی کھوپڑی کا وہ خوف جو اس کے خمیر میں گندھ گیا تھا، ختم ہوجاتا۔

فرح کی دو چھوٹی بہنیں بھی تھیں جن سے فرح اپنی ماں کے انتقال کے بعد بہت زیادہ محبت کرنے لگی تھی اور اب جب وہ اٹھائیس سال کی ہوئی۔۔۔ تو اس کی زندگی کے سات سال اپنی بہنوں کے مستقبل کی بہتری کے لیے صرف ہوچکے تھے۔

اکیس سال کی عمر میں اس نے بی کام کیا تھا۔ اس وقت اس کی والدہ کے انتقال کو تین سال گزر چکے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اس کے والد کو دمے کا مرض لاحق ہوگیا تھا جو علاج معالجے کے باوجود سال بھر میں اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ ان کی ملازمت ختم ہوگئی۔ اس کے بعد سال بھر میں ان کا جمع شدہ پیسا بھی "تقریباً" ختم ہوگیا۔

اس وقت فرح کی دونوں چھوٹی بہنیں راحیلہ اور غزالہ بالترتیب تیرہ سال اور دس سال کی تھیں۔

فرح نے اکیس سال کی عمر میں فیصلہ کیا کہ اب وہی اپنے گھر کی تمام ذمے داریاں اٹھائے گی، کیونکہ دوسرا سال ختم ہوتے ہوتے اس کے والد کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ ان کا بیشتر وقت ہانپتے یا کھانستے ہوئے گزرتا تھا۔ دو سال کے اس مرض میں ان کی صحت بھی بہت تیزی سے گری تھی۔ جس کا بڑا سبب ان کا یہ ذہنی دباؤ تھا کہ اب وہ اپنی بیٹیوں کے لیے کچھ نہیں کرسکتے تھے۔

بی کام کرنے کے بعد فرح کسی بینک میں ملازمت حاصل کرنا چاہتی تھی جو آسان نہیں تھا۔ اس لیے اس نے وہی ملازمت کرلی جو اسے کچھ جلدی مل گئی تھی۔

ایک پرائیویٹ ادارے میں اسے اکاؤنٹس کلرک کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا گیا تھا۔ اپنی محنت اور صلاحیتوں کے باعث وہ ڈیڑھ سال بعد ہی اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ بن گئی اور سال بھر پہلے اسے اکاؤنٹنٹ کا منصب مل چکا تھا۔

وہ پرائیویٹ ادارہ اپنے ملازمین کو معقول تنخواہیں دیا کرتا تھا۔ اس لیے فرح نے ملازمت کے پانچ برسوں میں اتنی رقم جمع کرلی کہ اس سے اپنی چھوٹی بہن راحیلہ کی شادی کردی۔

شادی کے کچھ دن بعد ہی راحیلہ کے شوہر کو امریکہ میں ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ وہ راحیلہ کو لے کر وہاں چلا گیا۔

غزالہ نے بدستور اپنی بڑی بہن کی سرپرستی میں اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ اس کی عمر ابھی سترہ سال ہی تھی، لیکن وہ سیکنڈ ایئر تک پہنچ چکی تھی۔

راحیلہ کی شادی کے بعد فرح نے جو کچھ پس انداز کرنا شروع کیا تھا' وہ غزالہ کی شادی کے لیے تھا۔ اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے اس کی تنخواہ پہلے بہت زیادہ تھی۔ وہ منصب سنبھالنے کے بعد اس نے سوچا تھا کہ غزالہ کی شادی کے لیے رقم جمع کرنے میں اسے اتنا عرصہ نہیں لگے گا جتنا عرصہ راحیلہ کی شادی کی تیاری کرنے میں لگا تھا' لیکن تیزی سے بڑھتی ہوئی مہنگائی کے سبب اسے اپنا اندازہ غلط معلوم ہونے لگا۔

اب وہ کم از کم دو سال اور ملازمت کرنے کے بعد ہی غزالہ کی شادی کر سکتی تھی۔ یہ اندازہ ہوجانے کے بعد بھی اس کے ذہن پر کوئی دباؤ نہیں بڑھا تھا۔ اپنے بارے میں تو اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس نے ابتدا ہی میں پرویز سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اپنی شادی وہ اسی وقت کرے گی جب اپنی دونوں بہنوں کی شادی کا فریضہ سرانجام دے لے گی۔

پرویز اس کا سگا چچازاد بھائی تو نہیں، لیکن دور کے کسی رشتے سے چچازاد بھائی ہی تھا۔ وہ اور فرح ایک دوسرے سے اس وقت سے محبت کرنے لگے تھے جب فرح میٹرک میں تھی۔ ان دونوں میں عہد و پیمان بھی ہو چکے تھے، لیکن حالات کی تبدیلی کے بعد فرح نے اپنی محبت اور اپنے جذبات کو اس وقت تک کے لیے تھپک دینے کا فیصلہ کیا جب تک وہ اپنے فرائض سے عہد برآ نہیں ہوجاتی۔

فرح سے پرویز کو اتنی محبت تھی کہ اس نے فرح سے کہا تھا۔ "اگر تم اپنے فرائض پورے کرتے بوڑھی بھی ہوجاؤ گی تو مجھے اپنا منتظر پاؤ گی۔ کسی اور سے شادی کرنے کا خیال تو میرے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔"

پرویز کی زندگی بھی خاصے نامساعد حالات میں گزری تھی۔ جب اس نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی تو اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور سال بھر بعد یہ بات سامنے آئی تھی کہ اس کی والدہ کو کینسر ہو گیا تھا۔

کینسر کا مطلب موت کی نوید سمجھا جاتا ہے، مگر انسان اپنی عزیز جان ہستیوں کی زندگی کو زیادہ طوالت دینے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو اس کے احتیاط میں ہوتا ہے۔ ایسا ہی پرویز نے بھی کیا۔ اسے ایک بینک میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس کی تنخواہ کا بڑا حصہ ماں کے علاج پر خرچ ہوتا رہتا تھا اور پھر یہ نوبت بھی آئی تھی کہ اسے بار بار اپنے بینک سے قرض بھی لینا پڑا تھا۔

دو مہینے پہلے اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور اس وقت تک وہ بینک سے خاصا قرض لے چکا تھا' جس کی قسط ہر ماہ اس کی تنخواہ سے کٹتی رہتی تھی۔

ان حالات کے باعث پرویز کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ اگر اس کے والد ایک مکان نہ چھوڑ گئے ہوتے تو کرائے کے مکان میں رہ کر اس کے لیے گزر اوقات بھی خاصی مشکل ہوجاتی۔

☆ ☆ ☆

شام کے چھ بجے پرویز نے فرح کے گھر کا تیسرا چکر لگایا۔ وہ موٹر سائیکل پر تھا۔ وہ موٹر سائیکل اس نے اپنی ماں کی بیماری کا علم ہونے سے کچھ ہی دن پہلے خریدی تھی' ورنہ اس کے بعد تو موٹر سائیکل خریدنے کی

لوٹ ہی نہ آئی اور اسے بسوں پر انحصار کرنا پڑتا۔
تیسری مرتبہ بھی اس کے کال بیل بجانے پر غزالہ ہی نے دروازہ کھولا۔

"فرح آگئی؟" پرویز نے بے تابی سے پوچھا۔

"نہیں۔" غزالہ کے چہرے سے بھی تفکر کا اظہارہ ورہا تھا۔

"اچھا۔" پرویز نے ایک طویل سانس لی اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔

"پرویز بھائی!" غزالہ بولی۔ "آپ تیسری مرتبہ باجی کے بارے میں پوچھ کر واپس جارہے ہیں۔ آپ گھر میں بیٹھ کر انتظار کیوں نہیں کرلیتے۔"

"میں اتنا بے چین ہوں غزالہ کہ بیٹھ نہیں سکوں گا۔"

"باجی کو اتنی دیر ہوگئی ہے کہ اب مجھے بہت گھبراہٹ ہورہی ہے۔ اگر آپ رک جائیں تو شاید آپ کی وجہ سے میری گھبراہٹ کچھ کم رہے۔"

پرویز نے سر ہلایا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں رک جاتا ہوں۔"

اس نے موٹر سائیکل ایک کنارے کھڑی کر کے لاک کی اور غزالہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔

غزالہ نے اسے نشست کے کمرے میں بٹھایا اور بولی۔ "میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بس بیٹھ کر باتیں کرو۔ چچا کی طبیعت آج کیسی ہے؟"

غزالہ نے ایک دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کے والد امجد صاحب کا کمرا نشست کے کمرے سے متصل ہی تھا۔

"آپ ان کے کھانسنے کی آواز تو سن ہی رہے ہوں گے۔" غزالہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"میں ان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"نہیں اس کا صدمہ تو ہے کہ باجی نے فلم لائن میں جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ان کی سانس اتنی پھولی رہتی ہے کہ وہ باجی سے زیادہ بات کر ہی نہیں سکتے تھے اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ باجی سے اس موضوع پر بات کروں، لیکن آپ تو باجی کو سمجھانے کی کوشش کرسکتے تھے۔"

"تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں نے فرح کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔"

"پھر انہوں نے آپ سے کیا کہا تھا؟"

"جو کچھ کہا تھا، وہ تمہیں بتانا مجھے اچھا نہیں لگے گا۔" پرویز نے جواب دیا۔ "بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے منہ کی کھانا پڑی تھی۔"

"نہ جانے کیا ہوگیا ہے باجی کو۔" غزالہ کچھ روہانسی ہوگئی۔ "یہ تو میں محسوس کرچکی ہوں کہ وہ آپ سے بھی کھنچی کھنچی سی رہنے لگی ہیں۔"

اسی وقت کال بیل بجی اور غزالہ تیزی سے کھڑی ہوگئی۔ "باجی ہی ہوں گی۔" اس کے منہ سے نکلا تھا اور پھر وہ دروازہ کھولنے کے لیے تیزی سے جھپٹی تھی۔

چند لمحے بعد پرویز نے فرح کو اندر آتے دیکھا۔

"تم کب آئے؟" فرح نے قریب آتے ہوئے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"ابھی دو منٹ پہلے آیا ہوں۔" پرویز نے جواب دیا۔

غزالہ نے لقمہ دیا۔ "اس سے پہلے بھی پرویز بھائی دو چکر لگا چکے ہیں۔"

"کیوں؟" فرح نے پرویز کی طرف دیکھا۔ وہ پرویز کے سامنے ہی بیٹھ گئی تھی۔

"میں یہ جاننے کے لیے بے چین رہا ہوں کہ آج تم جس انٹرویو کے لیے گئی تھیں کیا وہ کامیاب رہا؟"

"نہیں۔" فرح نے جواب دیا۔

غزالہ کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے اسے فرح کی ناکامی سے سکون پہنچا ہو۔

"لیکن میں اس ناکامی سے دل برداشتہ نہیں ہوں۔" فرح نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس سلسلے میں اپنی کوششیں جاری رکھوں گی۔"

"خدا کے لیے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو فرح۔" پرویز نے کہا۔ "تم ایک بہت شریف خاندان کی لڑکی

ہو۔ تم فلم لائن میں جاؤ گی تو دنیا کیا کہے گی۔"

"دنیا میرے لیے جہنم رسید ہو چکی ہے اور تم سے میں کچھ دن پہلے کہہ چکی ہوں کہ اب میرے کسی معاملے میں دخل اندازی نہ کرو تو بہتر ہے۔"

پرویز اس وقت اگر فرح کے ساتھ اکیلا ہوتا تو دوسری بات ہوتی' لیکن غزالہ کی موجودگی میں فرح کے اس سخت جملے کے باعث اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"میں ذرا ابا کو دیکھ لوں۔" فرح اچانک کھڑی ہوئی ہوئی اور برابر کے کمرے میں چلی گئی۔

پرویز کے چہرے کا رنگ کچھ اور متغیر ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ غزالہ کے سامنے اس کی سخت توہین ہوئی تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ "اچھا غزالہ! میں اب چلتا ہوں۔" وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

غزالہ اس کی طرف لپکی۔ "آپ ناراض ہو کر جا رہے ہیں پرویز بھائی!"

"نہیں غزالہ۔" پرویز نے کہا۔ "یہ مت سمجھو کہ میں اب یہاں نہیں آؤں گا۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں کہ میں تم لوگوں کو بھول جاؤں۔"

لیکن دراصل وہ یہ کہنا چاہتا تھا۔ "یہ میرے لیے ممکن نہیں کہ میں فرح کو بھول جاؤں۔"

گھر سے نکل کر اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور تیزی سے چل پڑا۔ اس وقت پہلی مرتبہ اسے خیال آیا کہ فرح میں یہ تبدیلی پندرہ دن پہلے ایک بڑے ہوٹل میں چائے پینے کے ایک دن بعد آئی تھی۔ وہ واقعہ بھی اس کے ذہن میں چکرانے لگا جو ہوٹل میں پیش آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فرح کو نوجوانی ہی سے بڑے ہوٹلوں میں جانے کا بے حد شوق تھا۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی کہ جب اس کی شادی ہو جائے گی اور اس کی مالی حالات اچھے ہوں گے تو وہ اپنا یہ شوق ضرور پورا کرے گی' لیکن حالات ایسے ہوئے کہ اس کی شادی اچھے خاصے عرصے کے لیے ٹل گئی۔ اسے ملازمت کرنا پڑی' پھر جب اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ بن گئی تو اس نے وتیرہ بنا لیا کہ جس دن اسے تنخواہ ملتی تھی وہ کسی بڑے ہوٹل میں جا کر نہ صرف خود چائے پینے کی "عیاشی" کرتی تھی' بلکہ پرویز کو بھی مدعو کیا کرتی تھی۔

پندرہ دن پہلے بھی وہ ایک بڑے ہوٹل میں تھی۔ پرویز اس وقت تک نہیں پہنچا تھا۔ ویٹر آرڈر لینے آیا تو فرح نے اس سے کہا۔ "میرے ایک مہمان کو آنا ہے۔ ذرا دیر انتظار کرو۔ میں خود تمہیں اشارہ کر کے بلا لوں گی۔"

ویٹر مئودبانہ انداز میں سر ہلا کر چلا گیا اور اس کے فوراً" بعد ہی چوالیس' پینتالیس سال کا ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص اس کی میز پر آبیٹھا۔ فرح کے لیے وہ قطعی اجنبی تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور وہ فرح کو بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

فرح نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "یہاں اور میزیں بھی خالی پڑی ہیں مسٹر۔"

"لیکن تم ان میزوں پر نہیں ہو بے بی!" اجنبی نے بڑی بے باکی سے کہا۔

"کیا مطلب۔" فرح کو غصہ آگیا۔

"خوب صورت لڑکیاں میری کمزوری ہیں بے بی! اگر کوئی تنہا نظر آجاتی ہے تو میں اس سے چند باتیں ضرور کرتا ہوں اور اسے دعوت بھی دیتا ہوں کہ وہ کسی وقت میرے غریب خانے پر آئے اور مجھے میزبانی کا موقع دے۔"

"غالبا" تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔" فرح غرائی۔

"تم جیسی لڑکیوں کو دیکھ کر میں اپنے ہوش میں تو واقعی نہیں رہا تا۔" اجنبی نے ڈھٹائی سے کہا۔ "ایک مرتبہ میں نے تمہیں سلطان صاحب کے دفتر سے نکلتے دیکھا تھا۔ شاید تم وہاں ملازمت کرتی ہو۔ اس وقت میرے ساتھ دو ایک افراد اور بھی تھے' ورنہ میں تم سے وہیں بات کرتا۔"

"اگر تم فوراً" میری میز سے نہیں اٹھ گئے تو بہت برا ہو گا۔"

"کیا برا ہو گا؟" وہ اس طرح ہنسا جیسے فرح کا مذاق اڑا رہا ہو۔ "تم نے شور مچایا تو اپنا ہی تماشا بنواؤ گی۔ یہاں سب لوگ جانتے ہیں کہ میں ایک معزز آدمی ہوں۔ میرے مقابلے پر تمہاری کسی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اور میں کہہ دوں گا کہ ان محترمہ نے تو مجھے خود ہی روکا تھا اور میں اس لیے رک گیا تھا کہ شاید انہیں کسی معاملے میں میری مدد کی ضرورت ہو' لیکن جب میں ان کی میز پر بیٹھ گیا تو انہوں نے مجھ سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا اور عدم ادائیگی کی صورت میں شو مچانے کی دھمکی دی۔"

فرح نے اس وقت غصے کے ساتھ ہی بے بسی بھی محسوس کی اس کی دانست میں یہ ممکن تو تھا کہ وہ شخص اس ہوٹل میں مستقل آتا جاتا رہتا ہو اور وہاں اسے ایک معزز آدمی کی حیثیت سے جانا جاتا ہو۔

"ہاں میں ان ہی کے دفتر میں ملازم ہوں۔" فرح نے اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا تم ان کے دفتر میں کام کرنے والی ہر لڑکی سے اسی طرح بدتمیزی کرتے ہو؟"

"پسندیدگی کو بدتمیزی نہ کہو بے بی۔" وہ مسکراتا رہا۔ "لیکن تم سلطان صاحب کے دفتر کی پہلی لڑکی ہو جو مجھے پسند آئی ہے۔"

"سنو مسٹر!" فرح نے غصے اور بے بسی کی کیفیت میں کہا۔ "میں شور مچا کر اپنا تماشا نہیں بنواؤں گی' لیکن میں منیجر کے کمرے میں جا کر اسے ضرور بتا سکتی ہوں کہ اس کے ہوٹل میں کس قسم کے ذات شریف آتے ہیں۔"

"تمہیں ایسا کر کے بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" پہلی مرتبہ اجنبی کا لہجہ کچھ خشک ہو گیا۔ "میں خوب جانتا ہوں کہ دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں بس اپنا بھاؤ بڑھانے کے لیے پارسائی جتاتی ہیں۔ خیر' اب میں چلتا ہوں۔ جاتے جاتے میں تمہیں بتا دوں کہ اگر تم نے مجھے کسی دن میزبانی کا موقع دیا تو مجھ سے تمہیں اتنی رقم مل جائے گی جو تمہاری تنخواہ سے تین گنا زیادہ ہو گی۔ میں تمہارے دفتر کا فون نمبر معلوم کر لوں گا اور کل تم سے فون پر پوچھ لوں گا کہ تم مجھے میزبانی کا موقع کس دن دے سکو گی۔"

فرح کا چہرا سفید پڑ گیا۔ وہ اجنبی اس طرح کے دام لگا رہا تھا جیسے وہ کوٹھے پر بیٹھی ہوئی طوائف ہو۔ اس وقت شاید وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پاتی اور اس شخص پر برس ہی پڑتی' لیکن اسی وقت وہ کرسی سے اٹھا اور تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

فرح نے محسوس کیا کہ اس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس نے میز سے پانی کا گلاس اٹھایا اور رک رک کر گھونٹ لینے لگی۔

فرح نے پانی پی کر گلاس میز پر رکھا ہی تھا کہ پرویز آ گیا۔ اور کرسی پر بیٹھتے ہی بولا۔ "یہ تمہارا چہرا کیسا ہو رہا ہے؟"

فرح کو اپنی آنکھیں بھیگتی ہوئی سی لگیں۔ یہ اس کی بے بسی کا ردعمل تھا کہ ایک شخص اس کی شدید اہانت کر کے چلا گیا تھا اور وہ اس کا کچھ نہیں کر سکی تھی۔

"کیا بات ہے بھئی۔" پرویز کی حیرت میں اضافہ ہوا۔

فرح نے رومال نکال کر جلدی سے اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ اسے خود ہی خیال آ گیا تھا کہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ اسے روتا ہوا دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔

"کیا معاملہ ہے فرح۔" پرویز کی بے چینی بڑھی۔

فرح نے اپنی آنکھیں خشک کر کے رومال آنکھوں سے ہٹایا اور بھرائی ہوئی آواز میں پرویز کو سارا ماجرا سنانے لگی۔

سب کچھ سن کر پرویز کے چہرے کا رنگ بھی متغیر ہو گیا۔ وہ بولا۔ "تم نے غلطی کی کہ شور مچا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کیا۔ وہ اس ہوٹل میں آنے والا کوئی شریف آدمی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ شاید وہ پیے ہوئے ہو گا' ورنہ کسی ہوٹل میں کوئی اس قسم کی بدتمیزی نہیں کر سکتا۔"

"شاید میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا' بلکہ اب تک ماؤف ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے کوئی

خواب دیکھا تھا۔"

"اب اس واقعے کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرو۔وہ ضرور کوئی شرابی ہوگا۔"

"میں یہ واقعہ آسانی سے نہیں بھول سکوں گی۔" فرح نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔"اپنی شدید ذلت کا احساس ہو رہا ہے مجھے۔"

"کبھی کبھی تنہا لڑکیوں کو اس قسم کی صورت حال پیش آہی جاتی ہے۔دل و دماغ پر اس کا زیادہ اثر نہیں لینا چاہیے۔"

"وہ کہہ گیا ہے کہ کل مجھے فون کرے گا۔"

"نہیں کرے گا۔" پرویز نے کہا۔"اس وقت وہ نشے میں ساری بکواس کر گیا ہے۔سب کچھ بھولنے کی کوشش کرو۔"

اسی وقت فرح کی نظر ویٹر پر پڑی۔اس نے اسے اشارے سے بلالیا۔

☆ ☆ ☆

وہ واقعہ ایسا نہیں تھا کہ فرح اسے باآسانی اپنے ذہن سے جھٹک دیتی۔اس کوشش میں اسے دو ایک دن ضرور لگتے، لیکن دوسرے دن سچ مچ اس اجنبی کا فون آگیا۔فرح نے اس کی آواز پہچان لی۔

"کیا تم نے کچھ فیصلہ کرلیا ہے بی بی؟" اس کی آواز بالکل پرسکون تھی۔

"میرا پیچھا چھوڑ دو کمینے انسان۔" فرح نے دانت پیسے۔

اس مرتبہ وہ دھیرے سے ہنسا۔"خوب صورت ہونٹوں سے مجھے گالیاں بھی اچھی لگتی ہیں۔خیر! یہ بات تم اچھی طرح سمجھ لو کہ جو لڑکی مجھے پسند آجاتی ہے اسے میرا مہمان ضرور بننا پڑتا ہے۔اگر وہ خوشی سے ایسا نہیں کرتی تو میں اسے مجبور کردیتا ہوں۔"

"شٹ اپ!" فرح نے پھر دانت پیسے اور سلسلہ منقطع کردیا۔

کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنا جسم غصے سے کانپتا ہوا محسوس کیا۔اسی عالم میں اس نے دوبارہ ریسیور اٹھایا اور پرویز کے بینک کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی اور اسے بتایا گیا کہ پرویز اس وقت بینک میں نہیں تھا۔اسے کسی کام سے بینک کی کسی اور برانچ میں بھیجا گیا تھا۔

فرح نے اپنا سر میز سے ٹکادیا۔وہ غصے میں تو تھی ہی لیکن اب اچانک اسے ایک ایسا خیال آیا تھا کہ وہ کچھ خوف محسوس کرنے لگی تھی۔اس اجنبی نے ہوٹل میں اس سے اتنی دیدہ دلیری سے بے ہودہ باتیں کرنے کے بعد اسے فون بھی کیا تھا۔فرح کی دانست میں اتنی ہمت کسی عام آدمی نہیں ہوسکتی تھی۔اس کا امکان تھا کہ وہ کوئی خطرناک آدمی ہو۔

فرح کو اس وقت شدت سے پرویز کی کمی محسوس ہونے لگی۔اس وقت اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہوگئی تھی کہ کام کرنا تو اس کے لیے ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ذرا دیر بعد اس نے چپراسی سے چائے منگوا کر پی، لیکن اس طرح بھی وہ اپنی حالت کو سنبھالنے میں ناکام رہی۔ایک گھنٹے بعد اس نے پرویز کو پھر فون کیا، لیکن وہ اس وقت بھی بینک میں موجود نہیں تھا۔

بزر کی آواز نے اسے اپنے خیالات سے چونکایا۔اس کا ہاتھ انٹر کام کے ریسیور پر چلا گیا۔بزر دوبارہ بجا تو اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔"ہیلو۔"

"فرح!" دوسری طرف سے جو آواز آئی وہ اس ادارے کے مالک سلطان صاحب کی تھی۔

"یس سر!" فرح نے اپنے لہجے میں مستعدی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"ذرا میرے کمرے میں آؤ۔" سلطان صاحب نے کہا۔

"بہتر ہے۔"

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

فرح ریسیور رکھ کر اپنی کرسی سے اٹھی۔اپنے کمرے سے نکل کر سلطان صاحب کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ کوشش کررہی تھی کہ اس کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیت کا اظہار نہ ہونے پائے۔

سلطان صاحب کا پی اے اسے دیکھ کر رسمی انداز میں مسکرایا۔
"صاحب اکیلے ہیں یا کوئی اور بھی ہے؟" فرح نے اس سے پوچھا۔
"اکیلے ہی ہیں۔ آپ دستک دے کر چلی جایئے۔"
فرح نے آگے بڑھ کر سلطان صاحب کے کمرے پر دستک دی۔
"کم آن۔" اندر سے آواز آئی۔
فرح دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔
وسیع و عریض کمرے میں سلطان صاحب اپنی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر بیٹھے سگار کے گہرے کش لگا رہے تھے۔ فرح نے محسوس کیا کہ ان کے چہرے سے خاصی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔
"بیٹھو!" سلطان صاحب نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
فرح بیٹھ کر غور سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔
"تمہارے گھر میں کل کتنے افراد ہیں؟"
فرح کو اس سوال پر حیرت ہوئی تھی، لیکن اس نے جواب فوراً دیا۔ "بس میں ہوں، میری ایک چھوٹی بہن ہے اور میرے والد ہیں۔"
سلطان صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا، پھر متفکر انداز میں فرح کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم میرا ایک مشورہ مانو گی؟"
"فرمایئے سر!" فرح کا ذہن الجھ رہا تھا۔
"تم اپنے اس مختصر سے خاندان کے ساتھ یہ شہر چھوڑ کر چلی جاؤ اور کسی کو معلوم نہ ہونے دو کہ تم کہاں گئی ہو۔"
"مگر... کیوں سر؟" فرح کی حیرت میں اضافہ ہوا۔
"اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ یہاں اس شہر میں تمہارے سر پر ایک خطرہ منڈلا رہا ہے۔"
"خطرہ...؟ مجھے تو ایسے کسی خطرے کا علم نہیں کہ میں یہ شہر چھوڑ کر بھاگوں۔"
"تو پھر غالباً تمہیں اس کا علم نہیں ہوگا کہ عبداللہ انڈر ورلڈ کے ایک بہت ہی خطرناک گروپ کا سربراہ ہے۔"
"میں تو اس نام کے کسی آدمی کو جانتی ہی نہیں؟"
سلطان صاحب نے کچھ حیرت سے فرح کی طرف دیکھا۔ "تو اس نے ابھی تمہیں اپنا نام نہیں بتایا ہے؟"
"نہ جانے آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔"
"کیا پچھلے ایک ڈیڑھ ہفتے یا پچھلے دو چار دنوں میں تمہیں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا، جس نے تم سے کچھ غیر مہذب باتیں کی ہوں اور تم نے اسے ان باتوں کا بہت سخت جواب دیا ہو؟"
فرح کو فوراً وہ اجنبی یاد آ گیا جو اسے ایک ہوٹل میں ملا تھا اور ذرا دیر پہلے وہ اسے فون بھی کر چکا تھا۔
سلطان صاحب چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولے۔ "مجھے تمہارے چہرے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ میرا قیاس غلط نہیں۔"
"جی۔" فرح کی نظریں جھک گئیں۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے سلطان صاحب کو ان سب باتوں کا علم ہو چکا ہو۔
"مجھے یقین ہے کہ وہ عبداللہ ہی ہوگا۔" سلطان صاحب بولے۔ "وہ بے حد خطرناک آدمی ہے فرح۔"
"اسی لیے آپ چاہتے ہیں کہ میں یہ شہر چھوڑ کر چلی جاؤں؟"
"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس تباہی سے بچ جاؤ جو عبداللہ کی وجہ سے تم پر آ سکتی ہے۔"
"اس کی وجہ سے مجھ پر کیا تباہی آ سکتی ہے؟"
"وہ کچھ بھی کر سکتا ہے فرح! وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔" سلطان صاحب نے پہلو بدلا۔ "وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ تم اس شہر میں رہ کر اس سے بچ نہیں سکتیں۔"
"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے ملا تھا؟"
سلطان صاحب نے ایک طویل سانس لی۔ "اس نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ چاہتا ہے کہ فی الحال تو میں تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی دے دوں۔"

"فی الحال؟"

"ہاں۔۔۔" سلطان صاحب نے فرح سے نظریں چرائیں۔ "میں قیاس کرسکتا ہوں کہ تم سے اس کا مطالبہ کیا ہوگا' لیکن میں وہ باتیں اپنی زبان پر نہیں لاسکتا۔ ممکن ہے کہ میرا قیاس غلط ہو' لیکن یہ بات یقینی ہے کہ تم سے اس کا کچھ مطالبہ ہے۔ اگر تم نے ایک ہفتے کے اندر اس کا مطالبہ پورا نہیں کیا تو وہ مجھے حکم دے گا کہ میں تمہیں ملازمت سے الگ کردوں۔"

"اور آپ اس کا حکم مان لیں گے؟"

"اگر نہیں مانوں گا تو مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ بڑے کاروباری لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اس سے خوف زدہ نہ ہو۔ دو افراد اس کی بات نہ ماننے کا بہت بھیانک خمیازہ بھگت چکے ہیں۔"

"اور کسی نے پولیس سے۔۔۔"

"پولیس کا نام نہ لو۔" سلطان صاحب نے بے چینی سے اس کی بات کاٹی۔ "پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہم کاروباری لوگوں کو اب تک اندازہ بھی نہیں ہوسکا ہے کہ اس کا اثر رسوخ کہاں تک ہے۔ جن دو افراد کو اس بات کی بات نہ ماننے کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے' ان میں سے ایک نے اس کی بات نہ مان کر پولیس سے رابطہ کیا تھا اور اس رابطے کے ایک گھنٹے بعد اسے اپنے ایک جوان بیٹے کی لاش دیکھنا پڑی تھی۔"

فرح کے جسم میں ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس شخص کو وہ ٹیلی فون پر بھی لتاڑ چکی تھی' وہ اتنا خطرناک آدمی تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم یہ شہر چھوڑ کر چلی جاؤ۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے فرح! یہاں رہ کر تم خود کو عبداللہ سے نہیں بچاسکو گی۔ جب تم میرے ادارے سے الگ کردی جاؤ گی تو وہ تمہیں کسی اور جگہ بھی ملازمت نہیں ملنے دے گا۔"

فرح پریشان ہوگئی۔ "لیکن سر! کسی دوسرے شہر میں جاکر ملازمت تلاش کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔"

"مشکل ہی ہوگا نا۔ یہاں تو ناممکن ہی سمجھو۔ میں تم سے پھر کہوں گا فرح کہ مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے۔ تم میرے ادارے کی ایک بے حد محنتی اور باصلاحیت کارکن ہو' لیکن میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔"

"تو میں خود کو ملازمت سے الگ سمجھوں؟" فرح کی آواز بھرا گئی۔

"ہاں۔۔۔" سلطان صاحب نے کہا۔ "فی الحال تو دفتر کے ریکارڈ پر یہی آئے گا کہ تم ایک ہفتے کی چھٹی پر ہو' لیکن ایک ہفتے بعد۔۔۔" سلطان صاحب رک کر بولے۔ "میرے خیال میں تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ میرے قیاس کے مطابق تم سے اس کا جو مطالبہ ہوسکتا ہے' وہ تم ہرگز نہیں مانو گی اور میں مجبور ہو جاؤں گا کہ عبداللہ کے کہنے پر تمہیں ایک ماہ کی تنخواہ دے کر ملازمت سے الگ کردوں۔"

فرح کچھ نہیں بولی۔ یہ اس کے لیے انتہائی پریشان کن صورت حال تھی۔ اگر یہ صورت حال صرف اس کی ذات کے لیے تکلیف دہ ہوتی تو اسے زیادہ پروا نہ ہوتی' لیکن اس کے سامنے تو یہ سوال آکھڑا ہوا تھا کہ اب وہ اپنی چھوٹی بہن غزالہ کی شادی کس طرح کرسکے گی؟

سلطان صاحب کچھ دیر تک نظریں جھکائے خاموش بیٹھے رہے تو فرح نے بڑی بے چارگی سے پوچھا۔ "کیا میں جاؤں سر؟"

سلطان صاحب نے سر ہلا دیا' پھر کہا۔ "میرا یہ مشورہ یاد رکھنا کہ یہ شہر چھوڑ دینا ہی تمہارے لیے بہتر ہوگا۔"

فرح انہیں سلام کرکے کمرے سے نکلی تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم سے آدھی جان نکل گئی ہو۔

اپنی میز پر پہنچ کر وہ کرسی پر بیٹھی ہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور مردہ سی آواز میں بولی۔ "ہیلو۔"

"اب تمہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ میں کیا ہوں۔" عبداللہ کی آواز سنائی دی۔ "میں اس سے بھی بے خبر نہیں رہا کہ تم سلطان کے کمرے سے نکل کر ابھی ابھی اپنی میز پر پہنچی ہو۔" فرح گنگ سی بیٹھی رہ گئی۔

عبداللہ پھر بولا۔ "میں اگر چاہوں تو تمہیں اغوا بھی کرواسکتا ہوں' لیکن میری خواہش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ جو لڑکی مجھے پسند آئے' وہ خوشی خوشی مجھے اپنا میزبان بننے کا موقع دے۔"

"یہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔" فرح بڑی مشکل سے بولی۔

"میں دیکھوں گا کہ تم مجھے کب تک انتظار کرواسکتی ہو۔"

یہ تو یقین کرلو کہ تمہیں اب کہیں اور بھی ملازمت نہیں ملے گی۔ اگر تم اس پریشانی کو بھی جھیل گئیں تو مجھے کوئی دوسرا داؤ آزمانا پڑے گا۔ جو تمہیں یقیناً" چت کردے گا۔ عبداللہ دھیرے سے ہنسا۔ "میرا آخری جملہ ذو معنی تھا۔ شاید تم نے سمجھ لیا ہو گا۔"

فرح کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

"تمہارے گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی میں نے معلوم کرلیا ہے۔" عبداللہ نے فرح کے بولنے کا انتظار کیے بغیر کہا۔ "میں تمہیں روزانہ صبح فون کرتا رہوں گا۔ جب بھی تم میری مہمان بننے کے لیے تیار ہو جاؤ' مجھے بتا دینا۔ میں نے تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی دلوائی ہے' لیکن اسے تم اپنے لیے ایک ہفتے کی مہلت نہ سمجھنا۔ اگر میں بے تاب ہوا تو اپنا دوسرا داؤ جلدی بھی آزما سکتا ہوں۔ اگر تم نے پولیس سے رابطہ کیا تو اس سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ پولیس تو کیا تم میرے بارے میں کسی کو بھی کچھ نہ بتانا۔ اگر تم نے ان باتوں کی خلاف ورزی کی تو تمہیں اس کے بہت زیادہ سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے۔ فی الحال میں تمہیں بتاؤں گا کہ وہ سنگین نتائج کیا ہوں گے۔"

فرح اب بھی خاموش رہی۔ اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

"ہیلو!" عبداللہ نے کچھ زور سے کہا۔ "تم خاموش کیوں ہو۔"

"میں کیا بولوں!" فرح نے تھوک نگلا۔

"فی الحال کچھ نہیں بولنا چاہتیں تو نہ بولو۔ میں بس اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ تم میری آواز سن رہی ہو۔ اب میں فون بند کرتا ہوں۔ آخری بات یہ اور سن لو کہ اگر تم نے مجھ سے بچنے کے لیے اس شہر سے فرار ہونا چاہا تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکو گی۔"

"میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔" فرح بمشکل بول سکی۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "میں کوئی بہت حسین لڑکی تو نہیں ہوں۔ آخر تم میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ شہر میں ایسی لڑکیوں کی کمی نہیں ہو گی جو بخوشی تمہاری بات مان لیں گی۔"

"اس قسم کی لڑکیوں نے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی اور جہاں تک تمہاری اس بات کا تعلق ہے کہ تم بہت حسین لڑکی نہیں تو یہ شاید تمہارا انکسار ہے' ورنہ تو معمولی شکل و صورت حال کی لڑکیاں بھی خود کو حسین سمجھتی ہیں۔ اچھا اب میں فون بند کرتا ہوں۔ یہ مناسب نہیں ہو گا کہ میں تم سے ٹیلی فون پر زیادہ دیر تک باتیں کروں۔ آج کے بعد تم یہاں نہیں ہو گی۔ اس لیے میں تمہارے گھر ہی فون کروں گا' بلکہ میں خود فون نہیں کروں گا۔ میرا ایک آدمی تمہیں فون کرے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میری آواز ٹیپ کرلو۔ میرا آدمی اپنا نام صرف ماسٹر بتائے گا۔ تم سمجھ لینا کہ وہ میرا نمائندہ ہے۔"

فرح کی کوئی بات سنے بغیر دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

☼ ☼ ☼

اس دن فرح اپنے گھر پہنچی تو ہلکا سا بخار محسوس کررہی تھی۔ وہ اپنے بیمار والد کو بس سلام کرکے اپنے کمرے میں گئی اور بستر پر لیٹ کر سوچتی رہی کہ اسے ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ سلطان صاحب اور پھر عبداللہ سے باتیں کرنے کے بعد وہ صرف یہ ہی سوچتی رہی تھی' لیکن اس کا منتشر ذہن اسے کسی نتیجے تک

نہیں پہنچنے دے رہا تھا۔ یہ فیصلہ وہ ضرور کر چکی تھی کہ پرویز کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ وہ بہت غصہ ور، شدید جذباتی اور انتہائی جوشیلا تھا۔ عام طور پر لوگ اسے ٹھنڈے مزاج کا نوجوان سمجھتے تھے، لیکن ایسے ہی مزاج کے لوگوں کو جب غصہ آتا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسا واقعہ فرح کے مشاہدے میں آ بھی چکا تھا۔ اس لیے وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے بارے میں عبداللہ کی خواہشات جان کر پرویز سے جا ٹکرانا یقینی بات ہوتی اور یہ ٹکراؤ اسے بہت مہنگا پڑتا۔ عبداللہ کے بارے میں سلطان صاحب کی رائے سننے کے بعد وہ عبداللہ سے بہت خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے اخبارات میں انڈر ورلڈ کے جرائم پیشہ افراد کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا اور عبداللہ تو انڈر ورلڈ کا کوئی عام آدمی نہیں بلکہ ایک گروپ کا سربراہ تھا۔

فرار ہونے کے بارے میں فرح سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے اپنی چھوٹی بہن کی شادی اسی شہر میں کرنا تھی۔ وہ لڑکا اسی شہر میں رہتا تھا، جس سے غزالہ کی شادی طے پا چکی تھی۔ وہ غزالہ کے کالج کی ایک دوست کا چچازاد بھائی تھا۔ غزالہ اس لڑکے سے بہت محبت کرتی تھی، لیکن یہ محبت یک طرفہ تھی۔ لڑکا تو اس سے شادی کرنے کے لیے صرف اس وجہ سے تیار ہوا تھا کہ اس کے چچا اور چچی نے اس شادی کے سلسلے میں فرح کی بات مان لی تھی، لیکن وہ دونوں بے حد لالچی تھے۔ انہوں نے جہیز کے سلسلے میں اپنی شرائط فرح کے سامنے پہلے ہی رکھ دی تھیں اور فرح نے اپنی بہن کی خاطر وہ شرائط مان بھی لی تھیں۔

فرح نے اپنی بہنوں کی خاطر اپنی نوجوانی کے جذبات کا گلا گھونٹ دیا تھا اور یہ قربانی دے کر اپنی ایک بہن کی شادی کر بھی چکی تھی، لیکن اگر وہ غزالہ کی شادی نہ کر پاتی تو اس کی قربانی پچاس فی صد تو رائیگاں ہی جاتی۔ فرح نہیں چاہتی تھی کہ ایسا ہو، لیکن یہ قدم اٹھانا بھی اس کے لیے آسان نہیں تھا کہ وہ اپنی عزت گنوا دیتی۔ اسی لیے یہ فیصلہ کرنا اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے۔

وہ ان خیالات سے اس وقت چونکی جب اس نے غزالہ کی آواز سنی۔

"کیا بات ہے باجی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

فرح چونک پڑی۔ وہ اپنے خیالات میں اس طرح گم رہی تھی کہ دروازہ کھلنے اور غزالہ کے قدموں کی آہٹ بھی نہیں سن سکی تھی۔

"ہاں غزالہ!" فرح نے دھیمی آواز میں کہا۔ "آج دفتر میں کام بہت زیادہ تھا۔ سر میں ہلکا سا درد ہو گیا ہے۔"

غزالہ نے اس کی کلائی چھو کر دیکھی اور پر تشویش لہجے میں بولی۔ "آپ کو تو بخار بھی ہے۔"

"سر درد کی وجہ سے ہو گیا ہو گا۔" فرح نے بے پروائی ظاہر کی۔ "میری میز کی دراز میں کچھ گولیاں پڑی ہیں۔ ان میں سے دو گولیاں کھلا دو مجھے اور ہو سکے تو ایک کپ چائے پلا دو۔"

"پہلے گولیاں کھلا دوں یا چائے بنا لاؤں؟"

"پہلے چائے بنا لاؤ اور ہاں! ابا کو میری طبیعت کے بارے میں نہ بتانا۔ خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔ ویسے ہی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔"

"تھوڑی دیر میں پرویز بھائی آنے والے ہیں۔ ابھی انہوں نے فون کیا تھا۔"

فرح اس وقت پرویز کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ پرویز کے سامنے جذباتی ہو جائے گی۔ پریشانی کے عالم میں اگر کوئی محبت کرنے والا مل جائے تو جذبات پر قابو نہیں رہ پاتا۔ اسی لیے فرح کو خدشہ تھا کہ وہ جذباتی ہو گئی تو پرویز کے اصرار پر اسے سب کچھ بتا بیٹھے گی اور اس طرح پرویز کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

"میں اس وقت پرویز سے نہیں مل سکتی۔" فرح نے کہا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے کہہ دینا کہ میں سو گئی ہوں، لیکن یہ بھی نہ بتانا کہ طبیعت زیادہ خراب ہے، ورنہ وہ میرے جاگنے کے

انتظار میں بیٹھا ہی رہے گا۔"

غزالہ نے اسے ایک نظر دیکھا اور کمرے سے چلی گئی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے، لیکن وہ فرح سے زیادہ بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ فرح نے اس سے شدید محبت کے ساتھ اس پر اپنا رعب بھی قائم رکھا تھا۔

وہ دس منٹ میں فرح کے لیے چائے اور پانی کا گلاس لے آئی۔ دراز سے فرح نے خود ہی ٹیبلٹس نکال لی تھیں۔ وہ اس نے آدھے گلاس پانی سے کھائیں اور غزالہ سے کہا۔

"شاید کھانا پکا رہی ہو گی۔"

"جی باجی۔"

"بس تو جاؤ، کام کرو۔ میں دروازہ اندر سے بند کر لوں گی۔ جب پرویز چلے جائیں تو آ کے مجھے بتا دینا۔"

"بہتر......"

غزالہ چلی گئی۔ فرح نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ پرویز اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے کمرے میں نہ آ جائے۔ اس نے پانی کا گلاس تشتری سے ڈھک دیا اور چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی ہوئی پھر اپنے خیالات سے الجھنے لگی۔

پندرہ منٹ بعد اس نے کال بیل کی آواز سنی تو سمجھ گئی کہ پرویز آیا ہو گا۔ وہ اس وقت چائے پینے کے بعد بستر پر لیٹ چکی تھی۔ اس خیال نے اسے افسردہ کر دیا کہ پرویز اس کے گھر میں آ رہا ہے اور وہ ذہنی طور پر اس سے ملنے کے لیے آمادہ ہیں، پرویز، جو اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ برسوں سے اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب فرح اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو جاتی اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے شادی کر لیتے۔

ایک گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور غزالہ کی آواز سنائی دی۔ "پرویز بھائی چلے گئے ہیں باجی!"

"اچھا ٹھہرو، میں دروازہ کھولتی ہوں۔"

فرح نے اپنی بے چینی کی وجہ سے اسی وقت دروازہ کھولا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ پرویز کس کیفیت میں رخصت ہوا تھا۔

"میں نے انہیں چائے پلا دی تھی باجی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ آپ کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ اس لیے آپ دروازہ بند کر کے سو گئی ہیں۔" غزالہ نے بتایا۔

"وہ کچھ دیر کے لیے ابا کے کمرے میں جا کر ان سے باتیں کرتے رہے تھے، لیکن بہت بے چین رہے تھے۔ شاید وہ آپ کے جاگنے کا انتظار کرتے ہی رہتے، لیکن انہیں اپنے بینک کے دو افراد کے ساتھ اسی وقت شہر سے جانا تھا۔ انہیں بینک کا کوئی کام ہے۔ وہ تین دن بعد واپس آئیں گے۔"

فرح نے کچھ سکون محسوس کیا۔ اب اسے تین دن تک پرویز کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس کا خیال تھا کہ تین دن میں تو وہ کچھ فیصلہ کر ہی لے گی، لیکن یہ سوال وہ خود سے بھی کرتی رہی تھی کہ وہ کیا فیصلہ کر سکے گی۔

✡ ✡ ✡

دوسری صبح کالج جانے کے لیے تیار ہونے کے بعد غزالہ نے فرح کے کمرے میں آ کر اسے لیٹا ہوا دیکھا تو بڑی تشویش سے بولی۔ "آپ کی طبیعت ابھی تک نہیں ہوئی باجی؟"

"نہیں، طبیعت تو اب ٹھیک ہے۔"

غزالہ نے اس کی کلائی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور کہا۔ "ہاں اب آپ کا جسم تو گرم نہیں ہے، لیکن جب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے تو آپ دفتر کیوں نہیں جا رہی ہیں؟"

"میں چند دن آرام کرنا چاہتی ہوں غزالہ! میں نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ان چند برسوں نے آپ کو بہت تھکا دیا ہے۔" غزالہ نے پژمردہ لہجے میں کہا۔ "اب بہتر یہ ہو گا کہ آپ ملازمت چھوڑ دیں اور میں اپنی تعلیم چھوڑ کر کوئی ملازمت کر لوں۔"

"فضول خیالات کو اپنے دماغ سے دور رکھو۔" فرح نے منہ بنا کر کہا۔ "ابھی تم سیکنڈ ایئر بھی پاس نہیں کر سکی ہو۔ تمہیں کوئی اتنی اچھی ملازمت نہیں مل

سکتی کہ سب اخراجات پورے ہو سکیں۔"
غزالہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔ فرح کی بات غلط نہیں تھی۔
"تمہیں اب جانا چاہیے۔" فرح نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "ورنہ کالج پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔"
"باجی!" غزالہ آبدیدہ ہو گئی۔ "مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ میں نے آپ کی زندگی سے بہت کچھ چھین لیا ہے۔"
"ارے' یہ کیا۔" فرح نے جلدی سے اٹھ کر غزالہ کو اپنے گلے سے لگالیا۔ "خبردار جو رونا دھونا شروع کیا۔ مجھے یہ احساس نہ دلاؤ کہ میرا کیا دھرا رائیگاں رہا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ کر رہی ہوں' وہ صرف اس لیے کہ میں اپنی چھوٹی بہنوں کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہ دیکھوں۔ راحیلہ کی شادی کر کے میں نے بہت سکون محسوس کیا تھا۔ اب تم میرا وہ سکون غارت نہ کرو۔ تم نے میری زندگی سے کچھ نہیں چھینا۔ اگر تمہاری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے تو میں سمجھوں گی کہ میں بڑی بہن کی حیثیت سے اپنا فرض پورا نہیں کر سکی۔"
غزالہ کی آنکھوں سے دو آنسو تو ٹپک ہی گئے تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے آنسوؤں پر تو قابو پالیا' لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شدید کرب سے دوچار تھی۔
فرح نے اس کی پیشانی چومی اور پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "بس اب جاؤ۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہو گی کہ تمہیں کالج پہنچنے میں دیر ہو۔"
غزالہ نے فرح کا ہاتھ چوما اور تیزی سے دروازے کی طرف مڑ گئی۔
"ٹیلی فون کی گھنٹی تیز کرتی جانا۔" فرح نے اپنی آواز پر سکون رکھنے کی کوشش کی تھی۔
ٹیلی فون لاؤنج میں لگا ہوا تھا۔
غزالہ کے جانے کے بعد فرح بستر پر لیٹی تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ دماغ میں گونجنے والے اس سوال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ اب وہ اپنی چھوٹی بہن کی شادی کرنے میں کامیاب ہو سکے گی؟
فرح کی آنکھوں سے کئی آنسو ٹپک گئے' لیکن پھر اس نے اپنے جذبات پر قابو پالیا۔ اس نے باتھ روم میں جا کر منہ دھویا اور پھر کمرے سے نکل کر اپنے والد کے کمرے میں گئی۔
"تم ابھی تک دفتر جانے کے لیے تیار بھی نہیں ہوئیں؟" امجد صاحب حیرت سے بولے۔
"میں نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی ہے ابا۔"
"اوہ!" امجد صاحب کے چہرے پر افسردگی نظر آئی۔ "بہت تھکن محسوس کرنے لگی ہو گی۔"
"ایسی کوئی بات نہیں ہے ابا!" فرح نے جلدی سے کہا۔ "میں نے بس یوں ہی چھٹی لے لی ہے۔"
امجد صاحب کھانس کر چپ رہ گئے۔ دو ہی جملے بول کر ان کی سانس خاصی پھول گئی تھی۔
اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔
"میں ابھی آئی ابا!" فرح نے کہا اور تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے نکلی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ اسے خیال آیا کہ وہ عبداللہ کے نمائندے کا فون ہو گا جو اسے اپنا نام مسٹر بتائے گا۔
لاؤنج میں جا کر اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور دھیمی سی آواز میں بولی۔ "ہیلو!"
"میں ماسٹر بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے ایک اجنبی مردانہ آواز سنائی دی۔ "کیا تم نے کوئی فیصلہ کر لیا؟"
فرح کے ہونٹ بھینچ گئے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ دوسری طرف فون کے قریب عبداللہ بھی ہو گا۔ اس نے اس کی آواز پہچاننے کے بعد اپنے آدمی کو بولنے کا اشارہ کیا ہو گا۔
فرح خاموش رہی تو چند لمحے دوسری طرف سے کہا گیا۔ "تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟"
"میری خاموشی ہی کو میرا جواب سمجھو۔" فرح نے اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔
دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی' پھر سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سنائی دی۔

فرح نے کھوئے کھوئے سے انداز میں آہستگی سے ریسیور رکھا اور وہیں کھڑی سوچتی رہ گئی کہ اس کا "جواب خاموشی" عبداللہ کب تک برداشت کرے گا؟

گزشتہ روز سے ہی یہ سوچ سوچ کر فرح کا دماغ پک چکا تھا کہ عبداللہ کا دوسرا داؤ کیا ہو سکتا ہے؟

یہ بات اس کی سمجھ میں دوسرے دن اس وقت آئی جب ٹیلی فون پر اس نے ماسٹر کو جواب دیا۔ "آج بھی خاموشی ہی کو میرا جواب سمجھو۔"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد دوسری طرف سے کہا گیا۔ "اب تمہارے فیصلے کا انتظار بس کل تک اور کیا جائے گا۔ تم ذرا اپنی چھوٹی بہن کا خیال رکھنا۔ وہ میرے کچھ آدمیوں کو پسند آگئی ہے۔"

اس کے بعد فرح کے جواب کا انتظار کیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

فرح اس وقت کانپ گئی۔ جو کچھ اس سے کہا گیا تھا' وہ ایک صاف صاف' کھلی دھمکی تھی۔ اگر وہ عبداللہ کی بات نہ مانتی ت وہ غزالہ کو اغوا کروالیتا اور یہ ہوتا اس کا دوسرا داؤ۔

پھر اپنے کمرے میں جا کے وہ بستر پر گر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس بھی تھا اور بے بسی کے احساس سے پلکیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

خاصی دیر تک سوچ و بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اسے ایک بار پھر سلطان صاحب سے مل کر عبداللہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہئیں۔ اس کے بعد ہی وہ ایک قطعی اندازہ لگا سکتی تھی کہ عبداللہ کے خلاف کچھ کرنا اس کے لیے ممکن ہو گا یا نہیں؟

سوچ و بچار میں اتنا وقت گزر گیا کہ غزالہ اپنے کالج سے لوٹ آئی۔ اس کے بعد ہی فرح کپڑے تبدیل کر کے دفتر جانے کے لیے تیار ہوئی۔

"اس وقت کہاں جا رہی ہیں باجی!" غزالہ نے پوچھا۔ "میں تو کھانا گرم کر رہی ہوں۔"

"مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔ میں ایک ضروری

ادب سے......!

توبہ شکن تواضع

اُڑنے سے پیشتر ایک رس بھری آواز نے براہ مائیکروفون "میں خوشامد کی حد تک خوش آمدید کہا اور خوشامد کا مزا ابھی منہ ہی میں تھا کہ بوئنگ فضا میں بلند ہوا۔ جب ذرا بہار آفریں بلندی پر پہنچا تو تواضع کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے لگار آئے، پھر ناشتہ آیا، پھر سگار آئے اور آخر سوال آئے۔ "کچھ پیجئے گا؟ کچھ پڑھیے گا؟ سر کے نیچے تکیہ رکھ دوں؟ پاؤں کے نیچے دل رکھ دوں؟ اپنی جاں نظر کروں؟ اپنی وفا پیش کروں؟" خدا جانے اس توبہ شکن تواضع نے کتنے شوہروں کے مزاج بگاڑے اور گھر اجاڑے ہوں گے! (کرنل محمد خان)

کیسی کیسی ترقیاں!

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے شورکوٹ نے خوب ترقی کی۔ سینما پکی چار دیواری والے احاطے میں منتقل ہوا۔ سبزی فروشوں نے سبزیوں کے اُردو نام سیکھے۔ پہلے "بینگن" کو "بتوؤں" کہتے تھے، پھر "ویگن" کہنے لگے۔ "شلجم" پہلے "گونگلو" ہوتے تھے، بعد میں "شلغم" ہوئے۔ "پیاز"، "گنڈھوں" سے "بصل" بنے۔ کیسی کیسی ترقیاں ہوئیں:

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی (اختر حسین شیخ)

کام سے جا رہی ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں لوٹوں گی تو کھا لوں گی۔ تم ابا کے ساتھ کھالینا۔"

پھر غزالہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فرح کے قدم دروازے کی طرف اٹھ چکے تھے۔

پون گھنٹے بعد وہ سلطان صاحب کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور سلطان صاحب متفکرانہ اور مستفسرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"سر!" فرح نے کہا۔ "کیا آپ مجھے عبداللہ کے بارے میں تفصیل سے بتا سکتے ہیں؟"

"وہ تو میں نے تمہیں اسی دن بتا دیا تھا!"

"کیا وہ پولیس سے چھپ کر روپوشی کی زندگی گزارتا ہے؟"

"بالکل نہیں۔" سلطان صاحب نے جواب دیا "وہ بڑے طنطنے کے ساتھ اپنی شاندار کوٹھی میں رہتا ہے۔"

"تو پولیس اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی؟"

"جانتی تو ہوگی۔" سلطان صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے "لیکن پولیس کے پاس اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے یا وہ حکومتی سطح پر اتنا اثر رسوخ رکھتا ہے کہ پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈال پاتی۔"

"گویا میں اگر پولیس سے فریاد کروں تو کچھ نہیں ہوگا؟"

"اگر پولیس کی لاٹھی کے سہارے عبداللہ کے مقابلے پر کھڑا ہوا جا سکتا تو مجھ جیسے کئی افراد ایسا کیے ہوتے۔ میں اسی لیے اس سے خوف زدہ ہوں کہ اگر میں نے اس کی کوئی بات نہیں مانی تو وہ برباد کر دے گا اور میں کسی سے بھی کوئی مدد حاصل نہیں کر سکوں گا۔"

"گویا ہم ایک اندھیر نگری میں رہ رہے ہیں!" فرح نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ہاں۔ یہ کہا جا سکتا ہے۔" سلطان صاحب نے سر ہلایا، پھر بولے۔ "میں نے تمہیں یہ شہر چھوڑ دینے کا مشورہ کچھ سوچ کر ہی دیا تھا۔ تمہارے حق میں یہی ہوگا فرح کہ تم یہ شہر چھوڑ کر کہیں چلی جاؤ۔"

"وہ کہاں رہتا ہے؟" فرح نے پوچھا۔

"تم کیا سوچ رہی ہو فرح!" سلطان صاحب نے پرتشویش انداز میں دیکھا۔

"ابھی تو میرے ذہن میں کوئی خاص بات نہیں ممکن ہے شاید میں کسی وقت اس سے ملنے جاؤں اور اس سے التجا کروں کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔"

"وہ ایک پتھر دل شخص ہے فرح! اس پر کسی کی بھی التجا اثر انداز نہیں ہو سکتی۔"

"آپ مجھے اس کا پتا تو دے دیں۔"

"لکھ لو۔" سلطان صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

فرح نے قلم سنبھالا اور سلطان صاحب کا بتایا ہوا پتا ایک کاغذ پر لکھ کر اپنے پرس میں ڈال لیا۔

"اب میں اجازت چاہوں گی سر!" وہ کھڑی ہو گئی۔

سلطان صاحب نے اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا اور بولے "میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔"

فرح ان کے کمرے سے نکل آئی۔ عبداللہ کا پتا لیتے وقت اس کے ذہن میں واقعی کوئی خاص خیال نہیں تھا۔ اس نے بس اتنا سوچا تھا کہ شاید اسے کسی وجہ سے عبداللہ کے پتے کی ضرورت پڑ ہی جائے!

ٹیکسی کر کے وہ واپس اپنے گھر پہنچ گئی۔

"پرویز بھائی کا فون آیا تھا باجی!" غزالہ نے اسے دیکھتے ہی بتایا۔ "اس شہر سے اتنی دور جا کے آپ کی طبیعت کی وجہ سے اور زیادہ پریشان ہیں۔ پہلے انہوں نے آپ کے دفتر فون کیا تھا۔ وہاں سے انہیں معلوم ہوا کہ آپ ایک ہفتے کی چھٹی پر ہیں۔ تو انہوں نے یہاں فون کیا۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے اور اس وقت آپ کسی سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔"

"فون کب آیا تھا؟" فرح نے آہستہ سے پوچھا۔

"بس جب آپ گئی تھیں، اس کے پانچ منٹ بعد ہی آیا تھا۔ میرے جواب سے ان کی فکر مندی ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ کل شام تک نہ آ سکے تو پرسوں ضرور آ جائیں گے۔"

فرح سر ہلا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

"کھانا نکالوں باجی؟" غزالہ نے پوچھا، پھر بولی "ابا کو تو میں نے کھانا کھلا دیا ہے لیکن میں نے نہیں کھایا۔ اب آپ کے ساتھ کھاؤں گی۔"

"اچھا۔"

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور کوشش کرنے لگی کہ اپنے چہرے سے فکر مندی اور پریشانی کے آثار ختم کردے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ غزالہ اس کی فکر مندی کے بارے میں پوچھنے لگے۔

کھانے کے بعد فرح اپنے والد کے کمرے میں گئی اور تھوڑی دیر ان کے ساتھ بیٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

اس دن بہت سے خیالات کے ساتھ اس کے ذہن میں یہ بات بھی آئی تھی کہ وہ خودکشی کرکے اپنے آپ کو ذلت سے بچالے یا عبداللہ سے مل کر چالاکی سے کام لیتے ہوئے اس کے سینے میں چاقو اتار دے لیکن سوچ بچار کے بعد اسے یہ دونوں ہی باتیں مناسب نہیں معلوم ہوئی تھیں۔ اول تو عبداللہ جیسے شاطر آدمی کو ہلاک کرنا ہی اس کے لیے شاید ممکن نہ ہوتا اور اگر ممکن ہو بھی جاتا تو اسے قتل کے جرم میں پھانسی یا عمر قید کی سزا بھگتنا پڑتی۔ اس صورت میں اس کے بیمار والد اور اس کی بہن بے سہارا ہوجاتے۔ بالکل یہی صورت اس وقت بھی پیدا ہوتی جب وہ خود کو ہلاک کرڈالتی۔

ان خیالات کے باعث اس کا دن تو کرب میں گزرا ہی تھا لیکن رات کو بھی اسے بہت دیر سے نیند آئی۔ صبح وہ اپنے وقت پر نہ جاگ پاتی اگر غزالہ نے اسے جگایا نہ ہوتا۔ یہ غزالہ کا معمول تھا کہ وہ اپنے والد اور فرح کو ناشتا کرانے کے بعد ہی کالج جایا کرتی تھی۔

غزالہ کے جانے کے پندرہ منٹ بعد "ماسٹر" کا فون آگیا۔

"اب کیا فیصلہ ہے تمہارا؟" فرح سے پوچھا گیا۔

"میں کس وقت آجاؤں" فرح نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"گڈ!" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "اب تم نے دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ تم آدھے گھنٹے بعد اپنے گھر سے نکلو اور مین روڈ پر کسی طرف پیدل چل پڑو۔ کسی جگہ ایک کار تمہارے قریب آکر رکے گی۔ تم اس میں بیٹھ جانا۔"

"مجھے تمہارا گھر معلوم ہے۔ میں وہیں پہنچ جاؤں گی۔"

نہیں۔" سخت لہجے میں کہا گیا" جیسا کہا گیا ہے، وہی کرو۔"

"اچھا" فرح نے شکستہ لہجے میں کہا۔

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہوگیا۔

☆☆☆

اور اس دن سے فرح، عبداللہ کی داشتہ بن گئی۔

عبداللہ نے اسے دو گھنٹے بعد رخصت کرتے ہوئے کہا تھا "تم مجھے بہت اچھی لگی ہو فرح! ابھی ایک مہینہ تو ایسا گزرے گا کہ میں ہفتے میں ایک دو بار تمہاری میزبانی کا شرف حاصل کرتا رہوں گا، البتہ ایک ماہ بعد میں تم سے کوئی سروکار نہیں رکھوں گا۔ تم اطمینان سے سلطان کے دفتر میں کام کرتی رہنا۔"

لیکن اطمینان تو فرح کی زندگی سے رخصت ہوچکا تھا۔ وہ خود کو ایک زندہ لاش محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی بہن کی خاطر خود کو قربان کردیا تھا۔

اس رات جب وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی تو اس کی آنکھیں رو رو کر خشک ہوچکی تھیں اور اب ان میں بس ویرانی سی پھیلی ہوئی تھی۔

نو بجے کے قریب پرویز آیا۔ اس وقت تک فرح نے پرویز کے سلسلے میں ایک فیصلہ کرلیا تھا لہٰذا اس نے اس سے ملنے سے گریز نہیں کیا۔

"یہ تمہاری کیا حالت ہے فرح!" پرویز اسے دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ "ٹیلی فون پر تو غزالہ نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک ہوگئی ہے!"

"میری طبیعت ٹھیک ہے۔" فرح نے سپاٹ لہجے میں کہا "تم میرے بارے میں فکر مند ہونا چھوڑ دو۔"

کیا!" پرویز اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

غزالہ چائے بنانے کے بہانے وہاں سے کچن میں چلی گئی تھی۔

"ٹیلی فون پر غزالہ نے تم سے غلط نہیں کہا تھا۔"
فرح بولی "لیکن آج میری طبیعت پھر کچھ خراب ہے۔ مجھے اس سلسلے میں کوئی تشویش نہیں۔ ایک آدھ دن میں پھر ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"لیکن یہ تم نے کیا کہا کہ میں تمہارے لیے فکر مند ہونا چھوڑ دوں!"

"یہ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو!"

"میں نے کوئی غلط بات نہیں کی ہے۔ میں اب اپنے کمرے میں جا کے آرام کرنا چاہتی ہوں۔" فرح کھڑی ہو گئی۔

"فرح!" پرویز بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن فرح نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا "غزالہ چائے بنا کر لا رہی ہے۔ تم اس سے گپ شپ کر کے چلے جانا۔ میرے آرام میں خلل اندازی نہ کرنا۔" وہ تیزی سے چلتی ہوئی نشست کے کمرے سے نکل آئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور بستر پر جا گری۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے تھے۔ پرویز سے اتنی سرد مہری کے ساتھ پیش آتے ہوئے اس کا کلیجا خون ہو رہا تھا لیکن اب وہ ضروری سمجھ رہی تھی کہ خود کو کسی طرح بھی پرویز سے دور کر لے۔ وہ اب خود کو گندگی کا ایک ڈھیر سمجھ رہی تھی اور اپنے محبوب کو اس گندگی سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق اب وہ اس قابل نہیں رہی تھی کہ پرویز کی شریک زندگی بنتی۔ اب ضروری ہو چکا تھا کہ ان دونوں کے راستے ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

دوسرے دن وہ اپنے دفتر پہنچ گئی۔ اس نے سلطان صاحب کے کمرے میں جا کر ان سے کہا "میری باقی چھٹیاں منسوخ کر دیجیے سر!"

سلطان صاحب نے مغموم انداز میں فرح کی طرف دیکھا "کل عبداللہ کا فون آیا تھا کہ تمہاری ملازمت بحال رکھی جائے۔"

فرح نے نظریں جھکا لیں۔

سلطان صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تم نے میرا مشورہ نہیں مانا کہ یہ شہر چھوڑ دو۔"

"یہ ممکن نہیں تھا سر! عبداللہ مجھے یہاں سے نکلنے نہیں دیتا۔ دوسرے یہ میرے لیے یوں بھی ممکن نہیں تھا کہ کہیں اور جا کے مجھے اتنی اچھی ملازمت ملنا بہت مشکل ہوتا اور یہ ملازمت میں اپنے لیے نہیں کر رہی ہوں سر! اس ملازمت کا مقصد اپنے والد کا علاج جاری رکھنا اور پیسہ جمع کر کے اپنی چھوٹی بہن کی شادی کرانا ہے۔"

"تم نے اس کے لیے بہت بڑی قربانی دی ہے۔"

فرح کی نظریں جھکی رہیں۔ "اس اندھیر نگری میں پیدا ہونا جب مجھ جیسی لڑکیوں کا مقدر ہو تو کچھ بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔"

"تم نے آتے ہی کہا تھا کہ تمہاری چھٹیاں منسوخ کر دی جائیں۔ تم چند دن آرام کیوں نہیں کر لیتیں!"

"میرا ذہن اتنا منتشر ہے کہ میرے لیے مصروف رہنا ہی زیادہ بہتر ہوگا۔"

"میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تم جیسی اچھی لڑکی کس کیفیت میں ہو گی۔ خیر! کل سے کام پر آ جانا۔ تمہاری جگہ جو شخص کام کر رہا ہے، اس سے میں آج کسی وقت کہہ دوں گا کہ تم کل سے اپنی ڈیوٹی پر واپس آ رہی ہو۔"

"بہتر ہے۔" فرح کھڑی ہو گئی۔ "میں کل سے آ جاؤں گی۔"

☆☆☆

پھر دس دن گزر گئے۔ ان دس دنوں میں عبداللہ نے فرح کو دو مرتبہ پھر بلایا۔ فرح بے چون و چرا چلی بھی گئی تھی۔ اس کی نظر میں اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی کہ عبداللہ اسے دو مرتبہ بلاتا ہے یا دس مرتبہ!

فرح کے وجود میں تلخیاں کھل چکی تھیں۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال ابھرنے لگا تھا کہ اب وہ خود کو ایک بری آمدنی کا ذریعہ بنا لے تو کیا حرج ہے!

گیارہویں دن اس کی نظر اخبار کے ایک اشتہار پر پڑی۔ ایک فلم ڈائریکٹر کو اپنی نئی فلم شروع کرنے کے لیے ایک نئی لڑکی کی ضرورت تھی جسے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کرنا تھا۔

فرح نے فوراً اشتہار میں دیے گئے پتے پر اپنی ایک اچھی سی تصویر کے ساتھ خط بھیج دیا جس میں فلم ایکٹریس بننے کی خواہش کا اظہار تھا۔

فرح نے رسائل وجرائد میں خوب پڑھا تھا کہ فلم انڈسٹری کا رخ کرنے والی لڑکیوں کو کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ خود کو ان مراحل سے گزارنے کے لیے ذہنی طور سے بالکل تیار تھی۔

اب اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس نے سوچا تھا۔

ان دنوں میں پرویز صرف ایک مرتبہ اور آیا تھا اور فرح اس سے پہلے ہی کی طرح روکھے انداز میں پیش آئی تھی۔ اس کے بعد پرویز نے آنا چھوڑ دیا تھا لیکن فرح کو شبہ تھا کہ وہ ٹیلی فون پر غزالہ سے اس کے بارے میں پوچھتا رہتا ہوگا۔

فرح کے ہونٹوں سے مسکراہٹ بالکل غائب ہوگئی تھی اور اس کی اس کیفیت کو نہ صرف غزالہ نے بلکہ اس کے والد امجد صاحب نے بھی محسوس کرلیا تھا۔ انہوں نے کئی مرتبہ فرح کو ٹٹولنا چاہا تھا لیکن فرح انہیں یہ کہہ کر ٹالتی رہی کہ ان دنوں اس کی طبیعت کچھ مضمحل رہنے لگی ہے۔

"تو یہ ملازمت چھوڑ دیجیے نا باجی!" غزالہ نے امجد صاحب کے سامنے ہی اس سے کہا تھا۔

"میں اپنا مشن ادھورا نہیں چھوڑ سکتی۔" فرح نے بہت ہی سخت لہجے میں جواب دیا۔ "بہتر ہوگا کہ مجھ سے اس سلسلے میں پھر کبھی بات نہ کی جائے۔"

امجد صاحب پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس کا منہ تکتے رہ گئے اور غزالہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں مگر ان دونوں کو اس کا علم نہیں ہوسکا تھا کہ بعد میں فرح اپنا کمرا بند کرکے کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔

پھر جب اس نے فلم لائن میں جانے کا فیصلہ کیا تو فوری طور پر اپنے والد یا غزالہ سے کچھ نہیں کہا لیکن جب چوتھے دن اسے بذریعہ خط، انٹرویو کے لیے بلایا گیا تو رات کے کھانے کے بعد اس نے کہا۔

"ابا! چند دن پہلے اخبار میں ایک اشتہار آیا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے خط لکھ دیا تھا۔ آج مجھے اس کا جواب مل گیا ہے۔ کل مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا ہے۔"

"کیا تمہاری موجودہ ملازمت ختم ہونے والی ہے؟" امجد صاحب نے چونک کر پوچھا۔

"جی نہیں، بات ملازمت کی نہیں ہے۔" فرح نے جواب دیا "اگر میں کل کے انٹرویو میں کامیاب رہی تو مجھے ایک فلم میں مرکزی کردار ادا کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

غزالہ حیرت سے فرح کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟" امجد صاحب بگڑ کر کہا۔

"اس میں دماغ خراب ہونے کی کیا بات ہے ابا!" فرح نے دل کڑا کر کے جواب دیا "فلم لائن میں کامیابی حاصل ہوجائے تو دولت، شہرت، سب ہی کچھ مل جاتا ہے اور آج کی دنیا میں دولت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔"

"تم جانتی ہو کہ اس دولت کے لیے فلم لائن میں جانے والی لڑکیوں کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے؟" امجد صاحب کی سانس زیادہ پھولنے لگی۔

"کوئی بھی ایسی بات نہیں ہے ابا جو کچھ اخبارات میں آتا ہے، سب جھوٹ ہے۔" فرح نے سب کچھ جاننے کے باوجود ڈھٹائی سے کہا "اگر انسان خود اچھا ہو تو کوئی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"یہ بچکانہ سوچ ہے تمہاری! اس لائن میں جانے والی لڑکیاں بالکل بے بس ہوجاتی ہیں۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔" فرح نے ہمت کر کے کہا "آپ میری ترقی کے راستے میں حائل نہ ہوں ابا!"

"پاگل ہوگئی ہے تو!" امجد صاحب چیخ پڑے اور اس کے ساتھ ہی ان پر کھانسی کا دورہ پڑا۔

"ابا کو سنبھالو غزالہ!" فرح نے کھڑے ہوئے

ہوئے کہا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی آنکھوں کی طرف جو آنسو امنڈ رہے تھے، انہیں وہ اپنے والد اور بہن سے چھپانا چاہتی تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کرلیا اور آنکھوں سے آنسو بہاتی، بستر پر جاگری۔ اسے شدید قلق ہوا تھا کہ آج اس نے اپنے باپ سے پہلی مرتبہ گستاخانہ انداز میں بات کی تھی لیکن اس کے خیال کے مطابق وہ اس کے لیے مجبور تھی۔ فلم انڈسٹری میں جانے کے لیے اسے اپنے سب ہی لوگوں کی مخالفت مول لینا پڑتی جس کے لیے اس نے خود کو پوری طرح تیار کرلیا تھا۔ فلم انڈسٹری میں جانے کا فیصلہ اس نے صرف دولت کے لیے نہیں بلکہ انتقام کے لیے بھی کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس نے فلم انڈسٹری میں کوئی بڑا مقام حاصل کرلیا تو وہ اپنے تعلقات کا دائرہ وسیع کرسکتی تھی۔ اسے کوئی ایسا شخص تلاش کرنا تھا جو عبداللہ سے زیادہ طاقت ور ہو اور وہ اس کے ذریعے عبداللہ سے انتقام لے سکے۔

کچھ دیر میں اس نے اپنے جذبات پر قابو پالیا اور باتھ روم میں جا کر منہ دھویا۔ دوبارہ بستر پر لیٹنے سے پہلے اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

اس کا خیال تھا کہ غزالہ اس کے پاس ضرور آئے گی۔ لیکن غزالہ جلدی نہیں آئی۔ فرح نے اسے ایک گھنٹے بعد اپنے کمرے میں دیکھا اور فوراً اسے پوچھا ''ابا کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''باجی!'' غزالہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''اگر آپ کو ابا کی طبیعت کا اتنا ہی خیال ہے تو آپ کو ان سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔''

''میں ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔'' فرح جھنجھلائی

''اب معمول کے مطابق ہے۔'' غزالہ نے آہستہ سے جواب دیا ''مجھے آپ کے پاس آنے میں اتنی دیر اسی لیے ہوئی کہ میں انہیں بہلا رہی تھی۔ اسی سے ان کی پھولی ہوئی سانس قابو میں آتی ہے۔''

''بیٹھو!'' فرح نے اپنا لہجہ نرم کرلیا۔

غزالہ اس کے بستر پر ہی بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر افسردگی تھی۔

فرح نے محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔ ''دیکھو، رونا نہیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے، اس لیے کیا ہے کہ میری بہنوں کی آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔ ہاں البتہ اب میں جو کچھ کرنا چاہتی ہوں، اپنے لیے کرنا چاہتی ہوں۔''

''آپ آخر اپنے لیے کیا کرنا چاہتی ہیں؟ کچھ دن سے آپ کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے کہ آپ کے رویے سے پرویز بھائی بھی بہت افسردہ رہنے لگے ہیں۔ اب وہ آپ کا یہ فیصلہ سنیں گے تو ان پر نہ جانے کیا گزر جائے گی۔''

''مشکل یہ ہے کہ دوسرے کے دل پر کیا گزر رہی ہے، اس سے دنیا کو کوئی غرض نہیں ہوتی۔'' فرح کا لہجہ مغموم ہوگیا۔

''دنیا کو معلوم تو ہو کہ دوسرے کے دل پر کیا گزر رہی ہے!''

''کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنا درد کسی کو بتانے سے قاصر ہوتا ہے۔''

''کم از کم اپنوں کو تو دکھ درد میں شریک کیا جاتا ہے۔''

''میں نے کہا نا کہ یہ کبھی ممکن نہیں ہوتا۔''

''ابا آپ کے اس فیصلے سے کبھی خوش نہیں رہ سکیں گے۔ میں انہیں بہت اداس چھوڑ کر آئی ہوں۔ انہیں آج اپنی بے بسی کا احساس بڑی شدت سے ہوا ہے۔''

''میں اب ان سے اس موضوع پر بات نہیں کروں گی لیکن تم انہیں سمجھانے کی کوشش کرنا۔ میں کسی خاص وجہ سے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئی ہوں۔''

''وہ خاص وجہ کیا ہے باجی؟''

''کیا میں بار بار دہراتی رہوں کہ میں وہ بتانے سے قاصر ہوں!''

غزالہ چپ ہوگئی۔

فرح نے اسے پیار کیا اور بولی ''جاؤ اب

جا کے آرام کرو۔"

"کل آپ انٹرویو کے لیے جائیں گی؟"

"وہ تو میں بتا ہی چکی ہوں۔"

"کس وقت جائیں گی۔"

"مجھے وہاں دو بجے پہنچنا ہے۔ کل تم کالج سے جلدی آجانا۔"

"اچھا۔" غزالہ نے آہستہ سے کہا۔

"اب تم جاؤ۔"

غزالہ چلی گئی۔

فرح لیٹ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس معاملے میں ابھی اسے پرویز کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اس کا قوی امکان تھا کہ غزالہ اسے فون پر اس صورت حال سے آگاہ کر دیتی۔ یہ اندازہ ہونے کے باوجود اس نے غزالہ سے نہیں کہا تھا کہ وہ پرویز کو کچھ نہ بتائے۔ یہ بات ایسی تھی ہی نہیں کہ زیادہ عرصے تک پرویز سے پوشیدہ رہ سکتی۔

دوسری صبح ناشتے پر فرح کا سامنا اپنے والد سے ہوا لیکن وہ ان سے کچھ نہیں بولی، نظریں جھکائے ناشتا کرتی رہی۔ امجد صاحب نے ابھی اس سے کچھ نہیں کہا۔ ناشتا کر کے وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد غزالہ کالج کے لیے رخصت ہوئی۔

فرح بستر پر لیٹی اپنے خیالات میں گم تھی کہ کال بیل کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کمرے سے نکلی۔

بیرونی دروازے کے باہر پرویز کھڑا تھا۔

فرح اسے دیکھ کر چونکی نہیں اور ایک طرف ہٹ کر بولی "آؤ۔"

پرویز اندر آ گیا تو فرح نے دروازہ بند کیا۔

"آج دفتر نہیں گئے؟" فرح نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"فون کر دیا تھا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی تاخیر سے پہنچوں گا۔"

"کیوں؟"

"میں تم سے اسی وقت مل لینا چاہتا تھا۔"

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ چکے تھے۔

فرح بولی "غزالہ نے فون کیا ہوگا تمہیں!"

"ہاں۔" پرویز نے سنجیدگی سے جواب دیا "وہ چاہتی ہے کہ میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کروں۔"

"وہ مجھے ناسمجھ سمجھتی ہے!"

"نہیں۔ اسے بس یہ شبہ ہے کہ تم کسی خاص چکر میں پھنس گئی ہو!"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" فرح نے منہ بنایا۔

"پھر تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟"

"فلم انڈسٹری میں جانے کا؟"

"ہاں۔"

"ترقی کی کوشش کرنا ہر انسان کا حق ہے۔"

"ایسی ترقی؟"

"کیوں؟ اس میں کیا برائی ہے؟"

"اسے تم خوب سمجھتی ہوگی۔"

"مجھے اس میں کوئی برائی نظر نہیں آ رہی ہے۔"

"خیر! فی الحال میں اس موضوع کو چھوڑ کر تم سے ایک اور بات کروں گا۔ کچھ دن سے میرے ساتھ بھی تمہارا رویہ ٹھیک نہیں ہے۔ تم ایسی باتیں کرتی رہی ہو جیسے تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی لیکن مجھے تمہاری آنکھوں میں یہ بات نہیں دکھائی دی۔ تمہاری باتیں مجھے مصنوعی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر وہ مجھے سچی معلوم ہوتیں تو میرے دل پر جو کچھ بھی گزرتی لیکن میں یہاں آنا چھوڑ دیتا۔ تمہارے اس رویے کے پس منظر میں کوئی ایسی بات ہے جو تم سب سے چھپا رہی ہو۔"

پرویز کی یہ باتیں فرح کو جذباتی کرنے لگی تھیں لیکن اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا "غلط خیال ہے تمہارا۔"

"میں نہیں مان سکتا۔" پرویز نے کہا "آج تمہیں اپنے رویے کا سبب بتانا ہی پڑے گا فرح! اور میں یہ بھی معلوم کر کے رہوں گا کہ تم نے فلم انڈسٹری میں جانے کا فیصلہ کیوں کیا ہے!"

"میں تمہیں اپنے معاملات میں اس حد تک دخیل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتی۔"

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ تمہارے دل کی آواز نہیں ہے۔ میں تمہیں فلم انڈسٹری کا رخ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"تم کون ہوتے ہو مجھے اجازت دینے یا نہ دینے والے!" فرح ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی "بہتر ہوگا کہ مجھ پر زیادہ حق نہ جتاؤ۔"

"میرا حق ہے تم پر!" پرویز نے زور دے کر کہا۔

"ایسا کوئی حق نہیں ہے تمہارا کہ میں تمہارا کوئی دباؤ قبول کروں۔ بہتر ہوگا کہ مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔ اگر چاہو تو ابا سے ملتے جانا۔" فرح نے کہا اور جانے لگی۔

"فرح۔۔۔"

"میں اب تمہاری کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔"

پرویز اسے روکنے میں ناکام رہا۔ فرح نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ اس وقت اس کی آنکھیں ایک بار پھر آنسوؤں سے بھیگ چکی تھیں۔

ایک گھنٹا گزر جانے کے بعد اسے یقین ہوگیا کہ پرویز اب چلا گیا ہوگا۔ اس نے سکون کی سانس لی۔ مزید ڈیڑھ گھنٹا اس نے بستر پر پڑے پڑے گزار دیا، پھر اٹھ کر غسل خانے میں گئی۔ نہا دھو کر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور پھر بال بنانے میں مصروف ہوگئی۔ اس نے ایک خاص انداز میں بال سیٹ کیے اور پھر میک اپ کرنے میں مصروف ہوئی۔ اس نے اتنا گہرا میک اپ کیا جو ساری زندگی میں نہیں کیا تھا۔

جب غزالہ کالج سے لوٹی تو فرح روانگی کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

"تم ٹھیک وقت پر آگئیں، اب میں چلتی ہوں۔" فرح نے کہا۔

"آپ نے کھانا کھالیا؟" غزالہ نے پوچھا۔

"تمہارے بغیر کھانے کو جی نہیں چاہا اور اب اتنا وقت نہیں ہے کہ کھانے کے لیے رکوں۔ میں واپس آکر کھالوں گی۔ تم میرا انتظار نہ کرنا، ابا کے ساتھ کھالینا۔"

غزالہ کچھ نہیں بولی۔ فرح گھر سے روانہ ہوگئی۔

"ماسٹر فلمز" کے دفتر میں اس کا نمبر کئی لڑکیوں کے بعد آیا تھا اور پھر وہ ایک خوف ناک تجربے سے گزری تھی۔

آدھی کھوپڑی کا وہ خوف ناک ماسک اس وقت بھی خیالوں میں اس کا پیچھا کرتا رہا تھا جب وہ ماسٹر فلمز کے دفتر سے بھاگ کر واپس اپنے گھر پہنچی تھی۔

گھر پر غزالہ کے ساتھ پرویز بھی موجود تھا۔

اس دن بھی فرح اس سے اسی طرح پیش آئی تھی جس طرح کچھ دن سے پیش آتی رہی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن اتوار تھا۔ فرنانڈس دس بجے کے قریب فرح کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال جم چکا تھا کہ اس کی فلم کے لیے فرح سے بہتر لڑکی کا ملنا مشکل ہے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ فرح کی خوف زدگی ایک وقتی بات تھی۔

دو مرتبہ کال بیل کا بٹن دبا کر وہ اطمینان سے کھڑا ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگا اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس طرف متوجہ ہوا۔ دروازہ کھولنے والی لڑکی سولہ سترہ سال سے زیادہ کی نہیں تھی۔ فرنانڈس نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

"فرمایئے!" لڑکی ناگواری سے بولی" غالباً اسے فرنانڈس کے دیکھنے کا انداز گراں گزر گیا تھا۔

اس کی آواز نے فرنانڈس کو جیسے چونکا دیا، پھر وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "تم میں فرح کی خاصی مشابہت ہے۔"

"میں ان کی چھوٹی بہن ہوں۔ آپ باجی سے ملنے آئے ہیں؟"

"ہاں۔"

"آپ کا نام؟ غزالہ نے پوچھا۔

"فرنانڈس۔"

"کیا آپ ان کے دفتر میں کام کرتے ہیں؟"

"تم انہیں بس میرا بتا دو۔"

"اچھا! آپ ذرا ٹھہریں۔"

"ٹھیک ہے۔"

غزالہ نے دروازہ بند کرلیا۔

خاصی ٹیڑھی لڑکی معلوم ہوتی ہے، فرنانڈس نے سوچا، لیکن ہے بلا کی خوب صورت! اسے کسی فلم میں لیا جاسکتا ہے!

لیکن فی الحال فرنانڈس جو فلم بنا رہا تھا، اس کے لیے تو اس کے ذہن میں فرح ہی جمی ہوئی تھی۔

ذرا دیر بعد دروازہ پھر کھلا۔

"تشریف لائیے!" غزالہ نے سرد مہری سے کہا۔

"شکریہ بے بی!" فرنانڈس نے جواب میں کچھ کہنا خواہ مخواہ ضروری سمجھا۔

غزالہ نے اسے نشست کے کمرے میں بٹھایا اور اندر چلی گئی۔ اسی دروازے سے چند لمحے بعد فرح اندر آئی۔

"میں بہت خوش ہوں کہ تم اس وقت اپنے گھر پر مل گئیں۔" فرنانڈس نے مسکرا کر کہا "کل تم کچھ زیادہ ہی ڈر گئی تھیں۔"

"اگر آپ مجھ سے اسی سلسلے میں ملنے آئے ہیں تو میں کہوں گی کہ آپ اپنا وقت ضائع کریں گے۔ ہاں اگر آپ کا ذہن مجھے کوئی اور کردار دینے کے لیے تیار ہو گیا ہو تو دوسری بات ہے۔"

"میں نے تمہیں جس کردار کے لیے منتخب کیا ہے، وہی تمہیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا سکے گا۔"

"فرنانڈس صاحب!" فرح نے سنجیدگی سے کہا "میں نے اسے بداخلاقی سمجھا تھا کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں اور میں آپ سے نہ ملوں، لیکن یہ آپ اپنے ذہن سے نکال دیجیے کہ میں وہ خوف ناک کردار کرنے کے لیے تیار ہو جاؤں گی۔"

"وہ کردار فلم دیکھنے والوں کے لیے تو خوف ناک ہو سکتا ہے لیکن تم اس سے کیوں خوف زدہ ہو؟"

"پلیز! اس موضوع پر کوئی بات ہی نہ کیجیے۔ میں آپ کی بے حد شکر گزار رہوں گی اگر آپ مجھے کوئی دوسرا کردار دے سکیں۔ فلم میں کام کرنا اب میری زندگی کا ایک مقصد بن چکا ہے لیکن میں وہ کردار نہیں کر سکتی جو آپ چاہتے ہیں۔"

"مگر کیوں؟" فرنانڈس نے حیرت سے کہا "میرا خیال تھا کہ تم وقتی طور پر خوف زدہ ہو گئی تھیں لیکن تم اب بھی۔"

"یوں سمجھ لیجیے کہ یہ میرا ایک کامپلیکس ہے۔"

فرح نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میں کھوپڑی کی تصویر بھی دیکھ لوں تو خوف زدہ ہو جاؤں گی۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی!" فرنانڈس کی ہنسی میں بھی حیرت تھی۔

"جو حقیقت تھی، وہ میں نے آپ کو بتا دی۔ آپ چائے پئیں گے یا۔۔۔"

"کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔" فرنانڈس نے کہا "میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ تم میری فلم میں۔۔۔"

"فرنانڈس صاحب!" فرح نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "مجھے اس بداخلاقی پر مجبور نہ کیجیے کہ میں اٹھ کر اندر چلی جاؤں۔"

فرنانڈس متفکرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

فرح بولی "میں نے آپ کو جو خط لکھا تھا اس میں اپنے پتے کے ساتھ میں نے اپنا ٹیلی فون نمبر بھی لکھا تھا۔ آپ مجھے فون کر لیتے تو بہتر ہوتا۔ یہاں آنے سے آپ کا زیادہ وقت ضائع ہوا۔"

"اچھا!" فرنانڈس نے ایک طویل سانس لی "کیا یہ تمہارا قطعی فیصلہ ہے؟"

"جی ہاں۔"

"تو پھر میں چلتا ہوں۔" فرنانڈس کھڑا ہو گیا "اگر تم نظر ثانی کے بعد اپنا فیصلہ تبدیل کر لو تو مجھے فون کرتے ہوئے ہچکچانا نہیں۔"

"فیصلے میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

فرح بھی کھڑی ہو گئی اور پھر اس نے فرنانڈس سے بھی پہلے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

فرنانڈس نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے

کہا ”میں اس امید کے ساتھ جا رہا ہوں کہ تم اپنے فیصلے پر غور ضرور کرو گی۔“

”اس امید میں اپنا زیادہ وقت ضائع نہ کیجیے گا۔“ فرح نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

فرنانڈس جب اپنی کار میں وہاں سے روانہ ہوا تو فرح کی طرف سے مایوسی کے ساتھ اس کے تصور میں غزالہ کا سراپا بار بار ابھرتا رہا۔

واپس وہ اپنے گھر ہی پہنچا۔ اس کی بیوی اسے دیکھتے ہی بولی ”عبداللہ صاحب کا فون آیا تھا۔“

”کب؟“ فرنانڈس نے جلدی سے پوچھا۔

”ابھی دس منٹ پہلے۔“ بیوی نے جواب دیا ”انہوں نے کہا تھا کہ تم جب بھی گھر آؤ، انہیں فون کرلو۔“

فرنانڈس تیزی سے ٹیلی فون کی طرف لپکا۔ ریسیور اٹھا کر اس نے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف دو مرتبہ گھنٹی بجی، پھر ریسیور اٹھالیا گیا ”ہیلو!“

”سر!“ فرنانڈس بولا ”آپ نے مجھے فون کیا تھا؟“

”ہاں۔“ آواز آئی ”فوراً میرے پاس آؤ۔“

”بہتر ہے۔“

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

ذرا دیر بعد ہی فرنانڈس کی کار بڑی تیزی سے عبداللہ کی کوٹھی کی طرف جا رہی تھی۔ عبداللہ نے اس سے اتنے خشک لہجے میں بات کی تھی کہ وہ پریشان ہوگیا تھا۔ عبداللہ کی خفیف سی ناراضی مول لینا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ آج اس کی جو حیثیت تھی، وہ صرف عبداللہ کی وجہ سے تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے دس گیارہ سال دو تین فلم ڈائریکٹروں کو اسسٹ کرتے ہوئے گزارے تھے اور اس کی بقیہ زندگی بھی شاید اسی طرح گزر جاتی اگر اسے غیر متوقع طور پر عبداللہ کا سہارا نہ مل گیا ہوتا۔ اس کی پہلی فلم سے آخری فلم تک ہر فلم پر سرمایہ عبداللہ ہی نے لگایا تھا۔ ان میں زیادہ تر فلمیں خسارے میں گئی تھیں لیکن عبداللہ نے کبھی کسی خسارے کی پروا نہیں کی تھی۔ کسی بھی فلم کی ناکامی پر فرنانڈ کو عبداللہ کی ناراضی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ فلم کی کامیابی یا ناکامی سے عبداللہ کو

بالکل سروکار نہ تھا۔ فرنانڈس کو اس کی صرف یہ شرط پوری کرنا پڑتی تھی کہ وہ اپنی ہر فلم میں نئی خوب صورت لڑکیوں کو لائے اور وہ لڑکیاں ایسی ہوں جن کی دوشیزگی قطعی غیر مشتبہ ہو۔ فرنانڈس کو اس کے لیے ہمیشہ خاصی تگ و دو کرنا پڑی تھی۔ ایک لڑکی تو اتنے بڑے معاوضے پر آمادہ ہوئی تھی کہ اتنے معاوضے سے فلم انڈسٹری کی کسی بھی بڑی سے بڑی اداکارہ کو لیا جاسکتا تھا لیکن کوئی بھی بڑی اداکارہ عبداللہ کی شرط پر پوری نہیں اترتی تھی۔

فرنانڈس کو زیادہ سے زیادہ معاوضہ دینے میں کبھی کوئی قباحت نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ ساری ادائیگی عبداللہ کرتا تھا اور پھر وہ لڑکیاں کم از کم ایک رات کے لیے عبداللہ کی مہمان ضرور بنتی تھیں۔

انتخاب کرتے وقت فرنانڈس کو یہ نہیں دیکھنا پڑتا تھا کہ ان لڑکیوں میں اداکاری کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں! یہی وجہ تھی کہ وہ اب تک جتنی لڑکیوں کو لایا تھا، ان میں سے دو ایک ہی فلم انڈسٹری میں اپنے لیے جگہ بنا سکی تھیں، باقی گمنام ہوگئی تھیں۔

ان لڑکیوں کے فلم کنٹریکٹ عبداللہ کے گھر میں ہی سائن ہوتے تھے اور اگر کبھی کوئی لڑکی اس کے لیے کسی بھی قیمت پر تیار نہیں ہوتی تھی اسے فلم میں نہیں لیا جاتا تھا۔

نئی لڑکیوں کی منظوری فرنانڈس کو عبداللہ سے حاصل کرنا پڑتی تھی لیکن یہ پہلا موقع تھا جب فرنانڈس نے فرح کا انتخاب کیا تھا لیکن عبداللہ سے اس کی منظوری نہیں لی تھی، لیکن اس نے سوچا یہ تھا کہ فرح کی آمادگی کے بعد ہی عبداللہ سے اس کی منظوری لے گا۔

وہ پریشانی کے عالم میں عبداللہ کے گھر پہنچا۔

”بہت اونچے اڑنے لگے ہو آج کل!“ عبداللہ نے اسے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا سر!“ فرنانڈس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”آج میں نے تمہیں بس یوں ہی فون کرلیا تھا۔ جب تمہاری بیوی نے بتایا کہ تم کہیں گئے ہوئے

ہوتو میں نے تمہارے اسسٹنٹ سلمان رضا کو فون کیا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ شاید تم اس کی طرف نکل گئے ہو۔ مجھے تم وہاں بھی نہیں ملے لیکن مجھے سلمان رضا سے یہ معلوم ہوگیا کہ تم شاید اس لڑکی کے گھر گئے ہو گے جسے تم اپنی کسی نئی فلم میں لینا چاہتے ہو۔''

''جی سر!'' فرنانڈس نے ادب سے جواب دیا ''میں اسی کی طرف گیا تھا۔''

''اس مرتبہ تم نے کسی فلم کی تیاری شروع کردی اور مجھے اس کی اطلاع تک نہیں دی!'' عبداللہ نے خشک لہجے میں کہا ''اسی لیے میں نے ابھی کہا تھا کہ آج کل تم بہت اونچے اڑ رہے ہو!''

''یہ بات نہیں ہے سر!'' فرنانڈس نے جلدی سے کہا۔

''دراصل میں نے سوچا یہ تھا کہ اس مرتبہ کچھ ابتدائی کام ہوجائیں تو آپ کو سرپرائز دوں کہ میرے ذہن میں کتنا انوکھا آئیڈیا آیا ہے۔ آپ نے شاید سلمان رضا سے زیادہ تفصیلی بات نہیں کی ورنہ آپ کو معلوم ہوجاتا کہ اس فلم کی کہانی میں نے کل ہی لکھوانا شروع کی ہے۔''

''اور کہانی سے پہلے ہی کسی لڑکی کا انتخاب کرلیا!'' عبداللہ کا لہجہ خشک ہی رہا۔

فرنانڈس بوکھلائے ہوئے انداز میں کچھ نہ کچھ صفائی پیش کرتا رہا۔ اس نے اپنا آئیڈیا، فلم کی کہانی اور فرح کے انٹرویو کے بارے میں بھی سب کچھ بتادیا۔

''فرح نام ہے اس کا؟'' عبداللہ کی پیشانی پر ایسے بل پڑ گئے جیسے وہ کچھ سوچنے لگا ہو۔

''جی ہاں سر!''

''کہاں رہتی ہے؟''

فرنانڈس نے پتا بتایا اور عبداللہ نے ایک طویل سانس لی ''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ لڑکی اٹھائیس سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد بھی دوشیزہ ہوگی!''

''آپ اسے جانتے ہیں؟'' فرنانڈس چونکا۔

''میری بات کا جواب دو۔'' عبداللہ نے خشک لہجے میں کہا۔

''جی سر!'' فرنانڈس جلدی سے بولا ''دراصل اسے کھوپڑی کا ماسک پہنانے سے پہلے میں نے اس کا انٹرویو لیا تھا۔ میں لڑکیوں سے باتیں کرکے ہی اندازہ لگالیتا ہوں کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ مجھے اس کا اتنا تجربہ ہے کہ میں کبھی دھوکا نہیں کھاسکتا۔''

''لیکن اس مرتبہ تم نے دھوکا کھایا ہے مگر کیونکہ یہ تمہاری پہلی غلطی ہے اس لیے تمہیں معاف کرتا ہوں۔ دوسرے مجھے اس لڑکی کے بارے میں کچھ اندازہ بھی ہے۔ وہ ایسی ہی ہے کہ اس سے صرف باتیں کرکے تم جیسا تجربہ کار شخص بھی دھوکا کھاسکتا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو میں کوئی دوسری لڑکی تلاش کروں گا۔'' فرنانڈس نے فوراً کہا ''ویسے بھی وہ یہ کردار کرنے کے لیے کسی طرح تیار ہی نہیں ہورہی ہے۔ آج میں اس کے گھر گیا تو میں نے اس کی چھوٹی بہن کو دیکھا۔ وہ بھی قیامت کی لڑکی ہے سر لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ میری اس فلم کے لیے موزوں رہے گی یا نہیں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ اندازہ بھی ہوا تھا کہ وہ بہت ٹیڑھی لڑکی ہے۔ میں اپنے تجربے کی بات کررہا ہوں سر' ایسی لڑکیاں فلم میں کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔''

''وہ واقعی بہت خوب صورت ہے؟'' عبداللہ نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

''قیامت ہے سر' قیامت۔''

''مجھے اپنے آدمیوں سے معلوم تو ہوا تھا کہ اس کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے جو بہت خوب صورت ہے۔ میں نے اپنے آدمیوں کی باتوں پر دھیان نہیں دیا تھا لیکن اب تم کہہ رہے ہو تو مجھے اس کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ لڑکیوں کے حسن کے بارے میں تمہارا معیار میرے معیار کے مطابق ہے۔''

''وہ آپ کو یقیناً پسند آئے گی سر' لیکن اسے فلم میں کام کرنے کے لیے آمادہ کرنا بہت مشکل ہوگا۔''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو کہ وہ کیسے تیار ہوگی۔'' عبداللہ مسکرایا ''تم فرح کی جگہ اسی کو لینے کے بارے میں سوچو۔''

''اس میں ایک قباحت ہے سر! یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس کا چہرہ اس ماسک کے مطابق ہے یا نہیں جو ماسک میرے پاس ہے۔''

''کیا دوسرا ماسک نہیں بنوایا جاسکتا؟''

''اخراجات بہت ہوجائیں گے سر! اگر وہ لڑکی تیار ہوجاتی ہے تو اسے پہلے امریکا بھیجنا پڑے گا۔ کمپنی والے اسے دیکھنے کے بعد ہی اس کے چہرے کے عین مطابق ماسک بناسکیں گے۔''

''تم جانتے ہو کہ اخراجات کی پروا میں کبھی نہیں کرتا' اگر کوئی لڑکی مجھے پسند آجائے۔''

''آپ اسے یقیناً پسند کریں گے سر!''

''مجھے تم پر اعتبار ہے لیکن میں چاہوں گا کہ کل کسی طرح خود بھی اسے ایک نظر دیکھ لوں۔''

''وہ آپ کو یقیناً پسند آئے گی سر!'' فرنانڈس نے اپنی بات دہرائی ''مجھے تھوڑی سی دشواری بس یہ ہوگی کہ اسے میک اپ کے ذریعے ذرا پختہ عمر کا دکھانا پڑے گا۔''

''تمہاری ان ٹیکنیکل باتوں سے میں نے کبھی کوئی سروکار نہیں رکھا۔ یہ یقین تم کرلو کہ وہ تمہاری فلم میں ضرور کام کرے گی۔''

''مجھے تو بڑی خوشی ہوگی سر!'' فرنانڈس کھل گیا۔

''اچھا تو اب تم جاؤ۔ میں دو ایک دن میں ہی تمہیں فون کرکے بلاؤں گا اور بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا۔''

''بہتر ہے۔'' فرنانڈس کھڑا ہوگیا۔

عبداللہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

فرنانڈس جب وہاں سے روانہ ہوا تو بہت خوش تھا۔ ایک تو اس کے دل سے عبداللہ کی ناراضی کا خوف جاتا رہا تھا اور دوسرے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ فرح کی جگہ غزالہ کو لے لے گا۔ غزالہ اسے بھی بہت پسند آئی تھی اور فلم میں لی جانے والی ایسی لڑکیاں عبداللہ کی مہمان بننے کے بعد فرنانڈس کے حصے میں بھی آتی تھیں۔

اس وقت جب فرنانڈس اپنے گھر کے راستے میں تھا' عبداللہ کی انگلی ٹیلی فون کا ڈائل گھما رہی تھی' وہ فرنانڈس کے اسسٹنٹ سلمان رضا سے بات کرنا چاہتا تھا جو دراصل اس کا ہی آدمی تھا۔ عبداللہ نے اسے ان دنوں فرنانڈس کے ساتھ اس لیے لگا رکھا تھا کہ اس کے ذریعے فرنانڈس کی سرگرمیوں سے باخبر رہ سکے۔

دیکھنے میں سادہ سا نظر آنے والا سلمان رضا ایک حد درجہ خطرناک نوجوان تھا جو ڈیڑھ سال پہلے تک لاطینی امریکا کے ایک دہشت گرد گروہ کے ساتھ کام کیا کرتا تھا۔ اپنے وطن سے وہ تعلیم حاصل کرنے امریکا گیا تھا لیکن غلط صحبتوں میں پڑجانے کے بعد وہ کچھ ایسے دہشت گردوں کا ساتھی بن گیا تھا جن کی جڑیں لاطینی امریکا میں تھیں۔

ڈیڑھ سال پہلے اس کا کسی بات پر اپنے ساتھیوں سے جھگڑا ہوگیا تھا اور جب اس نے اپنی زندگی خطرے میں محسوس کیا۔۔۔ تو فرار ہوکر اپنے وطن آگیا تھا۔ دو سال پہلے عبداللہ لاطینی امریکا گیا تھا تو اس کی ملاقات سلمان رضا سے ہوئی تھی اس لیے اپنے وطن لوٹنے کے بعد سلمان رضا نے فوراً اس سے رابطہ کیا اور عبداللہ نے اسے اپنے گروپ میں شامل کرلیا تھا۔

ان ڈیڑھ برسوں میں سلمان رضا نے عبداللہ کے لیے چند چھوٹے کام کیے تھے اور کئی ماہ سے فرنانڈس کا اسسٹنٹ بنا ہوا تھا۔

ٹیلی فون پر جب دوسری طرف سے سلمان رضا کی آواز آئی تو عبداللہ نے اس سے کہا ''میں اب فرنانڈس کی طرف سے مطمئن ہوچکا ہوں تم آج ہی اسے فون کرکے بتادینا کہ تم کل بذریعہ ڈاک اسے اپنا استعفیٰ بھیج دو گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' سلمان رضا نے کہا ''اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہے؟''

''اب تم اپنے گھر پر نہیں رہو گے۔ تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے۔''

''بہت بہتر۔''

عبداللہ نے رابطہ منقطع کردیا۔ ان دنوں اچانک اسے اپنے ایک مخالف گروپ کی طرف سے

کچھ خطرات محسوس ہونے لگے تھے اس لیے وہ اپنے باڈی گارڈز میں سلمان رضا جیسے چست و چالاک نوجوان کا اضافہ کرلینا چاہتا تھا۔

ٹیلی فون کا ریسیور رکھنے کے بعد وہ غزالہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ غزالہ کو دیکھنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اسے اپنے آدمیوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کالج میں پڑھتی تھی لہٰذا اسے کالج جاتے ہوئے یا کالج سے لوٹتے ہوئے دیکھ لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ عبداللہ کو سوچنا یہ پڑ رہا تھا کہ اگر غزالہ اسے پسند آگئی تو اسے فلم میں کام کرنے کے لیے کس طرح مجبور کیا جاسکے گا۔ فرینڈس سے اس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی یہ بات کہہ دی تھی کہ وہ اپنی فلم میں غزالہ ہی کو لے لیکن اب اسے خیال آگیا تھا کہ یہ ایک مسئلہ ہوگا۔

کسی کو بھی اغوا کروالینا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن یہ بات اس کے مزاج کے خلاف تھی کہ اس کی کوئی ''مہمان لڑکی'' مزاحمت کرے۔ وہ پسند آجانے والی لڑکیوں کو کسی نہ کسی طرح مجبور کردیتا تھا کہ جب وہ اس کی مہمان بنیں تو ان کے دل و دماغ اس کے لیے آمادہ ہوں یا نہ ہوں لیکن وہ کسی قسم کی مزاحمت نہ کریں۔ وہ ان لڑکیوں کی کسی نہ کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر مزاحمت سے باز رکھنے میں کامیاب ہوجاتا تھا۔ صرف ایک مرتبہ ایک لڑکی تابندہ کے ساتھ اسے جبر سے کام لینا پڑا تھا کیونکہ تابندہ کی کوئی دکھتی رگ اس کے ہاتھ میں نہیں آسکی تھی۔

فرح کے معاملے میں بھی عبداللہ نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اس نے فرح کو دھمکی دی تھی کہ وہ اس کی چھوٹی بہن کو اغوا کروالے گا اور فرح اپنی چھوٹی بہن کو بچانے کے لیے اس کی ''مہمان'' بننے پر آمادہ ہوگئی تھی لیکن وہ غزالہ کی کسی دکھتی رگ سے واقف نہیں تھا۔

☆☆☆

دوپہر کو فرح نے اپنی میز پر موجود خاص خاص چیزیں سمیٹ کر درازوں میں مقفل کیں۔ لنچ کا وقت قریب تھا۔ فرح اس وقت میں بازار جا کے اپنے لیے کچھ فیشن ایبل ملبوسات خریدنا چاہتی تھی۔ وہ ان ملبوسات میں اپنی اسٹائلش تصویریں کھنچواتی اور فلمیں بنانے والے مختلف اداروں کو بھیجتی۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ فلم انڈسٹری میں جانے کے لیے وہ مسلسل کوششیں جاری رکھے گی۔

لیکن اس روز اسے بازار جانے کا موقع نہیں مل سکا اسے عبداللہ نے اسی وقت بلایا تھا۔

فرح کو جانا پڑا۔ عبداللہ کے سامنے وہ مکمل طور پر سپر ڈال چکی تھی۔ اسے اب اسی دن کا انتظار کرنا تھا جب فلم انڈسٹری میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ اتنے تعلقات بڑھا لیتی کہ عبداللہ جیسے کسی شخص کے ذریعے اسے عبداللہ سے اپنا انتقام لینے کا موقع مل جاتا۔

معمول کے مطابق اسے تاریک شیشوں کی ایک اسٹیشن ویگن میں سفر کرنا پڑا تھا۔ اسے تاکید کے مطابق سر جھکا کر بیٹھنا پڑتا تھا تاکہ وہ سامنے کی اسکرین سے بھی یہ نہ دیکھ سکے کہ اسٹیشن ویگن کن راستوں سے گزرتی ہوئی کہاں پہنچی تھی۔

فرح کو سر اٹھانے کی اجازت اس وقت ملتی تھی جب اسٹیشن ویگن کسی عمارت کے گیرج میں پہنچنے کے بعد رکتی تھی اور گیرج بند بھی کردیا جاتا تھا۔ اس گیرج کے اندر ایک دروازہ بنا ہوا تھا جس سے اسے اندر لے جایا جاتا تھا۔

عبداللہ کے بقول یہ اس کی رہائشی کوٹھی نہیں بلکہ ایک اور بنگلا تھا جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا مالک عبداللہ تھا۔ سرکاری کاغذات پر بھی اس بنگلے کے مالکانہ حقوق کسی اور کے نام سے تھے۔

فرح کو اس کے جانے پہچانے راستے سے اس آراستہ خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا جہاں عبداللہ اس کا منتظر تھا۔

فرح خاموشی سے بستر پر جا کے بیٹھ گئی اور اپنے سینڈل اتارنے لگی۔

''آج مجھے تم سے کچھ باتیں بھی کرنا ہیں فرح۔'' عبداللہ بولا ''بائی دی وے' کیا تم اس سے

خوش نہیں ہو کہ میں نے تمہیں کسی کی نظر میں مشکوک نہیں ہونے دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" فرح نے دھیمی آواز میں پوچھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اگر تمہیں دفتری اوقات کے علاوہ کسی وقت بلایا کرتا تو تمہارے گھر والے تم سے پوچھ سکتے تھے کہ تم کہاں جاتی ہو۔"

پہلی بار کے علاوہ عبداللہ نے فرح کو دفتری اوقات میں ہی اپنے پاس بلایا تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" فرح نے سپاٹ لہجے میں کہا "سلطان صاحب تو جانتے ہی ہیں کہ میں دفتر سے دو ڈھائی گھنٹے کے لیے کہاں غائب ہو جاتی ہوں۔"

"صرف سلطان کے جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سلطان کی مجال نہیں کہ کسی کو اس کے بارے میں کچھ بتائے۔"

"اس عنایت کا شکریہ۔" فرح کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

عبداللہ مسکرایا "نہ جانے کیوں، میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے دل سے پسند کرنے لگو۔ پہلے بھی کسی لڑکی نے مجھے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا تم نے کیا ہے۔ اسی لیے میں ہمہ وقت تمہاری طرف سے باخبر رہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے دو تین دن پہلے ایک فلم ڈائریکٹر سے رابطہ کیا تھا۔ یہ تمہیں فلم لائن میں جانے کی کیوں سوجھ گئی؟"

"کیا تم مجھ پر یہ پابندی بھی لگانا چاہتے ہو کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں؟"

"ہرگز نہیں۔" عبداللہ نے کہا "تم مجھے بتا دیتیں تو میں تمہارا کام آسانی سے کروا دیتا اور اب بھی کروا سکتا ہوں۔"

"میں کسی بھی معاملے میں تمہاری مدد نہیں لینا چاہتی۔"

"گویا تمہارے دل میں میرے لیے اب تک ذرا سی بھی گنجائش پیدا نہیں ہوئی؟" عبداللہ نے ٹھنڈی سانس لی۔

فرح کچھ نہیں بولی۔ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

"اس تصویر کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔"

عبداللہ نے اس کی طرف ایک لفافہ بڑھایا۔

فرح نے لفافہ ہاتھ لے لیا مگر اسے فوراً نہیں کھولا اور عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "کس کی تصویر ہے؟"

"تم خود دیکھ لو۔"

فرح نے بے زاری سے لفافہ کھول کر تصویر نکالی اور پھر تصویر کے ساتھ ہی لفافہ بھی اس نے اس طرح پھینکا جیسے کسی ڈنک مارتے ہوئے بچھو کو خود سے دور کیا ہو۔ اس کے سارے جسم میں خوف کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔

وہ تصویر ایک انسانی کھوپڑی کی تھی۔

"یہ کیا مذاق کیا تم نے مجھ سے!" فرح نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ وہ بستر سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"تم واقعی انسانی کھوپڑی سے اتنی خوف زدہ رہتی ہو؟" عبداللہ نے اسے حیرت سے دیکھا "جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو مجھے یقین نہیں آیا تھا۔"

فرح کی سانس پھولنے لگی تھی۔ وہ بولی "اس کا مطلب ہے کہ فرنانڈس تمہیں جانتا ہوں اور اب تمہارے ذریعے مجھ پر دباؤ ڈلوانا چاہتا ہے لیکن میں اس معاملے میں تمہارا دباؤ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ انسانی کھوپڑی کا ماسک لگا کے فلم میں کام کرنا میرے اختیار میں ہی نہیں ہے۔ خوف سے میرا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا تھا۔"

"حیرت ہے۔" عبداللہ نے کہا "آخر تمہارے اس خوف کا پس منظر کیا ہے؟"

"تم اپنے کام سے کام رکھو۔"

"نہیں فرح! میں تو یہ چاہوں گا کہ تمہیں کسی طرح اس خوف سے نجات دلاؤں۔ کوئی اچھا ماہر نفسیات تمہارا علاج یقیناً کر سکے گا۔"

"تم اس کے لیے فکر مند نہ ہو۔" فرح کے لہجے میں تھوڑی سی جھنجلاہٹ تھی۔

"فکر مند تو میں اس لیے ہوں کہ ماسٹر فلمز دراصل میرا ادارہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس فلم میں کام کرو۔"

"یہ ناممکن ہوگا۔ مجھے اس خوف سے نجات حاصل نہیں ہوسکتی۔"

"تم اس مفروضے کو اپنے دماغ سے جھٹک دو۔ اس قسم کے معاملات ناقابل علاج نہیں ہوتے۔ میں اس سلسلے میں لندن اور امریکا کے ماہرین نفسیات سے بھی رابطہ کروں گا۔ علاج کے اور تمہیں وہاں بھیجنے کے اخراجات بھی میں برداشت کروں گا۔"

"میں اپنے والد اور بہن کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی۔"

"تو پھر یہیں کے ماہرین نفسیات سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔"

"اس طرح یہ بات کھل جائے گی کہ میرا علاج تم کروار ہے ہو۔"

"میں ایسا طریقہ اختیار کروں گا کہ یہ بات ہرگز نہیں کھلے گی۔"

"میں اپنا علاج نہیں کروانا چاہتی۔" فرح بہت زیادہ جھنجلا گئی "اب مجھے اس کے علاج کے خیال سے بھی خوف محسوس ہوتا ہے۔"

عبداللہ نے ایک طویل سانس لی "اگر تم اس کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں ہوتی ہو تو پھر ایک ہی راستہ رہ جائے گا۔"

فرح سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

عبداللہ نے کہا "فرنانڈس تم سے ملنے کے لیے تمہارے گھر گیا تھا۔ وہاں اس نے تمہاری چھوٹی بہن غزالہ کو دیکھا تھا۔ فرنانڈس کا خیال ہے کہ اگر تم اس فلم میں کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی ہو تو پھر تمہاری جگہ غزالہ سے کام لیا جاسکتا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" فرح نے دانت پر دانت جما کر کہا "غزالہ فلم لائن میں نہیں جائے گی۔ میں اپنی بہن کو برباد ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔"

"فلم لائن میں جانا اگر بربادی ہے تو تمہیں اس کی خواہش کیوں ہوئی ہے؟"

"میں تو برباد ہو چکی ہوں۔" فرح نے تلخ لہجے میں کہا "میں نے صرف اپنی بہن کو بچانے کے لیے گندگی کا ڈھیر بننا گوارا کیا تھا۔ میں اپنی یہ قربانی رائگاں نہیں جانے دوں گی۔"

عبداللہ کا منہ بن گیا۔ اس نے تیز نگاہوں سے فرح کی طرف دیکھا۔ "میں تم سے ہمیشہ بہت نرمی سے پیش آیا ہوں جس کی وجہ سے آج تم مجھ سے اتنے تیز لہجے میں بات کر رہی ہو۔ یہ نہ بھولو کہ میں عبداللہ ہوں جس کا نام ہی سن کر لوگ کانپ جاتے ہیں میں تمہیں صاف صاف بتادوں کہ تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ اپنا علاج کروا کے اس فلم میں کام کرو پھر اپنی بہن کو یہ کام کرنے کی اجازت دو۔"

"وہ ہرگز نہیں مانے گی۔"

"اسے کسی طرح بھی مناؤ۔"

"وہ اس گندگی میں ہرگز نہیں آئے گی۔"

"گندگی۔" عبداللہ نے زہریلے لہجے میں کہا "اگر یہ گندگی ہے تو تمہاری بہن کو اغوا کر کے اسے گندگی کا ڈھیر بنایا جائے گا۔ اس کے بعد تو وہ فلم انڈسٹری کی گندگی میں جانے کے لیے تیار ہو جائے گی نا!"

"نہیں۔" فرح کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں "تم ایسا نہیں کرو گے؟"

"مجھے کون روک سکتا ہے!"

"خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔" فرح کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "میں نے صرف اسی کی خاطر خود کو برباد کیا ہے۔"

"اپنا دماغ درست کرو۔" عبداللہ نے کڑے لہجے میں کہا "تم اپنی بربادی کا خیال اپنے دماغ سے نکال کر خوش دلی سے مجھے قبول کرلو تو میں تمہاری زندگی سنوار دوں گا۔"

"مجھے کوئی سنوری ہوئی زندگی نہیں چاہیے۔" فرح کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ میری بہن کو بھول جاؤ۔"

"عورتوں کے آنسو مجھ پر کوئی اثر نہیں کرتے۔" عبداللہ نے منہ بنا کر کہا "آج میں تمہیں زیادہ دیر نہیں روکنا چاہتا۔ ابھی میں اپنے آدمیوں کو بلاتا ہوں۔ وہ

تمہیں واپس چھوڑ آئیں گے میں تمہیں سوچنے کے لیے دو دن کی مہلت دے سکتا ہوں۔ تم اپنی بہن کو فلم میں کام کرنے کے لیے آمادہ کرو اپنے علاج کے لیے تیار ہو جاؤ ورنہ میں تمہاری بہن کو اغوا کروا لوں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ وہ میری مہمان بننے کے لیے تیار نہیں ہوگی اور مزاحمت کرے گی جو مجھے پسند نہیں اس لیے میں اسے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دوں گا۔"

فرح دوڑ کر عبداللہ کے قدموں میں گر پڑی "خدا کے لیے میری بہن کو بھول جاؤ۔"

عبداللہ نے بڑی بے دردی سے فرح کے بال پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور اس کا چہرہ اپنے چہرے کے قریب لا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا غرایا "میں تمہیں اپنا قطعی فیصلہ سنا چکا ہوں۔ میں نے تمہیں سوچنے کے لیے دو دن کی مہلت دے دی ہے۔ دو دن بعد تمہاری بہن کو اغوا کروا لیا جائے گا۔ اگر تم اس سلسلے میں پولیس سے رابطہ کرنا چاہو تو وہ بھی کر کے دیکھ لینا۔ تمہاری بہن کو مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

پھر عبداللہ نے فرح کو بڑی زور سے بستر کی طرف دھکا دے دیا۔

فرح کے بال بکھر گئے تھے اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔

عبداللہ نے کسی کو آواز دی جو آدمی اندر آیا' عبداللہ نے اس سے کہا "اس بے وقوف لڑکی کو واپس چھوڑ آؤ۔"

☆☆☆

اس دن فرح واپس اپنے دفتر نہیں گئی۔ جب وہ گھر پہنچی تو غزالہ اس کی حالت دیکھ کر بے حد پریشان ہوگئی۔ فرح کا چہرہ اسے ستا ہوا اور ویران سا نظر آیا تھا۔

"کیا ہوا باجی!" غزالہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" فرح نے آہستہ سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔

"آپ دفتر سے اتنی جلدی کیسے آگئیں؟" غزالہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"چھٹی لے کر آئی ہوں۔ کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔"

"مگر کیوں!"

"تم جاؤ غزالہ! مجھے آرام کرنے دو۔" فرح اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔

"میں آرام نہیں کرسکوں گی۔" غزالہ نے بھی اس کے ساتھ کمرے میں قدم رکھا۔

"پلیز غزالہ! کیا میں ہاتھ جوڑ کر کہوں کہ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"باجی!" غزالہ کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو آگئے پھر وہ روتے اور دوڑتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

فرح نے اپنے بستر پر گر کر آنکھیں بند کرلیں۔ آج اس کے قلب و دماغ کو بہت زور کا دھچکا لگا تھا۔ اس نے جو قربانی دی تھی' وہ اپنی بہن کی بہتری کے لیے دی تھی لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی قربانی ضائع ہو چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ غزالہ کو اغوا کر لیا جائے گا۔ اسے عبداللہ سے بچانا فرح کو ممکن معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

اب کیا کروں؟ اب کیا کروں؟ فرح کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

صرف ایک ہی صورت ممکن ہے' فرح کو خیال آیا' اگر وہ عبداللہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جائے تبھی غزالہ کی عزت محفوظ رہ سکتی تھی۔

فرح آنکھیں بند کیے سوچتی رہی۔ اگر وہ عبداللہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو اس کا وہ منصوبہ ادھورا رہ جاتا جو اس نے غزالہ کی شادی کے لیے' غزالہ کے بہتر مستقبل کے لیے سوچا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق وہ عبداللہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو یہ بہر حال ناممکن تھا کہ وہ خود بچ جاتی۔ عبداللہ کے آدمی اسے ہرگز زندہ نہ چھوڑتے اور بالفرض وہ ان سے بچ کر نکل آتی تو قانون کا ہاتھ اس تک ضرور پہنچتا۔

خاصی دیر تک سوچنے کے بعد فرح نے آخری

کیا کہ غزالہ کا مستقبل محفوظ کرنے سے بہتر یہ کہ غزالہ کی عزت محفوظ ہوجائے۔

فیصلہ کرنے کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک سنگین فیصلہ کرنے کے بعد اس نے کچھ اطمینان محسوس کیا۔ پہلے اس نے اپنی عزت کی قربانی دے کر اپنی بہن کو بچایا تھا اور اب اسے اپنی زندگی کی قربانی دے کر غزالہ کو محفوظ کرنا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ عبداللہ کو قتل کرنے کے لیے وہ کیا طریقہ اختیار کرسکتی ہے؟ ریوالور چلانا اسے آتا نہیں تھا اور ریوالور وہ کہیں سے حاصل بھی نہیں کرسکتی تھی۔ لے دے کر وہ صرف چاقو ہی استعمال کرسکتی تھی لیکن اس کے لیے بھی اسے بڑی ہوشیاری سے کام لینا پڑتا۔ ایسا چاقو تو اسے بازار سے بہ آسانی مل جاتا جس کا پھل بہت زیادہ لمبا نہ ہوتا اور جسے وہ بہ آسانی اپنے لباس میں چھپا سکے یا اپنے پرس میں رکھ کر عبداللہ کے پاس جاسکے۔

فرح کی رفاقت میں وہ شراب کے دو تین پیگ ضرور پیتا تھا۔ عبداللہ کے ان سرور انگیز لمحات میں ہی فرح اپنا کام کرسکتی تھی۔ اگر وہ چاقو عبداللہ کے حلقوم میں اتار کر ایک زور کا جھٹکا دے دیتی تو عبداللہ کی گردن کٹ جاتی۔

لیکن یہ اندیشہ بھی بہرحال تھا کہ وہ اپنا یہ مقصد حاصل نہ کرپاتی!

ناکامی!

لیکن اب ناکامی سے ڈرنا بے کار ہے' فرح نے سوچا' اگر وہ ناکامی کے ڈر سے عبداللہ کو ختم کرنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھائے گی تو بھی غزالہ کا مستقبل یقیناً تاریک ہوجائے گا لہٰذا اپنی سی کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں!

فرح بستر سے اٹھ کر باتھ روم میں گئی۔ اس نے آئینہ دیکھا تو اسے اپنا ہی چہرہ کچھ کچھ اجنبی سا نظر آیا۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ اسے دیکھ کر غزالہ کا بے حد پریشان ہوجانا کوئی تعجب خیز نہیں تھا۔

فرح ایک ٹھنڈی سانس لے کر منہ دھونے لگی۔ پندرہ منٹ بعد وہ اپنے کمرے سے نکلی تو اس کی حالت پہلے جیسی نہیں تھی۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا، وہ غزالہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔

غزالہ اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی، اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ اس نے خاصی دیر تک آنسو بہائے تھے۔

''دیکھو اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' فرح نے اس کے قریب بیٹھ کر مسکرانے کی کوشش کی ''بعض اوقات تم میری حالت دیکھ کر کچھ زیادہ ہی پریشان ہوجاتی ہو۔ میں بس تھک گئی ہوں غزالہ! کبھی کبھی مجھ پر بہت زیادہ تھکن طاری ہوجاتی ہے۔ اس وقت میرا دماغ بھی ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔''

''میں ان باتوں پر یقین نہیں کروں گی باجی!'' غزالہ نے اس کی طرف دیکھا ''کوئی ایسی خاص بات ضرور ہے جو آپ اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں۔''

''بس یہ پریشانی چھپائے ہوئے ہوں کہ اگر کسی وقت مجھے کچھ ہوگیا تو تمہارا کیا ہوگا۔''

''ایسی بات نہ کیجیے۔'' غزالہ نے تڑپ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ''خدا نہ کرے جو آپ کو کچھ ہو!''

''میں نے تمہیں بس اپنی حالت سے آگاہ کیا ہے۔ ضروری نہیں کہ مجھے کچھ ہوجائے۔ تم بس پریشان نہ ہوا کرو میری حالت دیکھ کر!''

''اس سے پہلے کہ غزالہ کچھ کہتی' کال بیل کی آواز سنائی دی۔

''اس وقت کون آگیا''

''میں دیکھتی ہوں جا کے۔'' غزالہ جلدی سے کھڑی ہوئی۔

فرح بھی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے باہر نکلی اس نے غزالہ کو دروازہ کھولتے اور پھر پرویز کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔

''اس وقت کیسے آگئے؟'' فرح نے پوچھا ''اس وقت تو تمہیں اپنے دفتر میں ہونا چاہیے تھا!''

''اس وقت دفتر میں تو تمہیں ہونا چاہیے تھا۔''

"تم نے فون کیا تھا پرویز کو؟" فرح نے غزالہ کی طرف دیکھا۔

غزالہ نے نظریں جھکالیں۔

فرح کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری پھر اس نے پرویز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرے کمرے میں آؤ۔"

پرویز کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی تھی۔

پرویز اس کے کمرے میں آیا۔

"بیٹھو!" فرح نے کرسی کی طرف اشارہ کیا "غزالہ جب میری وجہ سے پریشان ہوتی ہے تو تمہیں ہی فون کرتی ہے۔"

"وہ اب بھی مجھے غیر نہیں سمجھتی نا!"

"مجھ پر طنز کر رہے ہو!" فرح نے آہستہ سے کہا۔

"میں نے سیدھی سادی بات کہی ہے۔"

"خیر! اچھا ہوا کہ اس نے تمہیں فون کر کے دفتر سے بلالیا۔ اگر وہ فون نہ کرتی تو میں تمہیں فون کرتی اور کہتی کہ دفتر سے سیدھے یہیں آجانا۔"

"میں ابھی اس قابل ہوں کہ تم کسی وجہ سے مجھے بلانا ضروری سمجھو؟"

"تم پھر طنز کر رہے ہو۔ خیر! میں برا نہیں مانوں گی۔ آج میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو تم غزالہ کا خیال رکھو گے نا؟"

فرح نے بڑی مشکل سے خود کو قابو میں رکھا تھا ورنہ اس کی آواز بھرا جاتی۔

"کیا فضول بات کر رہی ہو!" پرویز نے اسے گھورا۔

"میری بات کا جواب دو پرویز!"

"وہ میرے لیے چھوٹی بہن کی طرح ہے لیکن تمہیں یہ فضول خیال کیوں آرہا ہے کہ تمہیں کچھ ہوجائے گا۔"

"تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں نے گزشتہ دنوں میں تم سے بے رخی کیوں برتی ہے؟"

"میں اس کے سوا کوئی اندازہ نہیں لگا سکا ہوں کہ تم کچھ عرصے سے کسی پریشانی میں مبتلا ہو۔"

"میں چاہتی تھی کہ تمہارے دل سے میری محبت ختم ہوجائے۔" اس مرتبہ فرح کی آواز بھرا گئی "لیکن میں غلطی پر تھی۔ اس طرح تمہارے دل سے میری محبت ختم نہیں ہوسکتی۔"

"مگر کیوں؟" پرویز نے بے چینی سے پہلو بدلا "تم کیوں چاہتی تھیں کہ میرے دل سے تمہاری محبت نکل جائے۔"

"اس لیے کہ میں اب تمہارے قابل نہیں رہی ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"آج میں تمہیں صاف صاف ہی بتا دینا چاہتی ہوں کہ میری عزت لٹ چکی ہے۔" فرح نے نظریں جھکالیں۔

"کیا!" پرویز کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"مجھے امید ہے کہ تم میری چھوٹی بہن کو یہ بات کبھی نہیں بتاؤ گے۔" فرح کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

"یہ تم۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو!" پرویز کی آواز کانپ گئی۔

"کوئی لڑکی اپنی بے آبرو ہوجانے کی جھوٹی کہانی نہیں سنا سکتی۔"

"لیکن۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیسے ہوگیا؟"

"تفصیل بتانے سے مجھے اذیت ہوگی۔ مجھ سے اس بارے میں کوئی سوال نہ کرو۔ آج میں تمہیں یہ بات صرف ایک وجہ سے بتائی ہے۔ جب سے میں بے آبرو ہوئی ہوں، تبھی سے میں پریشان بھی ہوں۔ بار بار میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ میں خودکشی کرلوں۔ ہوسکتا ہے کسی وقت میں ایسا کر ہی بیٹھوں اسی لیے آج میں یہ اطمینان کرنا چاہتی ہوں کہ میرے بعد میری بہن بے آسرا نہیں ہوجائے گی۔"

فرح کی آنکھوں سے آنسو ٹپک گئے۔

"مجھے اس کا نام بتاؤ فرح!" پرویز کی مٹھیاں بھینچ گئیں "مجھے اس کمینے کا نام بتاؤ جس نے تمہیں

ہو گیا ہے؟ کیا وہ وہی ہے جو اس دن ہوٹل میں اور بے ہودہ باتیں کر گیا تھا۔"

"نہیں۔" فرح نے جھوٹ بولا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ پرویز کسی طرح عبداللہ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے اور پھر اسے جان سے مارنے کی کوشش کرے۔ عبداللہ ایک ایسا شخص تھا جسے صرف چالاکی ہی سے مارا جا سکتا تھا جبکہ پرویز اسے مارنے کے لیے عیاری سے کام نہیں لیتا اور خود ہی مارا جاتا۔

"پھر وہ کون ہے؟" پرویز نے بے تابی سے کہا۔

"مجھے دفتر کے راستے سے اغوا کیا گیا تھا۔" فرح کی نظریں جھکی رہیں "جس نے مجھے بے آبرو کیا' اس نے اپنے چہرے پر نقاب لگا رکھی تھی۔"

"تم بالکل اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ وہ کون تھا"

"نہیں۔"

پرویز کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور گردن کی رگیں بار بار تن رہی تھیں وہ شدید غصے میں تھا۔

"پرویز!" فرح کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی "میں یقین کر لوں نا کہ اگر میں نے خودکشی کر لی تو تم غزالہ کا خیال اسی طرح رکھو گے جیسے وہ تمہاری چھوٹی بہن ہو۔"

پرویز نے تیزی سے فرح قریب آ کر اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور اسے جھنجوڑتا ہوا بولا "تم ہرگز خودکشی نہیں کرو گی۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں بھی خود کو ہلاک کر لوں گا۔"

"اس طرح تو غزالہ بے سہارا ہو جائے گی۔"

"اسی خیال سے تم خودکشی کا خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔"

"میں ایک زندہ لاش بن چکی ہوں پرویز۔" فرح نے سسکی لی "اگر میں زندہ رہ جاؤں تو بھی میرا مستقبل کیا ہوگا۔"

"میں ہوں تمہارا مستقبل۔" پرویز نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ کیا میں اس قابل رہی ہوں کہ تم مجھے اپنا بنا سکو؟"

"تم ہر حال میں میری ہو۔" پرویز نے اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ سخت کر دیا۔

فرح نے بھیگی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا "میں اس معاملے میں خوش قسمت ہوں کہ میری بربادی بھی تمہارے دل سے میری جگہ ختم نہیں کر سکی۔"

"وعدہ کرو فرح!" پرویز نے جذباتی لہجے میں کہا "تم خودکشی ہرگز نہیں کرو گی۔"

"اچھا!" فرح نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا "میں وعدہ کرتی ہوں' میں خودکشی نہیں کروں گی۔" اس وقت فرح کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ اگر وہ عبداللہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئی تو اس کے آدمیوں کے ہاتھوں ماری جائے گی یا قانون کے ہاتھوں میں پہنچنے کے بعد اس پھانسی یا عمر قید کی سزا بھگتنا ہو گی چنانچہ اس کا یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہوگا کہ وہ خودکشی نہیں کرے گی۔

"اب تم کچھ سوچ کر مجھے بتاؤ کہ اس شخص کے بارے میں کیسے پتا چلایا جا سکتا ہے۔" پرویز بولا۔

"تم مجھ سے اس موضوع پر بات کرو گے تو مجھے ذہنی اور روحانی اذیت ہوتی رہے گی۔"

پرویز کے چہرے پر بے بسی نظر آنے لگی۔ فرح اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس وقت پرویز کے سارے وجود میں اس شخص سے انتقام کی لہریں دوڑ رہی ہوں گی جس نے اس کی محبت کو داغ دار کیا تھا لیکن فرح اسے حقیقت بتا کر اس کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

"اچھا تو ایک وعدہ کرو۔" پرویز نے سوچتے ہوئے کہا "جو کچھ ہو گیا' اسے تم بھی اس طرح بھول جاؤ کہ کبھی بکھری بکھری سی نظر نہ آؤ۔"

"یہ کوئی آسان بات نہیں ہے پرویز۔"

"جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم اس کی

کوشش کر سکتی ہو۔"

"مجھے دو تین دن کی مہلت دو میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کروں گی۔" فرح کے ذہن میں اس وقت یہ خیال تھا کہ دو تین دن میں حالات کسی فیصلہ کن موڑ سے گزر چکے ہوں گے۔

☆☆☆

دوسرے دن فرح اپنے دفتر گئی۔ کوئی فیصلہ کن وقت آنے سے پہلے اسے معمول کے مطابق وقت گزارنا تھا۔ اس کے علاوہ اس دن وہ بازار سے ایک چاقو بھی خریدنا چاہتی تھی جو کسی ایسی دکان سے مل سکتا تھا جہاں باورچی خانے کے استعمال کی اشیا فروخت ہوتی ہوں۔

فرح نے یہ کام لنچ کے وقفے میں کر ڈالا۔ دفتر سے کچھ ہی فاصلے پر وہ دکان تھی جہاں اس نے کچھ گلاس، کچھ پیالیاں اور چاقو خریدا۔ کیونکہ اس کے دل میں چور تھا اس لیے اس نے سوچا تھا کہ اگر اس نے صرف چاقو خریدا تو دکان دار کو شک ہو سکتا ہے۔

شام کو وہ دفتر سے گھر آ گئی۔

رات کے کھانے سے ذرا دیر پہلے "ماسٹر" کا فون آ گیا۔ "دو دن گزر چکے ہیں۔" اس نے کہا "تم نے کیا فیصلہ کیا؟"

"یہ میں ملاقات پر ہی بتا سکوں گی۔" فرح نے سوچا سمجھا ہوا جواب دیا۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی، پھر کہا گیا "کل تم دفتر جانے کے بجائے اپنے گھر سے نکل کر دائیں جانب پیدل چل پڑنا۔ کسی جگہ بھی گاڑی تمہارے قریب آ رکے گی۔"

"اچھا۔" فرح نے مختصراً کہا۔

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس رات جب وہ کھانا کھانے کے لیے بیٹھی تو اس کے والد امجد صاحب نے اس سے کوئی بات نہیں کی فرح نے جب سے فلم انڈسٹری میں جانے کا فیصلہ کیا تھا، امجد صاحب نے اس سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ ان کے چہرے پر افسردگی کے تاثرات ہر وقت رہتے تھے۔

فرح نے بڑے کرب سے سوچا کہ آج کی رات شاید اس کی زندگی کی آخری رات ہو لہٰذا اسے اپنے والد کی ناراضی ختم کر دینا چاہیے۔

کھانے کے بعد جب امجد صاحب اپنے کمرے میں جانے لگے تو فرح نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

"مجھے معاف کر دیجیے ابا۔" فرح نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں نے آپ کو بہت دکھی کیا ہے۔ میرا فیصلہ غلط تھا۔ مجھے فلم انڈسٹری میں نہیں جانا چاہیے۔ میں اپنے اس غلط فیصلے پر نادم ہوں۔"

"میری بچی!" امجد صاحب کے منہ سے نکلا اور پھر انہوں نے فرح کو گلے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ اس وقت فرح کی آنکھیں بھی بھر آئیں اور غزالہ بھی خود کو اس جذباتی لمحے سے الگ نہیں رکھ سکی۔

فرح اور غزالہ نے ایک ڈیڑھ گھنٹا اپنے والد کے ساتھ گزارا۔ اس کے بعد فرح اپنے کمرے میں جاتے ہوئے غزالہ کو بھی ساتھ لے آئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ آج ساری رات اپنی بہن سے باتیں کرتی رہے کیونکہ اس کے خیال کے مطابق وہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی جس کے بعد اسے کبھی اپنی بہن سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

اس رات فرح نے امریکا فون کر کے اپنی شادی شدہ بہن راحیلہ اور اس کے شوہر سے بھی باتیں کیں۔ غزالہ نے بھی اپنی دوسری بہن سے کچھ دیر باتیں کیں۔

رات کے بارہ بج رہے تھے جب فرح نے غزالہ کی پیشانی چوم کر اس سے کہا "اب جا کے آرام کرو۔"

"آج آپ کو خوش دیکھ کر میں بھی بہت خوش ہوں باجی۔"

"خدا کرے، ہمیشہ خوش رہو۔" فرح کے دل میں ایک ٹیس سی ابھری تھی جس کا تاثر اپنے چہرے پر

آنے دیا تھا۔
غزالہ کے جانے کے بعد بھی وہ خاصی دیر تک جاگتی رہی۔ ماضی کی ساری باتیں اس کے ذہن میں ابھرتی ابھرتی رہیں۔
دوسری صبح وہ معمول کے مطابق تیار ہوئی۔ اس نے اپنے پرس میں رکھ لیا۔ غزالہ اپنے کالج جا چکی تھی جب فرح اپنے باپ کو سلام کرنے اور انہیں حسرت بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد گھر سے نکلی۔

☆☆☆

عبداللہ کے ہاتھ میں اس وقت وہسکی کا ایک پیگ تھا جب فرح اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔
''مجھے امید ہے کہ تم نے کوئی درست فیصلہ کیا ہوگا۔'' عبداللہ نے اسے دیکھتے ہی کہا ''اسی لیے تم مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔''
''ہاں۔'' فرح نے سنجیدگی سے کہا ''میرا خیال ہے کہ میں نے درست ہی فیصلہ کیا ہے۔''
''بیٹھو!'' عبداللہ نے اپنے سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
فرح بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا پرس بڑی بے پروائی سے تپائی پر ڈال دیا۔
''کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟'' عبداللہ نے پوچھا۔
''میں غزالہ کو فلم میں کام کرنے کے لیے آمادہ کرلوں گی لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔'' فرح کو مناسب وقت آنے تک باتوں میں کچھ وقت تو گزارنا ہی تھا۔
''شرط!'' عبداللہ ہنسا ''تم پہلی لڑکی ہو جو عبداللہ سے کوئی شرط منوانا چاہتی ہو۔''
''شاید مجھے یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' فرح نے کہا ''اسے تم میری التجا سمجھ لو۔ میں چاہتی ہوں کہ میری بہن کی عزت محفوظ رہے۔''
''میں سمجھا تھا کہ تم کوئی کڑی شرط رکھنا چاہتی ہو۔''
''یہ میری صرف التجا ہے۔''
''بے فکری ہو جاؤ۔ اگر تم مجھے کوئی دھوکا نہیں دینا چاہتیں تو اپنی بہن کو ہر طرح سے محفوظ سمجھو۔''
''میں تم جیسے شخص کو کیا دھوکا دے سکتی ہوں۔''
''گڈ! اب مجھے اطمینان ہوگیا۔ اس خوشی میں اب کچھ خوشگوار وقت گزار لینا چاہئے۔'' عبداللہ کھڑا ہوا۔
''آج صرف ایک ہی پیگ پیا ہے'' فرح نے سرسری انداز میں پوچھا۔
''کیا تم چاہتی ہو کہ آج میں زیادہ پیوں؟''
''نہیں۔'' فرح نے کہا ''میں ایسا کیوں چاہوں گی۔''
''تو پھر آؤ۔'' عبداللہ نے فرح کا ہاتھ پکڑا۔ وہ اسے بستر کی طرف لے جانا چاہتا تھا۔
فرح نے اٹھتے اٹھتے دوسرے ہاتھ سے اپنا پرس اٹھالیا۔
''پرس یہیں پڑا رہنے دو۔'' عبداللہ نے کہا۔
''کیا فرق پڑتا ہے۔'' فرح نے بے پروائی کا اظہار کیا ''یہ میں سرہانے رکھ لوں گی۔''
''آج کیا اس میں کوئی خاص چیز ہے جسے تم اپنے قریب رکھنا چاہتی ہو؟'' عبداللہ دھیرے سے ہنسا۔
''مجھ جیسی لڑکی کے پرس میں کوئی خاص چیز کیا ہوگی۔''
''ذرا دکھانا!'' عبداللہ نے اس کے پرس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
فرح کچھ گھبرا گئی ''میں نے کہا نا کہ اس میں کوئی خاص چیز نہیں ہے۔''
''تو پھر مجھے دکھانے میں کیا حرج ہے؟''
''تم خواہ مخواہ۔۔۔''
عبداللہ نے جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے پرس چھین لیا۔
''نہیں، نہیں۔'' فرح نے چیخ کر اس کے ہاتھ سے پرس واپس لینا چاہا مگر عبداللہ نے اسے زور سے

بستر پر دھکیل دیا اور پھر اس نے پرس کھولنے میں بھی بالکل تاخیر نہیں کی۔

فرح کا چہرہ فق پڑ گیا۔

''خوب!'' عبداللہ زہریلے انداز میں ہنسا ''تو کل تم نے یہ چاقو اس لیے خریدا تھا کہ آج اسے مجھ پر آزما سکو۔''

''نہیں۔'' فرح نے جلدی سے کہا ''تم غلط سمجھ رہے ہو۔''

''بے وقوف بنانے کی کوششیں نہ کرو۔'' عبداللہ نے اسے خوں خوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''جس طرح عبداللہ کی ہزار آنکھیں ہیں، اسی طرح اس کے آدمی بھی ہیں جو تم پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ مجھے کل ہی اس چاقو کی خریداری کے بارے میں اطلاع مل گئی تھی۔''

''یہ گھریلو استعمال کا چاقو ہے۔'' فرح نے جلدی سے کہا۔

''جسے تم اپنے پرس میں ڈالے پھر رہی ہو۔''

''یہ ایک اتفاق ہے۔ میں نے چاقو خرید کر پرس میں رکھ لیا تھا۔ گھر جا کے میں اسے دوسرے سامان کے ساتھ باورچی خانے میں رکھنا بھول گئی اور یہ میری پرس میں پڑا رہ گیا۔''

''ان باتوں سے عبداللہ بے وقوف نہیں بن سکتا۔'' وہ زہریلے انداز میں بولا ''آج سے پہلے تم نے کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ تم نے اپنا پرس کہاں رکھ دیا ہے۔ تم اس چاقو سے مجھے ختم کرنے کا پروگرام بنا کر آئی تھیں اسی لیے تم یہ بھی چاہتی تھیں کہ میں زیادہ پیوں۔ میری زیادہ مدہوشی تمہاری کامیابی کی ضمانت بن سکتی تھی۔'' عبداللہ یہ سب کچھ کہتا ہوا بستر کے قریب آ گیا تھا۔ اس نے فرح کے بال پکڑ کر اسے بڑی بے دردی سے اٹھایا اور پھر اس کے گال پر اتنے زور کا طمانچہ رسید کیا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

''میں نے کل ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر میرا خیال درست ثابت ہوا تو آج تجھے اور تیری بہن کو سزا ضرور ملے گی۔ اسی لیے میں نے اس کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ تیری بہن آج کالج نہیں پہنچ سکی۔ اسے میں نے اغوا کروا لیا ہے۔ وہ اب میرے قبضے میں ہے۔ ذرا دیر بعد تو اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ میں تیری بہن کا کیا حشر کرواتا ہوں۔''

''نہیں نہیں۔'' فرح دوڑ کر عبداللہ کے قدموں میں گر پڑی'' مجھے معاف کر دو۔ میری بہن کو چھوڑ دو۔''

عبداللہ نے ٹھوکر مار کر فرح کو اپنے قدموں سے دور کر دیا۔ فرح کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے بائیں کنارے سے خون بہنے لگا تھا۔

عبداللہ نے تالی بجائی۔ ایک لمحے بعد ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔ دو آدمی غزالہ کو دھکیلتے ہوئے اندر لائے غزالہ کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔

''غزالہ!'' فرح نے تڑپ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن عبداللہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

''اسے کرسی سے باندھ دو۔'' عبداللہ نے غزالہ کے بارے میں اپنے آدمیوں کو حکم دیا، پھر کہا ''اس کے بعد اسے بھی لے آؤ۔''

فوری طور پر فرح کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ عبداللہ نے اور کسے لانے کا حکم دیا تھا۔

غزالہ کی پھٹی پھٹی سی خوف زدہ آنکھوں میں آنسو بھی تیر رہے تھے۔

اسے کرسی سے باندھنے کے بعد وہ دونوں آدمی کمرے سے گئے اور دو منٹ بعد لوٹے تو ان کے ساتھ پرویز تھا۔ اس کے بھی دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور ہونٹوں پر ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔

''پرویز!'' فرح نے سسکی لی۔ اس وقت بھی اس کا بازو عبداللہ کی مضبوط گرفت میں تھا۔

عبداللہ نے پرویز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے آدمیوں سے کہا ''اس کے ہاتھ آزاد کر دو اور ہونٹوں سے ٹیپ ہٹا دو۔'' اس کے ساتھ ہی

عبداللہ نے فرح کے پرس سے نکالا ہوا چاقو ایک ہی ہاتھ سے کھولا اور فرح کی گردن پر رکھ کر کہا ”اب تمہارے محبوب کو تمہاری زندگی عزیز ہوگی تو وہ وہی کرے گا جو میں اس سے کہوں گا۔تم اسے بھی یہاں دیکھ کر حیران ہو رہی ہوگی لیکن عبداللہ کے لیے کسی کو بھی، کہیں سے بھی اغوا کروالینا کوئی مشکل کام نہیں۔“

اس وقت پرویز کے ہاتھ کھولے جارہے تھے۔

فرح کانپتی ہوئی آواز میں بولی ”اسے تم نے کیوں اغوا کروایا ہے؟“

”تمہیں ایک بھیانک سزا دینے کے لیے۔“ عبداللہ نے سفاکانہ لہجے میں کہا ”ان لوگوں کو میں شدید اذیت پہنچاتا ہوں جو مجھے دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔آج تم مجھے قتل کرنے آئی تھیں لیکن میں اس وقت تمہاری روح کو قتل کروں گا۔“

پرویز کے ہاتھ کھول کر اس کے ہونٹوں سے ٹیپ ہٹا دیا گیا تھا۔اس کو کمرے میں لانے والے دونوں آدمی اس سے ذرا دور ہٹ گئے تھے، مگر ان کے ہاتھوں میں دبے ہوئے ریوالوروں کا رخ اسی کی طرف تھا۔

”ریوالوروں کی ضرورت نہیں ہے۔“ عبداللہ نے ان دونوں سے کہا ”بلکہ اب یہاں تمہاری ضرورت بھی نہیں ہے۔جب تک یہ لڑکی میرے قبضے میں ہے اور چاقو کی نوک اس کی گردن پر ہے یہ شخص یہاں کوئی گڑبڑ نہیں کرسکتا۔“

ان دونوں آدمیوں نے ریوالور اپنی جیبوں میں رکھ لیے پھر وہ وہاں سے جانا ہی چاہتے تھے کہ عبداللہ بولا ”اس لڑکی کے ہونٹوں سے بھی ٹیپ ہٹا دو۔“ اس کا اشارہ غزالہ کی طرف تھا پھر اس نے فرح سے کہا ”میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی بہن کی آہ و بکا بھی سنو۔“

فرح اس وقت اندازہ لگانے سے قاصر تھی کہ عبداللہ کے ذہن میں کیا زہریلا منصوبہ تھا۔

پرویز ہونٹوں سے ٹیپ ہٹنے کے بعد بھی فوری طور پر کچھ نہیں بول سکا تھا۔اس صورت حال میں اس کا دماغ چکرایا ہوا ہوگا۔

غزالہ کے ہونٹوں سے ٹیپ ہٹا کر دونوں آدمی کمرے سے چلے گئے۔

”یہ لوگ کون ہیں فرح!“ آخر پرویز کے منہ سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

فرح کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ وہ پرویز کو کیا جواب دے۔

”یہ بات تم کو میں بتاؤں گا۔“ عبداللہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی ”تمہاری محبوبہ نے آج مجھے قتل کرنا چاہا تھا لہٰذا میں اسے تمہارے ہاتھوں سے سزا دلوانا چاہتا ہوں۔“ پھر اس نے فرح سے کہا ”شاید تم اس بات پر بھی حیران ہوگی کہ میں اس شخص کی تم سے محبت سے بھی واقف ہوں لیکن تمہیں حیران نہیں ہونا چاہیے۔میں جس لڑکی کو ایک بار بھی اپنا مہمان بنالوں، اس کے بارے میں ہر بات سے واقف ہوجاتا ہوں۔“

پرویز نے چونک کر فرح کی طرف دیکھا ”فرح ! کیا یہی وہ شخص ہے جس نے تمہیں۔۔۔“

فرح نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی نظریں جھکالیں۔اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے تھے۔

پرویز اپنی بات ادھوری چھوڑ کر عبداللہ کی طرف دیکھنے لگا۔اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر بھوکے بھیڑیے کی طرح عبداللہ پر ٹوٹ پڑتا اگر عبداللہ کے ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کی نوک فرح کی گردن پر نہ ہوتی۔

”خوب!“ عبداللہ بولا ”گویا تمہاری محبوبہ تمہیں بتا چکی ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوچکا ہے۔“

پرویز اسے گھورتا رہ گیا۔

فرح نے عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی بے بسی سے کہا ”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“

”جلدی کیا ہے تمہیں؟ ابھی سب کچھ سامنے آجائے گا۔“ عبداللہ کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس

سچویشن سے محفوظ ہو رہا ہو۔

غزالہ ہونٹوں سے ٹیپ ہٹ جانے کے بعد بھی خاموش رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی خوف جھانک رہا تھا۔ وہ ایک ایک کی صورت تک رہی تھی۔

''اپنی محبوبہ کی بہن کے بارے میں تمہارے کیا خیالات ہیں؟'' عبداللہ نے پرویز کی طرف دیکھتے ہوئے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

''یہ میرے لیے بہن کی طرح ہے۔'' پرویز نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''واہ!'' عبداللہ مسکرایا ''اس کے باوجود تم اسے تکلیف میں دیکھ رہے ہو۔ وہ بے چاری کرسی سے بندھی ہوئی ہے۔ تمہیں چاہیے کہ آگے بڑھ کر اسے کرسی سے آزاد کراؤ۔''

پرویز خاموش کھڑا اسے گھورتا رہا۔

''سنا نہیں تم نے!'' عبداللہ اچانک غرایا ''اس کی ڈوریاں کھولو۔ اسے موقع دو کہ وہ کرسی سے کھڑی ہو سکے۔''

پرویز ہونٹ بھینچے اس کرسی کی طرف بڑھا جس سے غزالہ بندھی ہوئی تھی۔

بے بسی اور خوف کے شدید احساس سے فرح کا گلا خشک ہونے لگا تھا۔ اپنی گردن پر چاقو کی نوک سے زیادہ وہ اس سوال سے دہشت زدہ تھی کہ عبداللہ ان تینوں کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا۔

پرویز نے غزالہ کی ڈوریاں کھول دیں لیکن غزالہ اتنی خوف زدہ تھی کہ کرسی پر بیٹھی ہی رہی۔

''گڈ!'' عبداللہ نے سر ہلایا ''تم نے اسے ڈوریوں سے تو آزاد کر دیا لیکن اب ایک کام اور کرو۔ اسے کپڑوں سے بھی آزاد کر دو۔''

پرویز اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح چونکا جیسے کسی بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔

''جلدی کرو۔'' عبداللہ غرایا ''برہنہ کر دو اس لڑکی کو!'' غزالہ کا چہرہ عجیب سا ہو گیا۔

''کیا بک رہے ہو تم!'' پرویز نے دانت پیسے۔

''تم جب اپنی محبوبہ کی گردن سے خون بہتا ہوا دیکھو گے تو تمہارے لہجے کی یہ تیزی یقیناً ختم ہو جائے گی۔ اگر تم وہ خون نہیں دیکھنا چاہتے تو وہی کرو جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اور اگر اس لڑکی نے کوئی مزاحمت کی تو اسے اپنی بہن کی گردن سے خون بہتا ہوا دیکھنا پڑے گا۔''

''میں یہ ہرگز نہیں کروں گا۔'' پرویز نے کہا۔

''تمہارے فرشتے بھی کریں گے۔ تم اس کے کپڑے بھی اتارو گے اور اسے اس کی بہن کے سامنے بے آبرو بھی کرو گے!''

''نہیں۔'' فرح کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔

''یہی تمہاری سزا ہو گی۔'' عبداللہ نے سفاکی سے کہا ''تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گی کہ تمہارا محبوب تمہاری بہن کی آبروریزی کرے گا۔ میں نے کہا تھا نا کہ میں ابھی تمہاری روح کو قتل کروں گا۔''

''یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ذلیل انسان!'' پرویز نے دانت پیسے ''تم مجھے ہلاک کر دو یا فرح کی گردن کے ٹکڑے کر ڈالو تمہاری یہ گھناؤنی خواہش ہرگز پوری نہیں ہو گی۔''

''اپنے اس فیصلے پر قائم رہنا پرویز!'' فرح نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ''میری زندگی میری بہن کی عزت سے زیادہ قیمتی نہیں۔'' بات مکمل کرتے ہی فرح کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ عبداللہ نے چاقو پر خفیف سا دباؤ بڑھایا اور چاقو کی نوک فرح کی گردن میں چبھ گئی تھی۔

غزالہ نے فرح کی گردن سے خون کی ایک پتلی سی لکیر بہتے دیکھی تو چیخ پڑی ''باجی!'' وہ کرسی سے کھڑی بھی ہو گئی تھی۔

''اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھنا لڑکی!'' عبداللہ غرایا۔

پرویز کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں اور اس نے اتنی سختی سے دانت پر دانت جمائے تھے کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

''میری زندگی کی پروا ہرگز نہ کرنا پرویز!'' فرح

نے پھر کہا "مجھے اپنی موت کا کوئی خوف نہیں۔"

"اپنے محبوب کو روک کر تم زیادہ خوف ناک تماشا دیکھوگی۔" عبداللہ نے کہا "میں یہاں اپنے دو تین آدمیوں کو بلواؤں گا اور وہ درندوں کی طرح تمہاری بہن کو بھنبھوڑ ڈالیں گے۔"

غزالہ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان اندر آیا۔ کلاشنکوف اس کے شانے سے لٹکی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے سلمان!" عبداللہ نے اس کی طرف دیکھا۔

فرح چونک پڑی۔ یہ وہی سلمان رضا تھا جس سے غزالہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ اسے دیکھ کر غزالہ کے چہرے پر بھی وہی تاثرات ابھرے جو فرح کے تھے لیکن عبداللہ ان دونوں کو چونکتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ اس کی توجہ سلمان رضا کی طرف تھی۔

"آپ کو ایک اہم اطلاع دینا ہے سر!" سلمان رضا اس طرح عبداللہ کی طرف بڑھا جیسے کوئی بات اُسے چپکے سے بتانا چاہتا ہو۔

سلمان رضا اس کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس نے اپنے شانے سے لٹکی ہوئی کلاشنکوف کا بٹ اتنی زور سے عبداللہ کے ہاتھ پر مارا کہ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

☆☆☆

سلمان رضا جو ایک دہشت گرد رہ چکا تھا' اس نے یہ حرکت اتنے تربیت یافتہ انداز میں کی تھی کہ چاقو سے فرح کو ذرا بھی گزند نہ پہنچی تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے سلمان رضا نے تیزی سے چند قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے شانے سے کلاشنکوف اتار کر اس کا رخ عبداللہ کی طرف کر دیا تھا۔

عبداللہ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہو۔

"اب تم موت کو اپنے سر پر محسوس کرو!" سلمان رضا نے عبداللہ کو گھورتے ہوئے کہا اور بایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر ایک ریوالور نکال لیا جس کی نال پر سائلنسر لگا ہوا تھا "یقین کرو کہ میرے بائیں ہاتھ کا نشانہ بھی دائیں ہاتھ کے نشانے کی طرح سچا ہے۔ میں اس بے آواز ریوالور سے تمہارا کچھ بھی حشر کر سکتا ہوں۔ باہر کسی آدمی کو بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس کمرے میں کیا ہو گیا!"

"سلمان!" فرح کی آواز میں مسرت آمیز کپکپاہٹ تھی۔ اس کی گردن سے خون اب بھی بہہ رہا تھا۔

پرویز نے چونک کر سلمان کی طرف دیکھا۔ وہ سلمان کے نام سے تو واقف تھا لیکن اس کا چہرہ شناس نہیں تھا۔

"فرح باجی!" سلمان رضا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "آپ اپنی گردن پر رومال باندھ لیجیے۔"

پرویز تیزی سے فرح کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے اپنی جیب سے رومال نکال لیا تھا۔

عبداللہ ہونٹ بھینچے سلمان کو گھورنے لگا۔ وہ ابتدائی جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔

"میں نہیں جانتا کہ تم میرے لیے بغلی گھونسا کیوں ثابت ہوئے ہو۔" عبداللہ نے کہا "لیکن یہ احساس تمہیں ضرور ہونا چاہئے کہ مجھے کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا کر تم یہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے۔"

"میں اتنے کرب میں ہوں عبداللہ کہ میرے دل میں موت کا خوف ذرا بھی نہیں ہے لیکن تمہارے یہ تینوں قیدی یہاں سے زندہ ہی جائیں گے اور امکان ہے کہ میں بھی یہاں نہیں مروں گا۔"

"تمہاری اس حرکت کا سبب کیا ہے؟" عبداللہ اسے گھورتا رہا۔

"وہ بھی بتاؤں گا لیکن پہلے تمہیں وہ کام کرنا ہے جو میں چاہتا ہوں۔" سلمان رضا نے کہا اس نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ فرح دھیمی آواز میں پرویز سے کچھ کہہ رہی تھی جو اس کی گردن پر رومال باندھ چکا تھا۔ وہ دونوں اب غزالہ کے قریب تھے اور غزالہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے سلمان رضا کی طرف دیکھ

رہی تھی۔

"عبداللہ!" سلمان رضا نے ایک لمحے رک کر کہا "تم اپنے گروپ کے سارے آدمیوں کو یہاں بلا لو ان سب کو اس ہال میں جمع ہونا ہے جہاں تم بہت کم کوئی ایسی میٹنگ کرتے ہو جس میں گروپ کے تمام لوگ جمع ہوتے ہیں مجھے معلوم ہے کہ تمہیں ان سب کو فون نہیں کرنا پڑے گا تمہیں صرف اپنے نائب کو فون کرنا پڑے گا۔ باقی کام تمہارا نائب کرے گا۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"اس وقت ایسی پچویشن نہیں ہے کہ تم مجھ سے کوئی سوال کرو۔" سلمان رضا نے بڑے سکون سے کہا "تمہیں صرف حکم ماننا ہے اور کچھ نہیں کرنا۔ چلو اٹھاؤ فون کا ریسیور۔" سلمان رضا نے ٹیلی فون کی طرف اشارہ کیا جو بستر کے سرہانے دائیں جانب رکھا ہوا تھا۔

عبداللہ نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

سلمان رضا نے منہ بنایا "شاید تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ اچانک کوئی تمہاری مدد کے لیے یہاں آسکتا ہے۔ تم اپنے ذہن سے یہ بات نکال دو عبداللہ! تم سے بہت بڑی غلطی یہ ہوئی ہے کہ تم نے اچانک مجھے اپنے باڈی گارڈز کا چیف بنا دیا ہے جو لوگ اس کمرے کے آس پاس تھے، میں انہیں میٹنگ ہال کی طرف بھیج چکا ہوں۔ ڈیڑھ سال سے میں اسی وقت کا منتظر تھا کہ تم مجھے خود سے اتنا قریب کرلو۔ تمہارا یہ اعتماد حاصل کرنے کے لیے مجھے اس شہر میں تمہارے کئی مخالفین کا خون بہانا پڑا ہے۔" یہ جواب دیتے ہوئے سلمان رضا نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے فرح وغیرہ کی طرف دیکھا۔ اس کی توقع کے مطابق اس کی بات نے ان تینوں کو ہی چونکا دیا تھا۔

"ہاں فرح باجی!" سلمان رضا نے کہا "میں کوئی اچھا انسان نہیں ہوں۔ یہاں سے آپ تینوں کے نکل جانے کا بندوبست میں کر چکا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ جانے سے پہلے کچھ باتیں سن لیں۔ خاص طور سے غزالہ کو اس کا علم ہو جائے کہ وہ ایک دہشت گرد سے محبت کی غلطی کر بیٹھی تھی۔ اب اسے اپنی زندگی میں یہ رنج ہرگز نہیں ہوگا کہ وہ میری شریک زندگی نہیں بن سکی۔ میں اس قابل نہیں ہوں فرح باجی کہ کسی اچھی لڑکی کی زندگی کا ساتھی بن سکوں۔"

"تم ناقابل یقین سی باتیں کر رہے ہو سلمان!" فرح لرزیدہ آواز میں بولی۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں فرح باجی! کیوں عبداللہ! میری کوئی بات غلط نہیں ہے نا؟"

عبداللہ ہونٹ بھینچے کھڑا رہا۔

"چلو، فون کرو۔" اچانک سلمان غرایا اور پھر فوراً ہی اس کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی عبداللہ کے جوتے سے ٹکراتی ہوئی گزر گئی۔ عبداللہ اچھل پڑا تھا۔ سلمان رضا نے کہا "تم نے دیکھ لیا، میرا نشانہ کتنا سچا ہے؟ میں تمہارے جسم کے مختلف حصوں میں اس طرح گولیاں اتار سکتا ہوں کہ تمہیں موت نہیں آئے گی۔ تم صرف تڑپتے رہو گے لہٰذا اس طرح تڑپنے سے بہتر یہی ہے کہ تم میری بات مانو اور اپنے نائب کو فون کرو۔"

اب عبداللہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ سلمان رضا کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

"شاباش!" سلمان رضا نے کہا "اپنے نائب سے یہ بھی کہنا کہ جب سب لوگ جمع ہو جائیں تو ٹیلی فون پر ہی تمہیں اس کی اطلاع دے دی جائے۔"

عبداللہ نے ریسیور اٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔ رابطہ قائم ہو جانے کے بعد اس نے اپنے نائب سے وہی سب کچھ کہہ دیا جس کی ہدایت اسے سلمان رضا نے دی تھی پھر جب اس نے ریسیور رکھ دیا تو سلمان رضا نے مسکراتے ہوئے کہا "جو صرف حکم دینا جانتا تھا، آج اسے حکم کی تعمیل کرتے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔"

"تم جو کچھ بھی کر رہے ہو، تمہیں اس کا خمیازہ

ضرور بھگتنا پڑے گا۔'' عبداللہ نے اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''میرا مقصد پورا ہو جائے تو میں ہر خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار ہوں عبداللہ!''

''کیا مقصد ہے تمہارا؟''

سلمان رضا نے اسے جواب نہیں دیا اور بولا'' فرح باجی! میں آپ لوگوں کو یہاں بس اتنی دیر اور روکنا چاہتا ہوں کہ عبداللہ کا گروپ اس عمارت میں پہنچ جائے۔ مجھے احساس ہے کہ آپ کی گردن سے خون بہہ رہا ہے لیکن مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ وہ بہت معمولی زخم ہے۔ آدھے گھنٹے میں آپ کا زیادہ خون نہیں بہے گا۔ آدھے گھنٹے بعد میں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ تینوں یہاں سے کس طرح نکل سکتے ہیں۔''

''تم میرے ساتھ نہیں چلو گے سلمان؟'' پرویز نے کہا۔

''نہیں پرویز بھائی!'' سلمان رضا نے کہا'' میں آپ لوگوں کے جانے کے چند منٹ بعد یہاں سے نکلوں گا۔''

''لیکن۔۔۔''

''میں نے جو کچھ کہا ہے، اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔'' سلمان رضا کے لہجے میں سختی آ گئی لیکن پھر فوراً ہی اس نے نرم لہجے میں کہا۔'' مجھے معاف کر دیجیے گا غزالہ باجی! مجھے آپ لوگوں سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے لیکن میرے سامنے جو مقصد ہے، میں اس میں کسی کو بھی حائل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

پرویز، فرح اور غزالہ اس کا منہ تکتے رہ گئے۔

☆☆☆

پچیس منٹ بعد اس کمرے کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عبداللہ نے ریسیور اٹھانا چاہا تھا کہ سلمان رضا نے اسے روک دیا اور خود ٹیلی فون کے قریب جا کر ریسیور اٹھایا'' ہیلو!'' اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

''کمانڈر!'' دوسری طرف سے آواز آئی'' تم باس کے کمرے میں ہو؟''

''ہاں۔'' سلمان رضا نے کہا'' باس کے اشارے پر ہی میں نے ریسیور اٹھایا ہے۔ کیا میں انہیں بتا دوں کہ سب لوگ جمع ہو گئے ہیں؟''

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے۔'' سلمان رضا نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

عبداللہ اسے گھورتا رہا۔ شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سلمان رضا کیا کرنے والا تھا۔

''پرویز بھائی!'' سلمان رضا نے کہا'' میرے پاس آیئے!''

پرویز اس کے قریب آ گیا۔ سلمان رضا نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر اسے دیا اور کہا'' اس کاغذ پر کوٹھی کے ان راستوں کا نقشہ ہے جن پر چل کر آپ کوٹھی کے عقبی لان میں جا نکلیں گے۔ عقبی دیوار میں آپ کو ایک چھوٹا سا آہنی پھاٹک نظر آئے گا۔ اس سے باہر نکل جایئے گا۔ وہاں آپ کو نیلے رنگ کی ایک کار کھڑی نظر آئے گی۔ اس میں بیٹھ کر آپ تینوں یہاں سے دور نکل جایئے گا۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کار ڈرائیونگ جانتے ہیں۔ یہ اس کار کی چابی ہے۔'' سلمان رضا نے جیب سے ایک چابی بھی نکالی اور پرویز کی طرف بڑھا دی۔

''سلمان!'' فرح نے کہا'' تم بھی ہمارے ساتھ نکل چلو۔''

''میں آپ لوگوں کو بتا چکا ہوں باجی کہ میں ایک دہشت گرد ہوں۔'' سلمان رضا نے بڑی سنجیدگی سے کہا'' مجھے یہاں جو کام ہے، وہ مکمل کیے بغیر میں یہاں سے نہیں جا سکتا لیکن آپ یقین کر لیں کہ میں یہاں سے زندہ ہی نکلوں گا۔ اگر آپ مجھے یہاں سے نکلتے ہوئے دیکھنا ہی چاہتی ہیں تو یہ بھی ممکن ہے۔ پرویز بھائی! آپ کار میں اس کوٹھی کے سامنے کی سڑک پر آ جایئے گا لیکن اس کوٹھی سے دو تین فرلانگ دور ہی رہیے گا۔ آپ تینوں مجھے یہاں سے نکلتا ہوا دیکھ لیں گے۔ بس اب دیر نہ کیجیے۔''

''بہتر ہوتا کہ تم۔۔۔'' پرویز نے کہنا چاہا۔

''نہیں۔'' اس مرتبہ سلمان رضا کا لہجہ پھر سخت ہوگیا۔ پرویز نے ٹھنڈی سانس لے کر فرح کی طرف دیکھا ''چلو فرح۔''

''جایئے باجی!'' سلمان رضا نے کہا۔ اس نے اب تک ایک بار بھی غزالہ کو براہ راست مخاطب نہیں کیا تھا۔

غزالہ بھی ایسی کیفیت میں تھی جیسے دماغی طور پر سکتے میں ہو۔ جب وہ پرویز اور فرح کے ساتھ اس کمرے سے نکل رہی تھی تو اس نے ایک مرتبہ مڑ کر سلمان رضا کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

سلمان رضا نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بڑبڑایا ''دس منٹ بعد وہ یقیناً اس کوٹھی سے نکل چکے ہوں گے۔''

عبداللہ کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔

''اب میں تم سے چند منٹ بعد بات کروں گا۔'' سلمان رضا نے کہا ''تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا عبداللہ کہ کسی دن تم کسی کے سامنے چوہے کی طرح بے بس ہو جاؤ گے۔''

عبداللہ خاموش رہا۔ اس کے بعد سلمان رضا نے بھی خاموشی اختیار کرلی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ گھڑی کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ایک طویل سانس لی ''دس منٹ گزر چکے ہیں۔ اب سنو عبداللہ کہ میں ایک بدنصیب بہن کا بھائی ہوں۔ میری اس بدنصیب بہن کا نام تابندہ تھا لیکن تمہیں اس کا نام کہاں یاد ہوگا! تم نے اتنی لڑکیوں کی زندگی برباد کی ہے کہ تمہیں ان کے نام یاد نہیں ہوں گے لیکن میں تمہیں یاد دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں جب یہاں تمہارے پاس آیا ہوں، اس سے دو ماہ قبل تم نے جس لڑکی کو اغوا کروا کے اس کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا تھا اور پھر اسے بے ہوشی کی حالت میں اس کے گھر بھی پہنچا دیا تھا، وہ میری بہن تھی۔ اس کا نام تابندہ تھا۔ میرے والد یہاں کے ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازم تھے۔ تم نے ان کے ذریعے اس ادارے میں کچھ گڑبڑ کروانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ تم کیا ہو لیکن انہوں نے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی سزا تم نے انہیں ایسی دی جو کوئی غیرت مند باپ برداشت نہیں کرسکتا۔ میری بہن بھی ایسی تھی کہ ہوش میں آنے کے بعد اس نے خودکشی کرلی تھی۔ شاید میرے والد بھی یہی کرتے مگر ان کا انتقال ہارٹ فیل کی وجہ سے ہوا۔ انہوں نے مجھے امریکا فون کر کے بتایا کہ میری بہن پر کیا گزری تھی۔ انہوں نے مجھے تمہارا نام بھی بتایا تھا۔ مجھ سے باتیں کرتے کرتے ہی ان پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ مجھے اندازہ ہے کہ وہ کتنی بے بسی سے مرے ہوں گے کیونکہ گھر میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میری والدہ تو میرے بچپن میں ہی مر گئی تھیں۔ میرے والد اس بات سے واقف نہیں تھے کہ میں امریکا میں کیا بن چکا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میں اپنی بہن کا انتقام بھی لے سکتا ہوں۔ انہوں نے تو بس اپنے بیٹے کو اطلاع دی تھی کہ اس کی بہن کے ساتھ کس نے کیا کر ڈالا ہے۔''

عبداللہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''شاید تمہیں وہ لڑکی یاد آگئی ہے۔'' سلمان رضا نے تلخ لہجے میں کہا ''خیر۔۔۔ اس اطلاع سے میرے دل پر بھی جو قیامت گزر گئی۔ میں تم سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہوا اور یہاں آگیا۔ میرے ایک چچا اور چچی ایک اور شہر میں رہا کرتے تھے۔ میں انہیں یہاں لے آیا اور ان کے ساتھ رہنے لگا پھر میں نے کسی نہ کسی طرح تم سے رابطہ کیا۔ امریکا میں تم مجھ سے مل چکے تھے۔ دہشت گردی کے میدان میں تمہیں میری صلاحیتوں کا علم تھا لہٰذا تم نے مجھے اپنے گروپ میں شامل کرلیا۔ میں اس ڈیڑھ برس میں تمہیں کسی وقت بھی ہلاک کرسکتا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ تمہیں بڑی بے بسی کی موت ماروں اور مرنے سے پہلے تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ سزا تمہیں ایک بدنصیب لڑکی کے بھائی نے دی ہے۔''

عبداللہ کے چہرے کا رنگ بدلتا رہا اور سلمان

رضا نے اپنی بات جاری رکھی ’’ڈیڑھ برس تک تم نے مجھے خود سے قریب ہونے کا موقع نہیں دیا لیکن آخر کار مجھے یہ موقع بہت صحیح وقت پر ملا۔ میں نے اس لڑکی کی عزت بچالی جو مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ میں اس کی بڑی بہن کو تمہاری ہوس کی بھینٹ چڑھنے سے نہ بچاسکا۔ بہر حال! اب تمہارا آخری وقت آ گیا ہے۔ میں نے اس کوٹھی کے مختلف حصوں میں بم لگادیے ہیں جو اس کوٹھی کو ملبے کا ڈھیر بنادیں گے جس میں تمہاری لاش کے ساتھ تمہارے گروپ کا ہر آدمی دفن ہوجائے گا۔ ریموٹ میری جیب میں ہے۔ میں اس کوٹھی سے نکل کر ایک ایک کر کے بٹن دیا تا رہوں گا اور وہ بم پھٹتے رہیں گے۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ عبداللہ کی آواز پھٹی پھٹی سی تھی ’’ایسا نہ کرنا سلمان! میں تمہیں بے پناہ دولت دے سکتا ہوں۔‘‘

’’دولت!‘‘ سلمان نے حقارت سے کہا ’’میری بہن کی غیرت کے مقابلے میں تمہاری یہ دولت رائی کے ایک دانے سے زیادہ نہیں۔ بس اب تم اس دنیا سے رخصت ہوجاؤ۔ تم نے جان لیا ہے کہ تمہیں یہ موت، یہ سزا کس لیے مل رہی ہے۔‘‘

عبداللہ کو مزید کچھ بولنے کا موقع نہیں ملا۔ سلمان رضا کے ریوالور سے پے درپے نکلنے والی گولیوں نے اس کے سینے میں متعدد سوراخ کردیے تھے اور وہ قالین پر گر کر اپنے خون میں تڑپنے لگا تھا۔

☆☆☆

کوٹھی سے چند فرلانگ کے فاصلے پر کار میں بیٹھے ہوئے پرویز، فرح اور غزالہ نے ایک زور دار دھماکے کی آواز سنی اور اچھل پڑے۔

پھر پے درپے دھماکے ہونے لگے۔ عبداللہ کی شاندار حویلی کے در و بام فضا میں اڑنے لگے۔ آگ کے شعلے ہر طرف بھڑک اٹھے۔

آسمان کی طرف لپکتے ہوئے شعلوں کے پیش منظر میں سلمان رضا دکھائی دیا جس کے بائیں ہاتھ میں کلاشنکوف تھی اور وہ بڑے سکون سے آگے بڑھتا چلا آرہا تھا۔ اس کے انداز میں خوف کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

اردگرد کے علاقوں میں گشت کرتی ہوئی پولیس موبائلز نے ان دھماکوں کی آوازیں سنیں تو تیزی سے اس طرف آئیں اور سلمان رضا نے انہیں دیکھتے ہی کلاشنکوف ایک طرف پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ اٹھادیے۔

کار میں غزالہ اس طرح ہونٹ بھینچے بیٹھی ہوئی تھی جیسے اپنی چیخوں کو اپنے سینے کی قید سے آزاد نہ کرنا چاہتی ہو لیکن آنکھوں سے زار و قطار بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

ھنسیئے

عدم تحفظ

ایک خاتون اپنے بچے کو ماہر نفسیات کے پاس لے گئیں۔ بچے سے بہت سے سوالات کرنے کے بعد ماہر نفسیات نے کہا:

’’بچے کی تحلیل نفسی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بچہ لاشعوری طور پر عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہے۔‘‘

خاتون نے پریشان ہوکر کہا: ’’لیکن میں تو اسے اس لیے آپ کے پاس لائی تھی کہ اس کی وجہ سے پورا محلہ ہی عدم تحفظ کا شکار ہے۔‘‘

☆......☆

☆

گڑیا

رفعت رضا

ازدواجی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے بیوی اور شوہر ہیں اگر ایک پہیا بھی روایتی چال سے ہٹ جائے تو گاڑی کا آگے بڑھنا مشکل ہوجاتا ہے ' ایسے ہی ایک جوڑے کا احوال جہاں ازدواجی زندگی کا توازن بگڑ گیا تھا۔

ایک جوڑے کے کشیدہ تعلقات کے معمول پر آنے کا دلچسپ قصہ

ان دنوں صارفین کی صحت وسلامتی کا بڑا تذکرہ ہے۔ ہر کمپنی چکنائی، مٹھاس کا ربوہائیڈریٹس کی باتیں کرتی دکھائی دیتی ہے۔ لوگ نکوٹین، ماحولیاتی آلودگی اوراوزون کی تہ میں ہونے والے سوراخ کے بارے میں متفکر رہتے ہیں۔ نیوکلیائی تابکاری کا بھی خاصاچرچاہوتا ہے۔

یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور شے مارکیٹ میں فروخت ہورہی ہے جس کے نقصانات کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا۔ وہ چیز کیا ہے اور کس طرح نقصان دہ ہے؟ میں بتاتا ہوں۔۔۔ مگر ٹھہریے بات شاید اس طرح واضح نہ ہوسکے لہذا میں پورا قصہ بیان کرتا ہوں۔

یہ کوئی اٹھارہ ماہ قبل کی بات ہے جب مجھے مارتھا ڈرس کول نے شکاگو بلایا۔ وہ وہاں کے آرڈی نیٹ ٹوائے کمپنی میں صدر کے عہدے پر کام کررہی تھی۔ مجھے کبھی بھی اس طرح بلایا جانا کچھ اچھا نہیں لگتا مگر معاملہ چونکہ مارتھا کا تھا لہذا میں انکار تو کرہی نہیں سکتا تھا۔

جب میں اس کے شاندار دفتر میں داخل ہوا تو اس نے میرا پرتپاک استقبال کیا اور نہایت اطمینان سے بولی ”جیک۔! مائی ڈیئر۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میرے لیے ایک گڑیا چوری کرلاؤ۔“

میں حیرت سے منہ پھاڑے اس کو دیکھتا رہ گیا۔

”تم پاگل ہو یا مجھے پاگل بنانے کی کوشش کررہی ہو۔“ میں نے بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے ذرا ناراضی سے کہا۔

”بدتمیزی نہیں، میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“ اس نے سنجیدہ لہجے میں ہی جواب دیا تو مجھے سیدھا ہوکر بیٹھنا پڑا ”تمہیں جیولس ڈی پیرس میں تیار ہونے والی نئی گڑیا کا ڈیزائن وہاں سے اڑانا ہے۔“

”جیولس ڈی پیرس؟“ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا ”یہ وہی کمپنی تو نہیں جس نے تمہاری مشینی گڑیا کا خیال اور ڈیزائن چوری کروایا تھا؟“

وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے مسکرائی اور میرا دل اتھل پتھل ہوکر رہ گیا مگر میں نے اپنے جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ دراصل مارتھا بیک وقت دو کردار ادا کررہی تھی۔ وہ میری بیوی تھی، محبت کرنے



والی وفادار، غم گسار اور ہمدرد بیوی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کمپنی کی صدر بھی تھی۔ ذمے دار فرض شناس اور محنتی صدر۔

ہماری شادی کو سات سال ہو چکے تھے۔ جب شادی ہوئی تو وہ اگرچہ اس کمپنی کی ملازم تھی مگر کسی غیر اہم سے عہدے پر۔ شادی کے بعد تو گویا اس کی لاٹری کھل گئی۔ اس نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور مختصر سے عرصے میں صدر کے عہدے تک جا پہنچی۔

اس تمام عرصے میں اس کی پیشہ ورانہ مصروفیات اس قدر زیادہ رہیں کہ وہ بیوی ہونے کو بھی فراموش کر بیٹھی۔ البتہ جب بھی وہ بیوی بنی اس نے اس کا حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر اب اس کا کوئی کیا کرے کہ ایسے مواقع سات سال کے دوران میں بہت ہی کم آئے۔

میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ میں اسے بیوی بنانا اور بیوی سمجھنا چاہتا تھا جس کا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ مسئلہ خاصا گمبھیر تھا جس کا بالآخر حل یہ نکلا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ علیحدہ نہیں ہوئے۔ وہ میری بیوی رہی اور میں اس کا شوہر مگر اب ہم ایک ساتھ نہیں رہتے تھے۔ میں اپنے طور پر شدت سے خواہش مند تھا کہ ہماری جدائی کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے مگر اس کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

”تمہیں پتا ہے میں چوری کرنے سے گھبراتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

اس کی گہری براؤن آنکھوں میں حیرت اتر آئی ”سی آئی اے کی دس سالہ ملازمت کے بعد بھی تم یہ کہہ رہے ہو۔ اتنی متحرک اور پرجوش زندگی گزارنے والا کبھی بھی کسی چیلنج سے نہیں گھبرا سکتا۔ تمہیں یہ کام کرنا ہوگا۔ میری خاطر۔“

”میری خاطر!“ بس یہ دو الفاظ سن کر سب کچھ

بھول گیا۔ اس کی خاطر تو میں سب کچھ کرنے پر آمادہ تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید اس کے اس طرح کام آنے سے ہمارے معاملات کچھ بہتر ہو سکیں۔

''اب تمہاری بات کو تو میں ٹال نہیں سکتا۔'' میں نے والہانہ انداز میں بلا تاخیر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

اس کے ہونٹوں پر پرغرور فتح مندانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''وہ کسی پرانے فیشن کی گڑیا میں چند تبدیلیاں کر کے اسے نئی گڑیا کی صورت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔'' مارتھا نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا ''کاروباری حلقوں میں ہونے والی سرگوشیوں کے مطابق ان کا یہ نیا ڈیزائن گڑیا سازی کی صنعت میں انقلاب برپا کر دے گا۔ ہر عمر کی لڑکیاں اس کی دیوانی ہو جائیں گی لہٰذا تم فوری طور پر پیرس روانہ ہو جاؤ۔'' آخر میں اس نے حکم جاری کر ہی دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سعادت مندی سے کہا ''ہم رات کے کھانے پر اس حوالے سے مزید تفصیلات پر گفتگو کر لیں گے۔'' میں نے امید سے اسے دیکھا۔

اس نے تیز نظر سے مجھے دیکھا پھر بھرپور مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلتی چلی گئی۔

کھانا نہایت خوش ذائقہ تھا۔ ڈنر کے دوران میں ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر اچانک اس نے کاروباری گفتگو شروع کر دی۔

''اب باربی ڈول یا شیرا اور ریجیڈی این میں لوگوں کی دلچسپی کم ہو رہی ہے۔ لوگ اس کے علاوہ بھی کچھ چاہتے ہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی اور میں بے توجہی سے سر ہلا رہا تھا۔

''کمپنی خسارے میں ہے۔'' ہر کاروباری انسان کی طرح وہ رٹا رٹایا جملہ بول رہی تھی۔ ''اور مجھے اس کو خسارے سے نکال کر منافع میں لانا ہے۔ کمپنی کے شیئر ہولڈرز نے ویسے بھی عورت کی سربراہی کو زیادہ پسند نہیں کیا تھا اور جو اس کے حق میں ہیں، وہ بھی میری موجودگی کے دوران میں کچھ تبدیلی، کچھ نیا پن چاہتے ہیں۔''

''ویری گڈ! یہ تو اچھی خبر ہے۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

''ذرا غور کرو۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں زیڈ پی جی کے حوالے سے کچھ کروں۔ اب تم بتاؤ کہ میں اس سلسلے میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔'' وہ مسلسل بول رہی تھی۔

''زیڈ پی جی؟'' میں نے چونک کر پوچھا ''یہ کیا بلا ہے؟''

''زیرو پاپولیشن گروتھ!'' اس نے جواب دیا'' آج کے والدین اول تو اولاد پیدا ہی نہیں کرنا چاہتے اور جو چاہتے ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ ایک یا دو اور یہ رجحان گڑیا سازی کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔''

میں نے کہنا چاہا کہ یہ بات اس کے عمل سے متصادم ہے۔ بچوں کے بارے میں اس کے خیالات بھی ان والدین جیسے ہی تھے جن کا وہ ذکر کر رہی تھی مگر پھر اس کے غصے کا خیال کر کے میں خاموش رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جب ہماری بات کچھ چل نکلی ہے، میں ایسی کوئی بات کر کے اس کا موڈ خراب کر دوں۔

''شاید اس گڑیا کے متعارف کرانے سے میں اپنے شیئر ہولڈرز کا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔'' وہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی ''تو تم میرا یہ کام کرنے پر رضامند ہو چکے ہونا'' اس نے پوچھا۔

میں نے دوبارہ ہاں کر دی۔

کھانے کے بعد ہم اس کے اپارٹمنٹ پہنچے۔ شیمپین کا دور چلا تب بھی وہ مجھ سے گڑیا اور گڑیا سازی کے متعلق گفتگو کرتی رہی۔ میں ہوں ہاں کرتا رہا پھر وہ ایک آرام دہ صوفے میں نیم دراز ہو کر نیم وا آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

''جیک!'' اس نے آہستگی سے کہا ''تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔ آؤ یہاں آ جاؤ۔''

یہ بھی اس کا انداز تھا۔ وہ گزارش بھی حکم دینے

کے انداز میں کرتی تھی۔ میں اس کا شوہر تھا۔ بھلا اپنی بیوی کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا اور بیوی بھی وہ جو ایک کمپنی کی چیف ایگزیکٹو تھی۔

☆☆☆

بوئنگ سیون فور سیون کی کھڑکی سے پیرس ہمیشہ کی طرح خوب صورت اور پرکشش نظر آرہا تھا مگر میرے پاس اس کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے کا وقت نہیں تھا۔ کسٹم وغیرہ سے نمٹ کر میں نے ایک ہوٹل میں کمرا حاصل کیا اور پھر سیدھا اپنے ایک پرانے ساتھی کے پاس جا پہنچا جو بارھویں اسٹریٹ کے مخصوص بار کی مخصوص میز پر ترنگ میں بیٹھا کچھ گنگنا رہا تھا۔

وہ مجھ سے بہت سینئر تھا مگر ہم پیشہ ہونے کے باعث ہم میں خاصی سے زیادہ بے تکلفی تھی۔

میرا مسئلہ سن کر وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ ویٹر کو بلا کر ایک بڑے پیگ کا آرڈر دینے کے بعد جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔

"میرا خیال ہے کہ میری بیوی کے ایک کزن کا انکل اس بلڈنگ میں چوکیداری کرتا ہے جس میں جیولس ڈی پیرس کے چیف ڈیزائنر کا دفتر واقع ہے۔" اس نے دو تین بڑے گھونٹوں میں لارج پیگ کو اپنے معدے میں انڈیلتے ہوئے کہا پھر آستین کی پشت سے اپنے ہونٹ پوچھتے ہوئے بولا "اور وہیں وہ سیف بھی ہوگا جس میں تمہاری مطلوبہ شے رکھی ہوگی۔"

"پھر تو بے کار ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا "مجھے تو سیف وغیرہ توڑے مدت گزر چکی ہے اور میں بھول چکا ہوں کہ۔۔۔"

"فضول بات۔" اس نے مجھے جملہ پورا کرنے کا موقع نہیں دیا "کوئی بھی شخص ایسا کام کبھی نہیں بھولتا۔"

میں نے اس کی بات کی تردید نہیں کی مگر دل ہی دل میں سوچا کہ سیکرٹ ایجنٹ سب سے پہلے براہ راست کارروائی سے ہمیشہ گریز کرتا ہے۔ اسے کی کوشش ہوتی ہے کہ ادھر ادھر کے کسی ذریعے سے اس کا مسئلہ حل ہو جائے۔ یہی سوچ کر میں نے اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے مشورہ دیا، تاہم میں نے اس کے مشورے پر عمل درآمد سے معذوری ظاہر کی۔

میری بات سن کر وہ خاصا مایوس ہوا لیکن میں نے اس کے لیے ایک اور ڈرنک کا آرڈر دے کر اس کی مایوسی کو خوشی میں بدل دیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں نے سوچا تھا کہ پہلے ذرا جیولس ڈی پیرس کے دفاتر کا جائزہ لے لیا جائے۔ ممکن ہے وہاں سے کوئی ایسی راہ نکلتی نظر آئے کہ جس سے میرا مقصد قدرے آسانی سے پورا ہو سکے۔

پندرہویں اسٹریٹ پر دو بلند و بالا عمارت کے درمیان جیولس ڈی پیرس کے دفاتر کی تین منزلہ عمارت پھنسی پھنسی سی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جیولس ڈی پیرس کے اکثر دفاتر وہاں سے منتقل ہو گئے تھے۔ صرف چند ایک شعبہ جات فی الوقت اس بلڈنگ میں بدستور کام کر رہے تھے۔ جن میں اس کے چیف ڈیزائنر کا کمرا بھی شامل تھا۔

تجارتی عمارتوں کی طرح وہ عمارت بھی خوب بارونق تھی۔ میں جب عمارت کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوا تو سامنے ہال میں اچھے خاصے لوگ موجود تھے جو جیولس ڈی پیرس کے مختلف شعبوں میں جانے کے لیے لفٹ کا انتظار کر رہے تھے۔

آنے والوں کی رہنمائی کے لیے لگی ایک تختی سے مجھے علم ہوا کہ چیف ڈیزائنر کا کمرا سب سے اوپر والی منزل پر واقع تھا۔ اس منزل پر کمپنی کا مارکیٹنگ کا دفتر بھی تھا۔ اپنی باری پر میں لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچ گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس منزل تک آنے والا میں واحد شخص تھا۔

لفٹ سے باہر آتے ہی میری نگاہ سامنے کاؤنٹر پر پڑی جس کے عقب میں سیاہ آنکھوں اور گلابی رنگت والی نازک اندام لڑکی مجھے خیر مقدمی مسکراہٹ سے دیکھ رہی تھی۔

''خوش آمدید موسیو! میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟'' لڑکی کی دلفریب مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی اور میں اس کی آنکھوں کے سحر میں کھوتا جارہا تھا۔ میری محویت دیکھ کر لڑکی نے ہلکے سے کہا تو میں ذرا چونک گیا۔

میں نے اسے بتایا کہ میں واشنگٹن سے آیا ہوں جہاں میرا کھلونوں وغیرہ کا چھوٹا سا کاروبار ہے اور اب میں جیولس ڈی پیرس کی تیار کردہ گڑیوں کو اپنے شوروم سے فروخت کرنا چاہتا ہوں۔

اس نے بغور میری بات سنی پھر اپنے سامنے رکھے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر بڑی مہارت سے انگلیاں چلانے لگی چند لمحے بعد اس نے اسکرین پر سے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا ''موسیو آپ اس سلسلے میں موسیو لیسارڈ سی ملاقات کرلیں۔ وہ آپ کی زیادہ بہتر طریقے سے رہنمائی کرسکیں گے۔''

''وہ کہاں ہوتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ جاننے کے لیے آپ کو میرا تعاقب کرنا ہوگا۔'' اس نے ایک ادائے دلبری سے کہا اور کاؤنٹر سے باہر آگئی۔ اس کا رخ بائیں ہاتھ کی کشادہ راہداری کی طرف تھا۔

میں اس کے عقب میں تھا اور دل کو زیروزبر کردینے والی اس کی چال کو دیکھ رہا تھا۔ راہداری کے تمام کمرے ایک سمت بنے ہوئے تھے۔ اس کی قیامت خیز چال سے تھوڑی سی نظریں ہٹا کر میں نے دیکھ لیا تھا کہ جیولس ڈی پیرس کے چیف ڈیزائنر کا کمرا بھی اسی راہداری میں واقع تھا۔

کوریڈور کے اختتامی سرے سے کچھ پہلے اچانک وہ رک گئی۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا گویا تمام کائنات رک گئی ہو۔ اس نے نہایت آہستگی سے دستک دے کر دروازہ کھولا اور مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے میرے نام کا اعلان کیا ''موسیو جیک کول سر!''

میں اندر داخل ہوگیا۔ دروازہ میرے عقب میں بند ہوگیا۔ نہایت شاندار آفس قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا مگر میز کے دوسری طرف جو شخص بیٹھا تھا وہ اس دفتر میں کہیں فٹ نہیں ہوسکتا تھا۔

چالیس بیالیس سالہ خرانٹ صورت وہ شخص میرے نزدیک پہلی نظر میں ہی ناپسندیدہ ٹھہرا تھا۔ تاہم جب وہ بولا تو میرا یہ تاثر کچھ ہلکا ہوگیا۔ اپنی شکل وصورت کے برخلاف اس کی آواز نرم اور شائستہ تھی۔ وہ مجھے جیولس ڈی پیرس میں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

چند رسمی باتوں کے بعد وہ قدرے الجھن زدہ انداز میں بولا۔

''میرا خیال ہے کہ واشنگٹن میں واقع اپنے تمام حریف یا حلیف اسٹورز سے میں بہ خوبی واقف ہوں مگر مجھے افسوس ہے کہ تمہارا نام ان میں کہیں نہیں ہے۔''

اس پر میں نے اسے بتایا کہ واشنگٹن سے میری مراد واشنگٹن شہر نہیں بلکہ ریاست واشنگٹن تھی۔ اس کے بعد خاصی دیر تک ہم امریکا کے جغرافیہ وغیرہ پر گفتگو کرتے رہے۔

''اصل میں' میں اپنا کاروبار بڑھانا چاہتا ہوں۔'' جغرافیہ کے معاملات سے نمٹنے کے بعد جب وہ ذرا سیدھا ہوا تو میں نے کہا ''اس سلسلے میں مجھے نہایت منفرد اور بہترین کھلونوں کی تلاش ہے ایسے کھلونے جن پر بچے ٹوٹ پڑیں۔''

''پھر تو آپ بالکل صحیح جگہ پر آئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا ''آیئے میں آپ کو جیولس ڈی پیرس کے منفرد اور انوکھے کھلونے دکھاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی نشست سے اٹھا اور مجھے ساتھ لے کر بغلی دروازے سے ملحقہ کمرے میں داخل ہوگیا۔

وہ کمرا کیا تھا۔ رنگ برنگے کھلونوں کا ایک جنگل تھا۔ قدآدم شوکیسوں میں عجب عجب قسم کے کھلونے نفاست اور ترتیب سے رکھے تھے۔ میرے ہونٹوں سے بے اختیار ایک پرستائش سیٹی کی آواز نکل گئی۔ جسے سن کر لیسارڈ کا سینہ فخر سے کچھ پھول سا گیا۔ واقعی وہاں جیولس ڈی پیرس کا بہترین ذخیرہ موجود تھا۔

لیسارڈ مجھے ایک ایک کھلونے کی تفصیل بتا رہا

تھا۔ یہ فرانس کے پہلے بادشاہ کا ننھا سا پتلا ہے۔ اس کی ایک ایک شے مکمل تحقیق کے بعد بنائی گئی ہے۔ اس کا لباس اس کے ہتھیار سب کچھ اتنی وضاحت سے تھا کہ مجھے حیرت ہونے لگی۔ میں اس عجائب خانے میں داخل گھنٹوں گزار سکتا تھا مگر مجھے مارتھا کا بھی خیال تھا اور اس کے کام کا بھی۔

وہ مجھے گڑیوں کے حصے کی طرف لے گیا۔

''یہ دیکھیں، یہاں دنیا کی تمام اقوام کی گڑیاں موجود ہیں۔ جاپانی، ہندی، کورین، افریقن۔۔۔اور یہ ملاحظہ فرمائیں امریکی بایونک بوائے یعنی مشینی لڑکا۔ ''یہ وہی ڈیزائن تھا جسے جیولس ڈی پیرس نے مارتھا کی کمپنی سے چوری کرایا تھا۔

''بہت خوب۔'' میں نے متاثر ہوتے ہوئے کہا ''لیکن یہ سب کچھ عام اور بہت پرانا ہے۔ مجھے کچھ نیا دکھاؤ۔ کوئی ایسی چیز جو بالکل نئی ہو۔''

وہ دھیرے سے مسکرایا ''ایسی بھی کئی چیزیں ہیں مگر وہ بہت مہنگی ہیں۔''

اس کا مطلب تھا کہ اس نے مجھے حقیقی خریدار تو تسلیم کرلیا تھا مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی رقم خرچ کرسکتا تھا۔

''چلیں۔۔۔اگلی دفعہ سہی۔۔۔جب میں اپنا پہلا آرڈر دینے آؤں گا تو ان نئی اور مہنگی چیزوں کو بھی دیکھ لوں گا۔'' میں نے اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور ہم دوبارہ اس کے کمرے میں واپس آگئے۔

اپنے کمرے سے اس نے انٹرکام پر کسی سے بات کی اور چند لمحوں کے بعد ہلکی سی دستک کے ساتھ دروازہ کھلا اور وہی خوب صورت استقبالیہ کلرک مجھے وہاں کھڑی نظر آئی۔

میں نے لیسارڈ سے الوداعی مصافحہ کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ لڑکی کی معیت میں چلتے ہوئے میری پوری توجہ اس طرف تھی جس طرف چیف ڈیزائنر کا کمرا آنے والا تھا ہم اس کے دروازے سے ذرا پیچھے تھے کہ اچانک اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر نکل آیا۔ اسے دیکھتے ہی میری رہنمائی کرنے والی لڑکی مودبانہ انداز میں ٹھہر گئی۔

اس نے ایک نگاہ غلط اس پر ڈالی اور دروازہ بند کرکے آگے بڑھ گیا۔ میں نے اس ایک لمحے میں اندر رکھے ایک بڑے آہنی سیف کو دیکھ لیا تھا جس پر لگے تین مختلف ڈائل اس کی اہمیت بتارہے تھے۔

لڑکی جب اپنی جگہ بیٹھ گئی تو میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے شوروم کے لیے نہ صرف نئے کھلونے خریدنا چاہتا ہوں بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی آئٹم خریدنے کا خواہش مند ہوں پیرس سے زیادہ واقف نہ ہونے کے باعث مجھے اس کام میں دشواری پیش آسکتی تھی۔

''اگر ممکن ہوسکے تو جس طرح تم نے مجھے لیسارڈ تک پہنچایا تھا، تھوڑا سا وقت نکال کر اس معاملے میں بھی میری مدد کردو'' میں نے فدویانہ انداز میں کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس نے مجھے دیکھا چند لمحے کچھ سوچا پھر مسکراتی آنکھوں سے رضامندی میں سر ہلادیا۔

میں نے اسے ڈنر پر مدعو کرلیا۔ میں اسے اپنے مقصد کے سلسلے میں احتیاط سے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

ایک طرف میں نے اس لڑکی سے روابط بڑھائے تو دوسری طرف مسٹر لیسارڈ پر بھی کام شروع کردیا۔ میں نے اسے لنچ کی دعوت دی جو اس نے خوشی قبول کرلی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ کاروباری لوگ خریداروں کی ناز برداریاں کرتے ہیں، یہ کیسا احمق امریکی ہے جو خریدار ہوتے ہوئے فروخت کرنے والوں کی خدمت میں مصروف ہے۔

کئی لنچ اور کئی ڈنر کے بعد میں نے ان دونوں کو اچھی طرح پرکھ لیا۔

میری رائے میں لیسارڈ کو خریدا جاسکتا تھا۔ وہ اتنا با اختیار اور باخبر بھی تھا کہ اسے اس نئے ڈیزائن کے بارے میں بھی آگاہی ہوسکتی تھی جو ابھی ڈرائنگ شیٹس پر تکمیل کے مراحل میں تھا لیکن وہ قطعاً ناقابل

اعتبار تھا۔ وہ مجھے بھاری معاوضے پر میری مطلوبہ گڑیا کا ڈیزائن فراہم کرسکتا تھا مگر اس کے ساتھ ہی شاید وہ کمپنی میں اپنے بڑوں کو اس امر سے بھی آگاہ کر دیتا کہ نیا ڈیزائن اب خفیہ نہیں رہا اس طرح وہ کم از کم کمپنی کو ان کی تیاری پر آنے والی لاگت کے نقصان سے بچا سکتا تھا۔ یہ میں نہیں چاہتا تھا کیونکہ انہوں نے مارتھا کی کمپنی سے بایونک بوائے کا خیال چوری کروا کے انہیں خاصا نقصان پہنچایا تھا اور میں بھی انہیں ایسے ہی جھٹکے سے دوچار کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے اپنے مقصد براری کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

مونیکا' وہی خوب صورت خوش ادا' استقبالیہ کلرک وہ بھی میرا گوہر مقصود مجھے فراہم کرسکتی تھی یا کم از کم اس کا ذریعہ بن سکتی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسے دولت کی طلب نہیں تھی۔ وہ کچھ اور چاہتی تھی۔ اس نے ایک پردیسی کو اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا تھا۔ وہ اپنے شہر سے بے زار تھی اور امریکا جانا چاہتی تھی۔ وہ جیولس ڈی پیرس کی نئی گڑیا کے ڈیزائن کے عوض میرا مستقل ساتھ چاہتی تھی جو بھلا میں کیوں کر دے سکتا تھا۔ میں تو خود مارتھا کی خوشنودی کے لیے اس کام پر آمادہ ہوا تھا۔ مونیکا کی خواہش پوری کرنے کا مطلب تھا کہ میں مارتھا سے دست بردار ہوجاؤں۔ اس دست برداری کے بعد گڑیا کے ڈیزائن کی اہمیت ہی ختم ہوجاتی تھی لہٰذا مجھے مونیکا کا خیال بھی دل سے نکالنا پڑا۔

اب مجھے جو کرنا تھا' وہ ان دونوں سے ہٹ کر کرنا تھا۔ یعنی اب بالواسطہ کوشش کی ناکامی' اگر اسے ناکامی کہا جاسکے تو کے بعد براہ راست کارروائی ہی کی جاسکتی تھی لہٰذا میں ایک مرتبہ پھر بارہویں اسٹریٹ کے مخصوص بار پہنچ گیا جہاں میرا بوڑھا دوست شاید میرا ہی منتظر تھا۔

''وہ دونوں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔'' اس نے میری شکل دیکھتے ہوئے پرجوش لہجے میں کہا ''لیسارڈ اور مونیکا دونوں فرانسیسی گدھے ہیں جن پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم اتنے بھی بے خبر نہیں ہو جتنا نظر آتے ہو۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ایک ریٹائرڈ سی آئی اے ایجنٹ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اتنا باخبر ہوسکتا ہے۔

''ایک ایجنٹ ہمیشہ ایجنٹ ہی رہتا ہے۔'' اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا ''اب بولو کیا کرنا ہے؟''

''وہی کرنا ہے جو تم نے پہلے کہا تھا۔'' میں نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور وہ خوش ہوگیا۔

اس کی بیوی کے کزن کا انکل بھی خاصا بوڑھا اور اب ریٹائرمنٹ کے قریب تھا۔ اسے اپنی بیٹی کے کسی مسئلے کے سلسلے میں اچھی خاصی رقم کی ضرورت تھی جس کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ اس کے باوجود جب میرے دوست نے اسے کام کی نوعیت بتائی تو وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔

''یہ تو سراسر غداری ہوگی۔'' اس نے کہا اور میں اپنے دوست کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے بعد ان دونوں میں فرانسیسی بولنے کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ شروع میں بوڑھے چوکیدار کا لہجہ خاصا بلند اور انداز جارحانہ تھا مگر آہستہ آہستہ وہ ٹھنڈا پڑتا نظر آنے لگا۔

''بات بن گئی ہے مگر تمہاری صلاحیتوں کے امتحان میں ایک اور امتحان کا اضافہ ہوگیا ہے۔'' کچھ دیر کی گفتگو کے بعد میرے دوست نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''یہ اس بات پر رضامند ہوا ہے کہ تم وہاں سے کوئی چیز نہ تو اٹھاؤ گے اور نہ ہی اس کے فوٹو وغیرہ کھینچو گے۔''

''تو کیا میں جیولس ڈی پیرس کے دفتر کا دورہ کرنے وہاں جاؤں گا۔'' میں نے قدرے برہمی سے کہا۔

''تم میری بات تو پوری سن لو۔'' اس نے نرمی سے کہا ''تم اپنی مطلوبہ ڈرائنگ یا خاکے وہیں بیٹھ کر دیکھو گے اور ذہن میں محفوظ کرلو گے۔ باہر آکر تم اپنی یادداشت کی مدد سے وہ خاکے دوبارہ بنالینا۔ یہ تمہارا وہ امتحان ہے جو میں کہہ رہا تھا اور میں یہ بھی جانتا

ہوں کہ چیزوں کو دیکھ کر یادداشت میں محفوظ کرنے کی تربیت تمہیں بھی دی گئی ہوگی۔ آخر تم بھی ایک ایجنٹ رہے ہو۔۔۔ایک خفیہ ایجنٹ۔“

ان حالات میں کہ جب آپ کے پاس کوئی راہ باقی نہ ہو‘ یہ بھی غنیمت تھا لہٰذا میں نے ہاں کردی۔ معاملہ طے ہونے کی خوشی میں میرے دوست نے ایک ڈرنک کا آرڈر دیا اور اسے میری کامیابی کے نام کرتے ہوئے غٹاغٹ حلق سے نیچے اتار لیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ تجوری کو کھولا کیسے جائے؟ زور زبردستی کرنے سے میرا مقصد ہی فوت ہوجاتا کیونکہ اس طرح جیوئس ڈی پیرس کے بڑوں کو معلوم ہوجاتا کہ کوئی بلی آکران کے معصوم کبوتر کو اڑا لے جاچکی ہے۔ لہٰذا جو کچھ کرنا تھا اس طرح کرنا تھا کہ واردات کا کوئی سراغ باقی رہنا تو درکنار‘ کسی کو واردات کا شک بھی نہ ہونے پائے۔

اس کے بعد صرف یہی ایک صورت رہ جاتی تھی کہ تجوری کو اس کے کامبی نیشن کے ذریعے کھولا جائے یہ خیال آتے ہی میرے ذہن میں وہ تینوں ڈائل گھوم گئے جو میں جیوئس ڈی پیرس کے چیف ڈیزائنر کے کمرے میں اتفاقاً دیکھ چکا تھا۔ کوئی چارہ نہ دیکھ کر میں نے اسی کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

مجھے اس منحوس تجوری سے نبرد آزما ہوتے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ میرے جسم کے ایک ایک ریشے سے پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا مگر تجوری تھی کہ اس اس کا کوئی سرا ابھی ہاتھ نہیں آپا رہا تھا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری جھنجلاہٹ میں اضافہ ہورہا تھا اوپر سے بڈھے چوکیدار کی مسلسل بڑبڑاہٹ جلتی پر تیل کا کام کررہی تھی۔ وہ ہر پندرہ منٹ بعد میرے پاس آتا اور جلدی۔ اور جلدی کرنے کو کہتا۔

”عجیب آدمی ہو اور کتنی دیر لگاؤ گے وہ تو کہہ رہا تھا کہ تم تجوری کھولنے کے ماہر ہو لیکن تم نے تو ابھی کچھ بھی نہیں کیا۔“ ہر چکر پر وہ اسی قسم کی بک بک کرکے میرا دماغ اور خراب کردیتا ہے۔

تنگ آکر میں نے کہہ دیا کہ وہ اپنی بکواس سمیت وہاں سے مستقل طور پر دفع ہوجائے اور کمرے سے باہر میری کامیابی کی دعا کرے‘ اگر وہ اب اندر آیا تو میں ناکام واپس جانے کو ترجیح دوں گا چاہے اس کے بعد میری بیوی کو کمپنی والے نوکری سے برطرف ہی کیوں نہ کردیں اور وہ مجھے طلاق ہی کیوں نہ دے دے۔

وہ کچھ ناراض ہوا مگر میری ہدایت کے مطابق وہاں سے دفع ہوگیا۔ میں پوری توجہ کے ساتھ تجوری کے کامبی نیشن کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ آج کی ناکامی کے بعد میرے پاس گوہر مقصود کے حصول کی کوئی دوسری راہ نہیں ہوگی۔

میں نے اپنے اندازے کے مطابق دو ڈائل ترتیب دے دیے تھے اور اب تمام تر مہارت اور یادداشت کے ساتھ ساتھ پوری قوت سماعت کو کام میں لاتے ہوئے ڈائل سے کان لگائے اسے گھماتے ہوئے ٹک ٹک کی آواز سننے کی کوشش کررہا تھا۔ اچانک ٹک ٹک ایک خفیف سی ”ٹھک“ میں تبدیل ہوگئی اور میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ میں تجوری کا خفیہ کامبی نیشن اندازے سے دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ میرے پاس صرف آدھے گھنٹے کا وقت تھا۔ اسی میں یعنی مطلوبہ خاکے تلاش کرنے تھے انہیں یادداشت میں محفوظ کرنا تھا اور بخیریت عمارت سے باہر بھی نکلنا تھا۔

میں نے لرزتے ہاتھوں سے تجوری کھولی۔ میری خوش قسمتی کہ میری مطلوبہ فائل سب سے اوپر والی دراز میں علیحدہ سے رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا۔ وہ کل چھ خاکے تھے جن میں گڑیا کی تیاری کے مختلف مراحل کو اجاگر کیا گیا تھا۔ چھٹا خاکہ مکمل اور رنگین تھا۔ میں نے ان سب کا بغور جائزہ لیا اور وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں واپس تجوری میں رکھا۔ تینوں ڈائل بے ترتیب کیے اور عین اسوقت

جب صبح کا اجالا پیرس کے افق پر نمودار ہو رہا تھا میں اس عمارت سے باہر آ گیا۔

ہوٹل پہنچ کر بہت دیر تک میں یہی سوچتا رہا کہ کیا واقعی میں کامیاب ہو گیا ہوں؟ اپنی کامیابی کا یقین کرنے تک مجھ پر نیند کا دباؤ اتنا شدید ہو چکا تھا کہ میں سب کچھ بھول کر گہری نیند سو گیا۔

ایک بھرپور نیند کے بعد جب میں اٹھا تو پوری طرح تروتازہ تھا۔ معدے میں کچھ ہلکی پھلکی چیزیں ڈالنے کے بعد میں ڈرائنگ شیٹس اور پنسل سنبھال کر بیٹھ گیا۔ سب کچھ میرے تجربہ کار ذہن میں محفوظ تھا۔ دو گھنٹے میں، میں وہ تمام خاکے دوبارہ بنانے میں کامیاب ہو گیا اس وقت ان کو بغور دیکھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ خاکہ نمبر ایک اصل میں ایک افریقی دیوی آکوابا کی پرتمکنت اور پرشکوہ تصویر تھی جسے کچھ تبدیلیوں کے بعد بتدریج خاکہ نمبر چھ میں منتقل کیا گیا تھا۔

پراسرار افریقہ جہاں کا جادو بہت مشہور ہے، وہاں کے رنگ برنگے۔۔۔ انداز و اطوار دیگر دنیا سے سراسر نرالے ہیں۔ آکوابا کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ خوش قسمتی اور زرخیزی کی دیوی ہے۔

میں ضعیف الاعتقاد یا جادو ٹونے پر یقین رکھنے والا شخص نہیں ہوں مگر جادو اور پراسراریت سے انکار کرنے سے ان کی عدم موجودگی تو ثابت نہیں ہو جاتی۔ اسے جیوتس ڈی پیرس میں دیکھ کر مجھے سمجھ آ گئی کہ اس کے کرتا دھرتا کیا سوچ کر اسے نئے اور قدرے مختلف انداز میں متعارف کرانا چاہتے تھے۔ میں بھی ایک تجربہ کر لینا چاہتا تھا۔

دو دن بعد میں نے وہ تمام خاکے اپنی پیاری بیوی مارتھا کی ڈیسک پر پھیلا دیے وہ مسرت سے نہال ہو گئی لیکن چونکہ اسے اس گڑیا کے جادو اور اثر و رسوخ کا کچھ علم نہیں تھا اس لیے وہ اتنا خوش نہیں تھی جتنا کہ میں۔ وہ اسے کاروباری لحاظ سے ایک کامیابی سمجھ رہی تھی اور میں اپنی ایک دیرینہ خواہش کو پورا ہوتے دیکھ رہا تھا۔

''یہ صرف خاکے ہیں'' میں نے اسے مخاطب کر کے کہا باقاعدہ ڈیزائن نہیں ہیں اس لیے تم باآسانی انہیں جیوتس ڈی پیرس سے پہلے تیار کر کے فروخت کے لیے پیش کر سکتی ہو۔ اس طرح تمہارا انتقام بھی پورا ہو جائے گا۔''

''بہت شاندار ہے۔'' اس نے ستائش بھرے لہجے میں کہا خوشی کے مارے اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا تھا'' تم نے وہ کر دکھایا ہے جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔'' اس نے والہانہ انداز میں کہا۔

'' تو پھر اس کامیابی کی خوشی میں آج رات شمپین کا دور ہو جائے۔'' میں نے فدویانہ انداز میں گزارش کی۔

اس نے ترچھی نظر سے مجھے دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ میری درخواست رد ہو گئی ہے پھر اچانک اس نے اپنی سیکریٹری کو حکم دیا کہ ڈیزائننگ ڈیپارٹمنٹ والوں کو فوراً بلا دے تاکہ انہیں ان کے نئے کام کے بارے میں آگاہ کیا جا سکے۔

رات آنے سے قبل میں آکوابا کا ایک اور مکمل رنگین خاکہ تیار کر کے اسے فریم کروا چکا تھا جس کے ساتھ میں مارتھا کے اپارٹمنٹ پہنچا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے میری بغل میں دبے فریم کو دیکھ کر کہا۔

''ویسا ہی ایک فریم شدہ خاکہ جیسا میں نے تمہیں دفتر میں دیا تھا۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''اور جو تم نے دوسرے خاکوں کے ساتھ پیرس سے میری محبت میں حاصل کیا تھا۔'' اس نے شوخی سے کہا'' مگر اسے تم یہاں کیوں لائے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں کہ یہ میری تم سے محبت کی یادگار بن کر تمہاری خوابگاہ میں موجود رہے۔'' میں نے کہا'' تم اسے دیکھو تو میں تمہیں یاد آ جاؤں۔''

''ویسے ہی۔۔۔ اصل میں میں چاہتا تھا کہ اگر کسی وجہ سے تمہارے دفتر سے وہ ڈیزائن ادھر ادھر بھی ہو جائے تو کم از کم اس کی ایک کاپی تمہارے پاس تو محفوظ ہو۔''

ادب سے انتخاب

دیویاں

دیوتاؤں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جسے عزیز رکھتے ہیں، اسے دنیا سے جلد اٹھا لیتے ہیں۔ دیویوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ جس کو عزیز رکھتی ہیں، اُسے کہیں کا نہیں رکھتیں۔ خود اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ دیویوں کو عزیز رکھنے کا سودا بُرا نہیں! (رشید احمد صدیقی)

آپ کو......!

لکھنؤ کی ایک صحبت میں جب کہ مرزا وہاں موجود تھے، ایک روز لکھنؤ اور دلّی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہلِ دہلی "اپنے تئیں" بولتے ہیں، وہاں اہلِ لکھنؤ "آپ کو" بولتے ہیں، آپ کی رائے میں فصیح "آپ کو" ہے، یا "اپنے تئیں"؟ مرزا نے کہا، "فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے، جو آپ بولتے ہیں، مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں تو سخت مشکل واقع ہوگی۔ میں تو اپنی نسبت کہوں گا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں!" (مرزا اسد اللہ خاں غالب)

وہ میرے پیش کردہ جواز سے خوش ہوگئی۔

سجی سجائی خواب گاہ اور شیمپین کی نئی بوتل میری منتظر تھی۔ پینے پلانے سے پہلے میں نے ساتھ لائے ہوئے خاکے کو احتیاط سے مسہری کے سرہانے۔۔۔ والی دیوار پر احتیاط سے لگا دیا۔

مارتھا کی آنکھیں خواب آلود ہوتی چلی گئیں۔

اس رات اس کے والہانہ انداز نے مجھے نئی نئی دنیاؤں کی سیر کرائی۔ شاید اس پر کامیابی کا نشہ سوار تھا جو اسے بے خود کیے دے رہا تھا۔

☆☆☆

وہ گڑیا اب بازار میں برائے فروخت دستیاب ہے لہٰذا ضروری ہے کہ آبادی میں اضافے کے شرح کا باریکی سے جائزہ لے کر اس پر گہری نظر رکھی جائے۔

آکوابا خوش قسمتی کی دیوی ہے اور افریقہ میں خوش قسمتی اولاد کو کہتے ہیں وہاں جن کے زیادہ اولاد ہو وہی والدین خوش قسمت کہلاتے ہیں اس لیے ہر گھر میں آکوابا کی مورتی کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی ہے اور یاد رہے کہ وہاں بارہ تیرہ بچے بالکل عام سی بات ہے۔

میں نے جب مارتھا کی مسہری کے سرہانے آکوابا کی تصویر لگائی تھی تو میری صرف اتنی خواہش تھی کہ وہ پھر سے ہم درد، غم گسار اور محبت کرنے والی حقیقی بیوی بن جائے اور میں سمجھتا تھا کہ ماں بن کر وہ خود بہ خود ایسی بیوی بھی بن جائے گی۔

مجھے تو کامیابی ہوگئی۔ اب میرے گھر میں تین بچوں کی قلقاریاں گونجتی ہیں اور مارتھا کا زیادہ وقت ہم چاروں کے ساتھ گزرتا ہے۔ ملازمت وہ اب بھی کرتی ہے اور اولاد والی ہونے کے باعث اس کے شیئر ہولڈرز کو اس پر خاصا اعتماد ہوگیا ہے مگر اب اس کی ملازمت ذرا حساب کتاب کے ساتھ جاری ہے۔

لہٰذا اگر آپ امریکا میں ہیں تو اپنے بچوں کو کوآرڈی نیٹ ٹوائے کمپنی کی نئی گڑیا دلانے سے پہلے آبادی میں اضافے کی شرح پر ضرور غور کرلیجیے گا۔

☆☆

اے ارضِ وطن

ساحل علی

موت برحق ہے اس سے کسی طور مفر نہیں جس نے ایک دن آنا ہے اس نے کسی نہ کسی دن جانا بھی ہے لیکن اس آنے جانے میں بڑا فرق ہے ایک وہ جو آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں پتا نہیں چلتا کہ آئے کب تھے گئے کب ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو جا کر بھی نہیں جاتے ان کی یاد کی خوشبو ہر گھڑی مشام جاں کو تروتازہ رکھتی ہے یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ارض وطن

وطن کے لیے جان قربان کرنے والوں کی ایک دل کدار تحریر

بالاکوٹ اور مُلحقہ علاقوں میں شدید زلزلے کے باعث فوج کی امدادی ٹیمیں ترتیب دی جا رہی تھیں، کیپٹن عاصم کو بھی تیار ہونے کی ہدایت مل چکی تھی۔

" آپ کو ایک گھنٹے میں تیار ہونا ہے، گاڑی آپ کو لینے آ جائے گی "

عاصم آدھے گھنٹے میں تیار ہو گیا، اور اب بالکونی میں کھڑا دُور اُفق کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں اندھیرا سُورج کو تقریباً" نِگل چُکا تھا۔

عاصم ایک جواں سال کیپٹن تھا، اُس کے سُرخ وسپید چہرے پر چڑھی ہوئی مونچھیں اُس کے رُعب میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ عاصم نے سِگار سُلگایا اور ہوا میں دُھواں چھوڑتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا " بالاکوٹ "۔

لفظ کیا تھا جادو تھا جس نے " کُھل جا سِم سِم " کا ہی کام کیا اور ماضی کا دریچہ وا کر دیا۔

" عاصم عاصم اپنا نام آ گیا یار "

انٹر کے امتحانات کے بعد اُس نے ایسے ہی شوق شوق میں اور اپنے دوستوں کے اصرار پر فوج میں اپلائی کر دیا تھا، ٹیسٹ وغیرہ ہونے کے بعد جب آئی ایس ایس بی ہوا تو بھی یہ شوق برقرار رہا، لیکن جب اس کے دوست شہریار نے اُس کے سلیکشن کی نوید سُنائی تو وہ گھبرا گیا، وہ ایک لا اُبالی نوجوان تھا جیسے اس عمر میں سب ہوتے ہیں، فوج کی سختیاں اور پابندیاں سوچ سوچ کر وہ پریشان ہو گیا اور اُس نے اپنے ابو کو یہ سوچ کر بتایا کہ شاید ابو اُسے جانے سے روک لیں گے،

مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کے ابو نے یہ خبر سُنی تو اُن کی آنکھیں فرطِ مسرت اور جذبات سے بھر آئیں اُنہوں نے کہا، " چلا جا عاصم، اِس مٹی کا قرض ہے ہم پر، وہ اِسی بہانے اُتر جائے گا"۔

عاصم پر اس کا بھی کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور ہوتا بھی کیسے، اس عمر میں انسان آزادی اور مستی چاہتا ہے، اُسے حُب الوطنی کی منطق سمجھ نہیں آتی تھی، خیر چاروناچار رختِ سفر باندھا اور اپنے اُن دوستوں کے ساتھ چل پڑا جن جن کے بُلاوے آئے تھے۔

اب وہ عمارت کے سامنے کھڑا تھا، برف پوش زمین کے سینے پر فخر سے سینے تانے کھڑی کاکول

اکیڈمی کی عمارت اپنے اندر صدہا جیج اور بہادر سپاہیوں کی داستان شوق سمیٹے نظر آرہی تھی۔
ٹریننگ شروع ہوئی، شب و روز گزرتے رہے،
عاصم بڑی بے دلی سے ٹریننگ میں حصہ لیتا رہا،
دن پر دن گزرتے رہے بے کیف دن، اور
پھر اچانک اُس کی بے رونق زندگی میں بہار آگئی،
رخشندہ۔۔۔ ایوب میڈیکل کالج کی وہ لڑکی جس پر عاصم اپنا دل ہار بیٹھا تھا،
ویکلی پاسنگ آوٹ میں جب وہ اکیڈمی سے باہر نکلتا وہ اُس کا دیدار ہو جاتا،
پھر بات ہوئی،
دوستی ہوئی،
اور محبت کے عہد و پیماں،
رخشندہ بالاکوٹ کی رہنے والی تھی اور ایبٹ آباد میں ایوب میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں رہتی تھی،

عاصم کے لئے اب زندگی بس رخشندہ سے شروع ہوتی اور اُسی پر ختم ہوتی تھی،
ایک دن رخشندہ نے عاصم سے کہا، "عاصم بابا کل آرہے ہیں، میں اس بار اُن سے ہماری بات کروں گی"۔
"سچ رخشی! کیا وہ مان جائیں گے؟"، عاصم نے بے چینی سے پوچھا
(عاصم رخشندہ کو پیار سے رخشی کہا کرتا تھا)
"وہ ضرور مان جائیں گے، میں اُن کی اکلوتی بیٹی ہوں"
رخشندہ کے پُر اعتماد چہرے کو عاصم پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا اور وہ شرما گئی۔
اور اگلے ہفتے رخشندہ نے عاصم کو بتایا کہ اُس کے بابا عاصم سے ملنا چاہتے ہیں۔
ٹرن ٹرن۔



اچانک کال بیل کی آواز نے عاصم کو ماضی کی دُنیا سے باہر کھینچ لیا۔

اُس نے گھڑی دیکھی، ایک گھنٹہ پورا ہو چکا تھا، وہ نیچے گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔

گاڑی ہیڈ کوارٹر کی طرف رواں دواں تھی جہاں سے اُنہیں ہیلی کاپٹر کے ذریعے متاثرہ علاقے میں جانا تھا۔

عاصم عجیب بے چینی محسوس کر رہا تھا، "ماضی" جان لیوا ماضی، جو کہیں انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

سوچتے سوچ کے گھوڑے پھر ماضی کی وادیوں میں جا پہنچے اور سلسلہ وہیں سے جڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں عاصم رخشندہ کے بابا کے سامنے بیٹھا تھا۔

خان زمان ایک ادھیڑ عمر کا قد آور اور بھاری بھرکم آدمی تھا۔

خان زمان کچھ دیر تک عاصم کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا، عاصم سر جھکائے بیٹھا تھا۔

آخر خان زمان نے خاموشی کا سحر توڑتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا، "تمہارا نام عاصم ہے؟"

"جی سر"، عاصم نے مختصر جواب دیا

" دیکھو عاصم میں سیدھی اور صاف بات کرنے والا آدمی ہوں، مجھے تم دونوں کے رشتے سے کوئی اعتراض نہیں ہے

نہ ہی میں ذات برادری کے فرق پہ یقین رکھتا ہوں، مجھے اپنی بیٹی کی خوشی عزیز ہے۔۔ مگر۔۔" یہ کہہ کر خان زمان کچھ ثانیے کے لئے رُکا۔

عاصم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔۔۔ اُسے خان زمان کی خاموشی کھل رہی تھی۔

" مگر مجھے اپنی بیٹی کا مستقبل بھی اُتنا ہی عزیز ہے" خان عاصم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

" تم اگر رخشندہ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو تمہیں میری ایک شرط ماننی ہو گی"۔

"شرط"، عاصم نے حیرت سے دُہرایا

" ہاں میں اِسے شرط ہی کہوں گا"، خان زمان نے کہا

" دیکھیں اگر آپ اُونچ نیچ کی بات۔۔۔"

" نہیں۔۔ میں کوئی اُونچ نیچ کی بات نہیں کر رہا"، خان زمان نے عاصم کی بات کاٹتے ہوئے کہا

"تو پھر"، عاسم نے سوالیہ انداز میں کہا

" تمہیں فوج چھوڑنی پڑے گی"، خان زمان نے صاف لفظوں میں اپنی شرط بیان کر دی۔

"فوج میں زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، اور میں اپنی بیٹی کو بیوہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا"

"بس اتنی سی بات؟"، عاصم نے کہا، "میں فوج چھوڑ دوں گا کیونکہ میں تو شوق شوق میں ٹریننگ پہ آ گیا ہوں ورنہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے"

" تمہیں یقین ہے کہ تم ایسا کر لو گے"، خان زمان نے سوالیہ انداز میں کہا

"بالکل کر لوں گا سر، میرے ابو کے دوست ہیں کرنل بخاری، وہ ہمارے آفیسر بھی ہیں اور مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، میں اُن کو کہہ کر فوج چھوڑ دوں گا" عاصم نے یقین سے کہا

"بس تو اگر تم نے ایسا کر لیا تو تم جب کہو گے میں تمہارے والدین سے مل کر رشتہ طے کر لوں گا"، خان زمان نے کہا

رخشندہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی یہ ساری گفتگو سن رہی تھی، اور خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی، اُسے اُمید نہیں تھی کہ سب کچھ اتنی آسانی اور خوش اسلوبی سے طے ہو جائے گا۔

" ٹھیک ہے سر، میں اگلے ہفتے آؤں گا اور یہ خبر لیکر آؤں گا کہ میں نے فوج چھوڑ دی ہے"، یہ کہہ کر عاصم اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔

خان زمان نے کوئی جواب نہ دیا، عاصم باہر جانے لگا تو اُس کی نظر رخشندہ پر پڑی جو اُسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی، اُس کی آنکھوں میں ستارے

ک رہے تھے، روشن مستقبل کے ستارے جس مستقبل میں وہ اور عاصم ایک ساتھ ہوں گے،

ہاہا" عاصم بھی مسکرایا اور چلا گیا

عاصم کے جانے کے بعد رخشندہ ڈرائنگ میں آئی تو اپنے بابا کو گھمبیر سوچ میں ڈوبا ہوا پایا،

اُس نے پیچھے سے جا کر بابا کی گردن میں پیار سے اپنے بازو ڈال دیے اور پوچھا، " عاصم آپ کو کیسا لگا بابا؟"

" ہوں۔۔۔ ہاں بہت اچھا لڑکا ہے "، خان زمان نے چونکتے ہوئے کہا، " اور تمہیں بہت چاہتا بھی ہے، وہ فوج چھوڑ دے گا شاید"

" شاید کیوں بابا؟، وہ یقیناً چھوڑ دے گا، اس نے زبان دی ہے "، " آپ کو اس کی بات پر شک کیوں ہے "، رخشندہ نے بے چین ہو کر پوچھا

خان زمان نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بیٹی کو دیکھا اور عجیب لہجے میں کہا، " رخشندہ تم ابھی بچی ہو، وطن کی محبت سبھی محبتوں پر بھاری ہوتی ہے، جب وہ انسان کے دل میں جاگ جاتی ہے تو انسان اپنے کسی رشتے کو خاطر میں نہیں لاتا، اُس کے نزدیک سب کچھ اپنی دھرتی ہوتی ہے"

" ایسا کچھ نہیں ہوگا بابا، عاصم اپنی بات ضرور پوری کرے گا"، رخشندہ نے پُر یقین لہجے میں کہا

" خُدا کرے ایسا ہی ہو"، خان زمان نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اگلے دو دن تک عاصم کسی مناسب موقع کی تلاش میں لگا رہا مگر اُسے کرنل بخاری سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا یا شاید وہ ہمت نہیں جٹا پا رہا تھا خیر تیسرے دن عاصم نے کرنل بخاری کو ان کے آفس میں اکیلے پایا تو جی کڑا کے کہہ ہی دیا،

" سر مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے "، عاصم نے ڈرتے ڈرتے کہا

" ہاں کہو عاصم کیا بات ہے؟"، کرنل بخاری نے فائل سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا

" سر وہ میں ٹریننگ چھوڑ کے جانا چاہتا ہوں"، عاصم نے اپنا مدعا صاف لفظوں میں بیان کر دیا

" کیوں؟، کیا وجہ ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے "، کرنل بخاری نے فائل نیچے رکھتے ہوئے عاصم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا

" بس سر یہ میرے مزاج کی جاب نہیں ہے اور ویسے بھی میں صرف اپنے شوق کی خاطر یہاں چلا آیا تھا"، عاصم کرنل بخاری کی تیز نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے سر جھکاتے ہوئے بولا

کرنل بخاری کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے عاصم کے سامنے کھڑے ہو گئے

" جاب؟، شوق؟، یہ کس طرح کی باتیں کر رہا ہے عاصم؟

فوج کوئی جاب نہیں نہ ہی شوق کی کوئی چیز ہے، یہ تو وہ اعزاز ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا، مخصوص لوگ ہوتے ہیں جنہیں تقدیر چنتی ہے، ہر فوجی انسان ہوتا ہے لیکن ہر انسان فوجی نہیں ہوتا، سپاہی ہونا اپنے آپ میں فخر کی بات ہے "، کرنل بخاری نے سمجھاتے ہوئے کہا

" ہوتا ہوگا سر مگر مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے "، عاصم نے لاپروائی سے کہا

" افسوس، اگر تیرے ابو تیرے یہ الفاظ سن لیتے تو اُنہیں کتنا صدمہ پہنچتا "، کرنل بخاری متاسفانہ انداز میں ہاتھ ملنے لگے

" جانتا ہے عاصم، وہ خود ایک سپاہی بننا چاہتے تھے مگر نہیں بن سکے، جب تو سلیکٹ ہوا تو اُنھوں نے مجھے فون کر کے کیا کہا، جانتا ہے کیا کہا؟"،

" انہوں نے کہا بخاری جو خواب میں نے دیکھا اور جو کام میں نہیں کر پایا اُنہیں پورا کرنے کے لیے میرا بیٹا آ رہا ہے، کتنی خوشی اور کتنا فخر تھا اُن

کے لہجے میں۔۔۔اور تُو جانے کی بات کرتا ہے"،
کرنل بخاری کے لہجے سے حسرت ٹپکنے لگی،

عاصم کو جھٹکا لگا، اُسے نہیں پتا تھا کہ اُس کے ابو اُس سے اتنی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں،

" فوج میں زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے سر"، عاصم نے خان زمان کے الفاظ دُہرا دیے،

" کیا کہا تُو نے؟ تُو موت سے ڈرتا ہے ؟۔۔ایک مسلمان ہو کر، اس پاک سرزمین کا بیٹا ہو کر تُو موت سے ڈرتا ہے

وہ اجداد جنہوں نے اس مُلک کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، جو وطن کی ناموس کے لئے بم باندھ کر ٹینکوں کے نیچے لیٹ گئے، اُن کا وارث ہو کر تُو موت سے ڈرتا ہے، حیف ہے تجھ پر"، کرنل بخاری نے غصے اور حقارت سے عاصم کو دیکھتے ہوتے کہا،

عاصم سر جھکائے کھڑا تھا اور کرنل بخاری خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگے،

ایک لحظہ رُک کر اُنہوں نے پھر اپنی بات شروع کی،

" جان تو جانی ہے، سب مر جاتے ہیں مگر جو وطن کی حفاظت کرتے ہوئے مرتے ہیں وہ شہید کہلاتے ہیں، جانتا ہے وہ موت کیسی ہوتی ہے؟،

" یہ وہ موت ہوتی ہے جس پر خود موت بھی رشک کرتی ہے،

" جانتا ہے آخری جنگ میں جب میرے دونوں بیٹے شہید ہو گئے تو میرے لئے سب سے مشکل مرحلہ اپنی بیوی کو اُن کی شہادت کی خبر دینے کا تھا،

میں نے جب ایک ماں کو اُس کے دونوں بیٹوں کی شہادت کی خبر دی تو جانتا ہے اُس ماں نے کیا کہا؟"،

"سُن ،اُس نے کہا،" بخاری غم کیوں کرتے ہو، میرے دو ہی بیٹے تھے کاش دس ہوتے تو وہ بھی میں اپنے وطن کی ناموس پر قربان کر دیتی، مجھے اپنے بچوں پر فخر ہے کہ اُن کی وجہ سے میں شہید کی ماں کہلاؤں گی"

عاصم کو دوسرا جھٹکا لگا۔۔۔

کرنل بخاری نے جذباتی لہجے میں اپنی بات جاری رکھی، "ایسی مائیں ہیں جبھی تم لوگ محفوظ ہو، ہم دُشمنوں کی گولیاں اپنے سینوں پر کھاتے ہیں مگر عام شہری تک اُس کی میلی نگاہ تک نہیں آنے دیتے"، کرنل بخاری کا چہرہ جذبات کی زیادتی سے سُرخ ہو گیا، اُنہوں نے مٹھیاں بھینچ کر کہا،" تُو جانا چاہتا ہے نا تو چلا جا، تیری ضرورت نہیں ہے، تاریخ شاہد ہے کہ میری دھرتی نے ہمیشہ بہادر پیدا کیے ہیں۔ بنجر نہیں ہے یہ زمین نہ اس میں بزدل پیدا ہوئے ہیں۔"

یہ وہ دھرتی ہے جہاں راجا عزیز بھٹی، ایم ایم عالم اور راشد منہاس جیسے جری بیٹے جنمے ہیں، جن کے قدموں کی آہٹ سے دُشمن کے پیروں کی زمین ہلنے لگتی تھی،

میں اور مجھ جیسے کئی اس مٹی کے بیٹے تیری بھی حفاظت کر لیں گے جس طرح پورے مُلک کی کر رہے ہیں"۔

یہ کہہ کر کرنل بخاری کمرے سے باہر چلے گئے
عاصم کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں
عجیب حالت تھی، پتا نہیں کیسے وہ اپنے روم تک آیا اور بستر پر گر کر زارو قطار رونے لگا۔
اس کا دِل و دماغ اُس کے قابو میں نہیں تھے
وہ ساری رات جاگتا رہا،

ساری رات اُس کے دماغ میں صرف دو جُملے گونجتے رہے،

ایک اُس کے ابو کا،" چلا جا عاصم، اِس مٹی کا قرض ہے ہم پر، وہ اِسی بہانے اُتر جائے گا"۔

دُوسرا کرنل بخاری کا،" چلا جا عاصم ۔۔میری دھرتی نے ہمیشہ بہادر پیدا کیے ہیں"۔

اور صبح کا سورج جب اپنی کرنیں پھیلاتے ہوئے نکلا تو وہ عاصم کی زندگی کی نئی صبح تھی،

وہ ہمیشہ کی طرح تیار ہو کر گراؤنڈ میں آیا۔

اپنے روز کے معمولات کے بعد وہ کرنل بخاری کی طرف چل پڑا، کرنل بخاری راستے میں ہی مل گئے
عاصم نے کرنل بخاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، "سر آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ اس دھرتی نے صرف بہادر پیدا کیے ہیں۔۔ اور میں بھی اسی دھرتی کا بیٹا ہوں" عاصم کی آنکھوں اور لہجے میں چٹانوں کی سی مضبوطی تھی۔
کرنل بخاری نے عاصم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شفقت بھرے لہجے میں کہا، "ہاں عاصم تو اِسی دھرتی کا بیٹا ہے"

☆☆☆

گاڑی رُکنے کے جھٹکے نے عاصم کو پھر بے دار کر دیا۔
"ہیلو کیپٹن"
ایک مانوس سی آواز عاصم کی سماعتوں سے ٹکرائی
"ارے شہریار تم"، عاصم خوشی سے اُچھل پڑا کیونکہ اُس کے سامنے اس کا جگری دوست شہریار کھڑا تھا،
"ہاں جگر، کیپٹن شہریار"، دونوں بڑی گرم جوشی سے گلے ملے
شہریار اور عاصم ٹریننگ میں بھی ساتھ تھے اور شہریار عاصم کا ہم راز بھی تھا اس لئے رخشندہ اور عاصم کے معاملے سے بھی واقف تھا،
"یار عاصم اتنے مہینوں بعد تمہیں دیکھ کر اتنا اچھا لگ رہا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا"، شہریار نے کہا
"تمہیں دیکھ کر میری بھی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں"، عاصم واقعی خوش تھا،
"عاصم شادی کی یا اب تک کنوارے ہو؟"، شہریار نے پوچھا
"نہیں یار ابھی کہاں۔۔ بہت زندگی پڑی ہے" عاصم نے لاپروائی سے جواب دیا

"تم اب تک رخشندہ کو نہیں بھولے؟"، شہریار نے عاصم کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا
"ایسی کوئی بات نہیں شہریار۔۔ وہ سب ماضی کا حصّہ بن چکا ہے"، عاصم نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا
'اور جسے آدمی چاہتا ہے اُسے بھولتا نہیں ہے"
"تمہیں لگتا ہے کہ اُس وقت تمہارا فیصلہ صحیح تھا؟"، شہریار نے پوچھا
"ہاں۔۔ میرا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔۔ اور مجھے اپنے فیصلے پر کوئی ندامت نہیں بلکہ فخر ہے"، عاصم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔
پھر وہ ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گئے،
ہیلی کاپٹر کے شور کی وجہ سے وہ باتیں جاری نہ رکھ سکے۔
عاصم ہیلی کاپٹر کی کھڑکی سے باہر خلاؤں میں جھانکنے لگا
ہیلی کاپٹر کے شور سے کہیں زیادہ اُس کے ذہن میں شور بر پا تھا، قیامت جیسا شور
اور اِسی شور میں وہ اُس فیصلے کو یاد کرنے لگا جس کا ذکر شہریار کر رہا تھا۔
"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے عاصم"، خان زمان نے عاصم کو گھورتے ہوئے پوچھا
"جی سر۔۔ یہ مٹی میری ماں ہے اور میں اپنی ماں کو کسی کے لئے نہیں چھوڑ سکتا"، عاصم نے جوب دیا
"یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے بعد تم رخشندہ کو ہمیشہ کے لئے کھو دو گے" خان زمان نے پوچھا
"جی" عاصم نے مختصر جواب دیا۔
"ہوں۔۔ رخشندہ کو تم پر بہت بھروسا تھا کہ تم اس کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہو"، خان زمان نے تیز لہجے میں کہا
"مجھے افسوس ہے کہ میں اُس کی اُمیدوں پر

پورا نہیں اُتر پایا، مگر اُسے کبھی یہ افسوس نہیں ہو گا کہ اُس نے کسی غلط آدمی کا انتخاب کیا تھا۔۔۔ جو شخص اپنے وطن سے مُنہ موڑ لے وہ کبھی کسی کے ساتھ بھی وفادار نہیں رہ سکتا" عاصم نے پُر اعتماد لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میری مٹی کو میری ضرورت ہو، میرا فرض مجھے پُکار رہا ہو اور میں کسی کے رنگین آنچل میں مُنہ چھپا کر اُس پُکار کو نظر انداز کر دوں؟ یہ نہیں ہو سکتا"

"رخشندہ کو کھونے کا غم مجھے مرتے دم تک رہے گا، لیکن میدان چھوڑ کر بھاگنے کی شرمندگی تو نہیں ہو گی۔۔۔ میں اپنے خدا کو تو مُنہ دِکھا سکوں گا"

"ٹھیک ہے تم اب جا سکتے ہو"، خان زمان نے سرد لہجے میں کہا

اتنے میں رخشندہ کمرے میں آئی، وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ساری باتیں سنتی رہی تھی

"عاصم خُدا کے لئے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لو... مُلک کی حفاظت کے لیے اور بھی بہت لوگ ہیں، تم ہماری زندگی کیوں برباد کر رہے ہو"، رخشندہ نے رقت بھرے لہجے میں عاصم سے درخواست کی،

"اگر سب یہی سوچیں گے رخشی تو پھر سرحدوں پر کوئی نہیں رہے گا۔ جو لوگ آج اس وطن کی حفاظت کر رہے ہیں، تُمہاری، میری، اس پوری قوم کی حفاظت کرنے والوں کے بھی بیوی بچے ہیں مگر اُن کے لئے سب سے پہلے اپنی دھرتی ہے" عاصم ٹس سے مس ہونے کے لئے تیار نہیں تھا،

یہ دیکھ کر رخشندہ خان زمان کی طرف مُڑی اور روتے ہو کہنے لگی، "بابا آپ اپنی ضد کیوں نہیں چھوڑ دیتے.. زندگی اور موت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، کبھی کبھار فوجی لمبی عُمر پاتے ہیں اور عام شہری جلدی مر جاتے ہیں"،

"بس۔۔"، خان زمان نے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا، "میں اُس کبھی کبھار کا خطرہ نہیں مول لے سکتا"،

"لڑکے تُم جا سکتے ہو"، خان زمان نے عاصم کی طرف اشارہ کر کے کہا

☆☆☆

ہیلی کاپٹر کے ذریعے وہ بالاکوٹ پُہنچ گئے،

بالاکوٹ میں قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا، ہر طرف تباہی اور بربادی کا راج تھا،

عمارتیں ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی تھیں اور اُن کے نیچے جانے کتنے لوگ شہید ہو چکے تھے اور کتنے زخمی امداد کے منتظر تھے،

پُورا مُلک سوگ میں ڈوبا ہوا تھا، ان بے بس لوگوں کا درد مُلک کا بچہ بچہ محسوس کر رہا تھا،

پاک فوج کے جوان جانفشانی سے امدادی کاموں میں حصّہ لے رہے تھے، اور کئی لاشیں اور زخمی ملبے سے نکالے جا چکے تھے۔۔

عاصم ساری رات امدادی کاموں میں لگا رہا، کئی لوگوں کو ملبے تلے نکالنے میں اپنے لوگوں کا ہاتھ بٹاتا رہا،

اور صبح دم اپنے خیمے میں کچھ دیر سستانے کی غرض سے آیا،

"سر ایک بوڑھا آدمی اور اُس کی بیٹی آپ سے ملنا چاہتے ہیں"، ایک سپاہی نے خیمے میں داخل ہو کر کہا

"کون لوگ ہیں؟ اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"، عاصم نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا

"سر کل آپ ہی نے اُنہیں ملبے سے نکالا تھا، وہ آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں"، سپاہی نے وضاحت کی

"اوہ! اُن سے کہو اس کی کوئی ضرورت نہیں، وہ لوگ آرام کریں"، عاصم نے کہا

"مل لیں سر، وہ لوگ بہت ضد کر رہے ہیں، کہہ رہے ہیں کہ اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنا ہے"، سپاہی نے سفارشانہ انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا

" باپ بیٹی ہیں، داماد عمارت میں دب کر شہید ہوگیا، یہاں کے معززین میں سے ہیں، بے چاروں کا سب کچھ زلزلے کی نذر ہوگیا"

" اچھا بھیج دو"، عاصم نے بالآخر اجازت اسے دی

اور سپاہی باہر چلا گیا

عاصم سر جھکائے اپنے جوتے کے تسمے کھولنے لگا، اچانک اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں

" السلام علیکم بیٹا، ہم تمہارا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں"، ایک نحیف سی آواز اُس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔۔۔

عاصم کو جیسے بجلی کا جھٹکا سا لگا، اُس نے سر اُٹھایا اور اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سامنے۔۔

سامنے خان زمان اور رخشندہ کھڑے تھے

رخشندہ۔۔ اس کی رخشی ۔۔۔ اس کی محبت۔۔

مگر اتنی سوگوار۔۔ اتنی مجبور۔۔

عاصم کا دل کٹ کر رہ گیا

رخشندہ عاصم کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی

خان زمان بھی عاصم کو سامنے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا

کئی لمحوں تک کسی کے مُنہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا

پھر اچانک رخشندہ نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا،

ہذیانی ہنسی۔۔ اُس نے خان زمان کے بازو کو پکڑ کر زور زور سے ہلاتے ہوئے چیخ کر کہا

" دیکھا بابا۔۔ آپ نے دیکھا ؟۔۔ جس فوجی سے آپ نے میری شادی صرف اس لیے نہیں ہونے دی کہ میں بیوہ ہو جاؤنگی وہ فوجی آج بھی زندہ کھڑا ہے"

" بلکہ اُسی کی وجہ سے میں اور آپ بھی زندہ کھڑے ہیں، اور جس عام شہری سے آپ نے میرا نصیب جوڑا وہ شہید ہوگیا۔۔۔"

" میں بیوہ ہوگئی بابا، فوجی کی بیوہ نہ ہونے کے باوجود بھی بیوہ ہوگئی"

عاصم پر جیسے سکتہ طاری تھا۔

خان زمان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

" بابا، باپ اپنی بیٹی کو اچھی تعلیم، اچھی تربیت اور اچھی زندگی تو دے سکتا ہے لیکن اچھا نصیب دینا اُس کے بس میں نہیں، کسی انسان کے بس میں نہیں۔۔ وہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔۔ مجھے اگر بیوہ ہونا تھا تو میں ہوگئی چاہے میرا شوہر فوجی ہو یا عام شہری۔۔۔

اللہ کے معاملات میں دخل دینے والے آپ کون ہوتے ہیں۔۔۔

بولیے۔۔

بولیے۔۔۔

اور بولیے بولیے کی گردان کرتے ہوئے رخشندہ چکرا کر بے ہوش ہوگئی۔۔ اگر عاصم آگے بڑھ کر اُسے سنبھال نہ لیتا تو وہ زمین پر گر گئی ہوتی۔۔

خان زمان کا سر مارے شرم کے جھکا ہوا تھا۔۔

اور تقدیر اپنے کھیل کے اختتام پر سر اُٹھائے ہنس رہی تھی۔

☆☆

مقدر کا سکندر

شگفتہ پروین

سراغ رسانی کے موضوع پر آپ نے بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی لیکن زیر نظر کہانی تمام کہانیوں سے ہٹ کر ہے۔ ایک اچھوتی اور دلچسپ تحریر۔ ایک ایسے سراغ رساں کی کہانی جس میں سراغ رسانی کا سادہ بچپن ہی سے کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

اس کہانی کو پڑھ کر آپ قہقہ لگانے پر مجبور ہوجائیں گے

سکندر اعظم نے بالآخر اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے دیا۔ اس نے شہر کے ایک متوسط درجے کے کاروباری اور رہائشی علاقے میں ایک دکان کرائے پر لے کر اس میں اپنا دفتر قائم کرلیا۔ دکان کے اوپر ایک بڑا سا بورڈ لگوایا جس پر نمایاں حروف میں لکھا تھا۔

پرائیویٹ سراغ رساں۔ سکندر اعظم

دکان کے داخلی دروازے پر انگریزی میں لفظ پرائیویٹ جلی حروف میں لکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے ڈراؤنی حد تک لمبی پلکوں والی ایک نسوانی آنکھ جو نسوانی کم اور حیوانی زیادہ معلوم ہوتی تھی، بنائی گئی تھی۔ اس مصوری کے پیچھے یہ فلسفہ تھا کہ سراغ رسانی پر مبنی انگریزی فلموں اور ڈراما سیریلز میں پرائیویٹ سراغ رسانوں کو چونکہ "پرائیویٹ آئی" کہا جاتا تھا اس لیے لفظ پرائیویٹ لکھ کر نیچے آنکھ بنادی گئی تھی۔

دفتر کو ہارڈ بورڈ کی دیواروں کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ بیرونی حصہ دفتر عام تھا اور اندرونی حصہ دفتر خاص۔ دفتر عام کو ایک چھوٹی سی سیکنڈ ہینڈ میز، سیکنڈ ہینڈ ٹائپ رائٹر، کچھ اسی قسم کی سیکریٹری جس کا نام مس روزی تھا اور چار کرسیوں سے سجایا گیا تھا۔

دفتر خاص میں جناب سکندر اعظم۔ سراغ رساں عظیم۔۔۔ بہ نفس نفیس تشریف فرما ہوتے تھے۔ اس حصے میں دو عام کرسیاں، ایک میز، ایک فائلوں کی کیبنٹ اور ایک ریوالونگ چیئر موجود تھی۔ اس کرسی کی "ریوالونگ" سے اتنی آواز پیدا ہوتی تھی جتنی گولیاں اگلتے ہوئے کسی ریوالور سے پیدا ہونی ممکن نہیں تھی۔

سکندر اعظم کا نام اس کے والدین نے سکندر علی رکھا تھا۔ اس نے جیسے تیسے بی۔اے پاس کرنے کے بعد کئی ماہ تک بے شمار دفتروں کے چکر لگانے اور شہر کی سڑکوں پر جوتیاں چٹخانے کے بعد بالآخر اپنے اس خواب کو تکمیل دینے کا فیصلہ کرلیا جو وہ بچپن سے دیکھتا چلا آرہا تھا۔ پرائیویٹ سراغ رساں بننے کا خواب!

تجسس اور سراغ رسانی کا مادہ اس میں کوٹ



لٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسے بچپن ہی میں اپنی اس صلاحیت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اماں اپنی احتیاط پسندی کے سبب گھر میں جگہیں بدل بدل کر پیسے رکھا کرتی تھی اور اکثر اوقات وہ جگہ بھول جاتی تھیں جہاں انہوں نے آخری بار پیسے رکھے ہوتے تھے۔ لیکن سکندر کو اپنی کھوجی طبیعت کے سبب ان تمام جگہوں کا علم تھا جہاں جہاں پیسے پائے جانے کا امکان ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ ذرا ہی دیر میں پیسے برآمد کر کے لاتا اور روتی، واویلا کرتی اماں کے سامنے لا کر رکھ دیتا جو رو رو کے بیان کر رہی ہوتیں کہ "ہائے۔۔۔! آج تو میرے سارے پیسے کوئی نکال کے لے گیا۔ میرے خدا! اب میں کیا کروں!"

پیسے دیکھ کر اماں کے رونے کو بریک لگ جاتا۔ وہ جلدی سے پیسے اٹھا لیتیں اور "جیتا رہ میرا بچہ" کہہ کر اسے گلے لگا لیتیں۔ کئی مرتبہ یہی صورت حال پیش آئی تو ایک دن اماں کو کچھ خیال آیا۔ اسے گلے سے علیحدہ کرتے ہوئے مشکوک لہجے میں پوچھنے لگیں "یہ تو بتا تجھے کیسے پتا چلتا ہے کہ پیسے کہاں کہاں رکھے ہوتے ہیں؟

وہ گڑبڑا گیا۔ کوئی جواب نہ بن پڑا تو کہنے لگا "اماں! آپ کو اس سے کیا۔ بس آپ کو تو پورے پیسے مل جاتے ہیں نا۔" اماں اسے گھور کر رہ گئیں اور وہ وہاں سے کھسک لیا۔

اس کے بعد محلے پڑوس کا نمبر آیا۔ اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ سراغ لگائے۔ مثلاً سامنے والے چچا سلیم کی بکری جو گھر کے باہر لگے کھونٹے سے بندھی رہتی تھی، رسی تڑا کر کہاں گئی ہو گی! یا کونے کے مکان میں رہنے والی خالہ شاہدہ کا منو کئی گھنٹے گھر سے غائب رہنے کے بعد کون سی ویڈیو گیم شاپ سے برآمد کیا جا سکتا تھا اور تو اور اس نے ایک انتہائی شریر اور چھلاوا قسم کے اس بچے کا سراغ بھی لگا لیا جو عین چلچلاتی دوپہر میں لوگوں کے گھروں کی بیل بجا کر بھاگ جایا کرتا تھا۔

سکندر نے بڑے ماہرانہ انداز میں تمام کیسز حل

کیے تھے۔۔۔! کیونکہ اب وہ بچوں کے لیے لکھی جانے والی جاسوسی کہانیاں اور سراغ رسانی پر مبنی ناول پڑھ پڑھ کر خاصا ہوشیار ہوتا جا رہا تھا۔ میٹرک پاس کرنے تک اس موضوع پر اس کا مطالعہ خاصا وسیع ہو چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ٹی وی سے نشر کی جانے والی اس ٹائپ کی ہر سیریز کو بڑی پابندی سے دیکھتا تھا اور جیمز بانڈ سلسلے کی ہر نئی فلم کئی کئی بار دیکھتا تھا۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے لہٰذا اس نے میٹرک اور انٹر کے امتحانات تین تین سال میں پاس کیے پھر والد کے ڈر سے کھینچ تان کر بی اے پاس بھی کر ہی لیا۔

اس کے والد ایک محکمے میں اپر ڈویژن کلرک تھے۔ سکندر سے چھوٹی دو بہنیں اور تھیں۔ سفید پوشی کے بھرم کے ساتھ گزارا ہو رہا تھا۔ اس کی اماں کی سلیقہ شعاری کی بدولت گھر کا نظام چل رہا تھا۔ بیٹا ہونے کے ناتے والدین کی تمام امیدیں اسی کی ذات سے وابستہ تھیں۔

بی اے کرنے کے بعد جب کئی ماہ کی لگاتار کوششوں کے بعد بھی اسے کہیں ملازمت نہ مل سکی تو اس کے دل میں بچپن سے موجود سراغ رساں بننے کی خواہش ایک بار پھر انگڑائیاں لے کر جوان ہونے لگی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح اماں کو اس بات پر قائل کر لیا کہ کاروبار میں برکت ہے اور وہ اپنا بزنس سیٹ کرنا چاہتا ہے۔ اماں نے اس امید پر کمیٹیاں ڈال کر جمع کی ہوئی بچت اس کے حوالے کر دی کہ ان کا ہونہار سپوت ان کی رقم کئی گنا کر کے واپس کرے گا اور لاکھوں میں کھیلے گا وغیرہ وغیرہ ابا کو معلوم ہوا تو انہوں نے اس بات کا خاصا برا منایا کہ ان کے مشورے کے بغیر یہ کام ہو گیا انہوں نے سکندر کی اماں کو مشورہ دیا کہ وہ اب اپنے پیسوں کے لیے صبر کر لیں لیکن اماں نے کسی طرح سمجھا بجھا کر ان کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔

اور یوں سکندر علی نے سکندر اعظم کے نام سے دنیائے سراغ رسانی میں قدم رکھا۔ سکندر کے ساتھ اعظم کا لاحقہ اس نے خوش بختی کے لیے لگایا تھا کہ شاید اس نام سے موسوم خوش بختی اس کی تقدیر بدل دے! دوسرے یہ کہ ایسے بھاری بھرکم نام سے ذرا رعب بھی پڑتا تھا۔

مس روزی مارٹن جو برسوں سے اس کو ٹھے میں مصروف تھیں کہ انہیں مس نہ کہلانا پڑے لیکن اب تک اپنی ہر کوشش میں ناکام رہی تھیں اس دفتر میں ملازمت شروع کرتے وقت بڑی متاثر نظر آ رہی تھیں وہ دفتر کی اکلوتی ملازم تھیں۔ سکندر نے بڑی سمجھ داری اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے بطور سیکریٹری ان کا انتخاب کیا تھا۔

دفتر کی ویرانی اور کم سامانی کو دیکھتے ہوئے انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہیں کیا فرائض انجام دینے ہوں گے لیکن فرائض کی نوعیت جاننے سے پہلے انہوں نے یہ جاننا ضروری سمجھا کہ دروازے پر آنکھ جو کہ بھینگی بھی ہے آخر بنائی کیوں گئی ہے؟ جب انہوں نے اس سلسلے میں اپنے باس مسٹر سکندر اعظم سے بات کی تو اس نے ایک ادا سے سر کو جھٹکا دیا اور ساتھ ہی نہایت متاثر کن انداز میں ریوالونگ چیئر کو گردش میں لانے کی کوشش کی لیکن اس کی کڑکڑاہٹ سن کر سہم کر رک گیا۔

پھر اس نے سنبھل کر مس روزی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ان سے سوال کیا "مس روزی! کیا تم ٹی وی نہیں دیکھتیں؟"

"ٹی وی۔۔؟ جی ہاں دیکھتی ہوں۔" مس روزی نے جواب دیا۔

"تو کیا تم جرم و سزا اور سراغ رسی کے واقعات یا کہانیوں پر مبنی ڈرامے اور فلمیں نہیں دیکھتیں؟ ان میں دور جدید کے پرائیویٹ سراغ رسانوں کے لیے ہمیشہ "پرائیویٹ آئی" کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں اور جہاں تک دروازے پر بنی آنکھ کے بھینگے ہونے کا تعلق ہے تو میرا خیال ہے کہ تم نے اسے کسی غلط زاویے پر کھڑے ہو کر دیکھا ہو گا یا پھر اس سے چند لمحے پہلے ہی آئینہ دیکھا ہو گا۔" سکندر نے جواب دیا۔

"اوہ۔۔ میں سمجھ گئی۔" مس روزی نے کچھ

بغیر کہا۔ وہ کم از کم اتنا ضرور سمجھتی تھیں کہ کسی کی بات سن کر ستائشی انداز میں اس کی تائید کرنا بڑا جادوئی اثر رکھتا ہے ویسے بھی یہ حقیقت تھی کہ ڈیوٹی پر آتے وقت انہوں نے دروازے پر رک کر پرس سے آئینہ نکال کر اپنے چہرے کا جائزہ ضرور لیا تھا کہ چہرے پر نمودار ہوتی جھریاں میک اپ کی تہوں میں چھپانے کی جو طویل کوشش انہوں نے گھر پر کی تھی وہ رائیگاں تو نہیں جا رہی تھی؟

''اور سنو مس روزی!'' سکندر اعظم نے بڑے اسٹائل سے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگانے کی کوشش کی تو اس کا گھٹنا میز سے ٹکرایا'' آہ ۔۔۔ آئندہ تم مجھے ناقابل گرفت و ناقابل شکست اور چھلاوا صفت' سراغ رساں عظیم مسٹر سکندر اعظم کے نام سے مخاطب کرو گی۔'' اس نے بڑی مشکل سے اپنی کراہ کو ضبط کیا۔

''لیکن یہ نام تو بہت لمبا ہے مسٹر سکندر!'' مس روزی مارٹن پریشان نظر آنے لگیں' میں نام لیتے لیتے کام بھول جایا کروں گی کہ کس لیے آپ کو مخاطب کیا تھا۔''

''اچھا ۔۔۔'' سکندر نے کچھ مایوسی سے کہا'' چلو' کوئی بات نہیں تم صرف کلائنٹس کے سامنے میرا تذکرہ ان القابات کے ساتھ کیا کرو۔''

''کیا یہاں کلائنٹس آیا کریں گے ۔۔۔؟ مسٹر سکندر؟'' مس روزی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ظاہر ہے' لوگ یہاں اپنے مسائل کے حل کے لیے اور میری خدمات سے فائدہ اٹھانے ضرور آئیں گے ۔۔۔ یہ ان لوگوں کی خوش قسمتی ہو گی جو انہیں سکندر اعظم جیسے سراغ رساں کے پاس لے کر آئے گی ۔'' اس نے فخر سے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔

مس روزی نے ایک بار پھر اس کی تائید میں خوش دلی سے سر ہلایا۔ عین اسی لمحے ان کی نظر سکندر کی میز پر رکھے ہوئے ایک ڈبے نما آلے پر پڑی'' یہ کیا ہے؟'' انہوں نے ڈرتے ڈرتے اسے چھو کر دیکھا۔ انہیں یاد آیا کہ ایسا ہی ایک ڈبا ان کی اپنی میز پر بھی موجود تھا۔

''یہ انٹر کام ہے۔'' سکندر اعظم نے فخریہ لہجے میں بتایا'' جب کوئی کلائنٹ آئے گا تو تم اسے بتاؤ گی کہ میں بہت مصروف ہوں پھر تم اس کا نام معلوم کر کے مجھے انٹر کام پر اطلاع دیں گی۔ مجبوری ہے مس روزی!'' سکندر نے کندھے اچکائے'' ہمیں وہی کچھ کرنا پڑے گا جس کی لوگ ہم سے توقع کرتے ہیں۔ بہر حال تم اطمینان رکھو۔ میں وجیہہ اور نوجوان سراغ رسانوں کی طرح تمہارا احترام کرتے ہوئے تمہارے ساتھ ۔۔۔ حتی الامکان بے رخی کا برتاؤ کروں گا کیونکہ اسی میں میری عافیت ہے۔'' آخری جملہ اس نے زیر لب کہا تھا۔

''دوسری بات ۔۔۔'' سکندر نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا'' تم ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ہی تنخواہ ملنے کی توقع مت کرنا۔ طریق کار یہ ہو گا کہ کسی بھی بڑے کیس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد جب میں کلائنٹ سے اپنی فیس وصول کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو اسی وقت تمہاری واجب الادا تنخواہ ادا کر دیا کروں گا اور ساتھ ساتھ تمہیں خصوصی بونس بھی دیا کروں گا۔ اس لیے تمہیں بد دل ہونے کی ضرورت نہیں ۔ میں سمجھتا ہوں عام سے دفتر میں کام کر کے مقررہ تاریخ پر لگی بندھی تنخواہ لینا کوئی دلچسپ کام نہیں ایک سراغ رساں کے دفتر میں کام کر کے تمہیں بے شک مقررہ تاریخ پر تنخواہ نہ ملے لیکن جب بھی ملے گی کچھ اضافے کے ساتھ ہی ملے گی اور پھر نت نئے تجربات' ہیجان انگیز واقعات اور پرخطر معاملات سے گزرنے کا جو لطف ہو گا وہ اپنی جگہ بس یوں سمجھو کہ تمہاری زندگی میں انقلاب آگیا ہے مس روزی!''

مس روزی کو دم بہ خود دیکھ کر وہ میز پر جھک کر بڑے دلکش انداز میں مسکرایا اور بولا'' اب میں تنہائی میں بیٹھ کر کچھ غور و خوض کرتا ہوں۔ ہمیں شاید کچھ انتظار کرنا پڑے۔''

''کیسا انتظار؟'' مس روزی نے جیسے خواب سے چونکتے ہوئے کہا۔ وہ قربان ہو جانے والی نظروں سے سکندر کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

''کلائنٹس کا انتظار۔'' سکندر نے حتی الامکان اپنی

متانت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آخر میری شہرت کی خوشبو پھیلنے میں چند گھنٹے تو لگیں گے۔"

"لیکن ابھی تو آپ نے کوئی کیس حل ہی نہیں کیا۔ تو شہرت کیسے پھیلے گی؟"

"کیس تو کوئی آئے گا تبھی حل کروں گا نا۔" سکندر نے مس روزی کے انداز پر گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"بہرحال تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پاس پڑوس میں یہ چرچا عام ہو چکا ہے کہ یہاں ایک سراغ رساں کا دفتر کھل چکا ہے۔ ویسے بھی یہ کوئی معمولی واقعہ تو نہیں! یہ اس علاقے۔۔ بلکہ شاید اس شہر میں اپنی نوعیت کا واحد دفتر ہوگا اور وہ جو میں نے شام کے اخبارات میں سوا دو سطر کا اشتہار دیا تھا آخر وہ رائگاں تو نہیں جائے گا نا! تم دیکھنا ہماری شہرت کس طرح پھیلتی ہے!"

"اچھا!" مس روزی نے مسرت سے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ وہ بدستور فدا ہو جانے والی نظروں سے سکندر کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

سکندر اعظم کو اپنی عافیت خطرے میں نظر آ رہی تھی لہٰذا اس نے ذرا سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "مس روزی مارٹن! میں نے آپ سے تنہائی میں یہ عاشقانہ مزاج اختیار کرنے کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ صرف کلائنٹس کے سامنے ایکٹنگ کرنے کے لیے کہا تھا۔ سمجھیں آپ۔۔ بہتر ہوگا کہ اب آپ کام کریں۔"

مس روزی کا جگمگاتا چہرہ ماند پڑ گیا۔ ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ بولیں "میرا خیال تھا کہ اس طرح ذرا پریکٹس رہے گی۔" پھر سکندر کے چہرے پر برہمی کے آثار نمودار ہوتے دیکھ کر بولیں "خیر۔۔ آپ نے کام کرنے کی تاکید کی ہے کون سا کام؟"

"تم اس دوران میں فائلیں ترتیب دو۔" سکندر نے کام تجویز کیا۔

"کس لحاظ سے ترتیب دوں؟ ان میں کوئی کاغذ تو ہے نہیں!"

"تم انہیں اس لحاظ سے ترتیب دو کہ جب کاغذات تیار ہو جائیں تو ان میں آسانی سے لگائے جا سکیں۔ یعنی تم وہ فائلیں الگ کر لو جن پر حروف "سی" لکھا ہے اور وہ الگ کر لو جن پر "آئی سی لکھا ہے۔" سکندر نے مدبرانہ انداز میں سمجھایا۔

"سی اور آئی سی سے کیا مراد ہے؟" مس روزی نے ایک مستعد سیکریٹری کی طرح تمام امور سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سی سے مراد ہے کلیوز۔ یعنی سراغ۔" سکندر نے تشریح کی اور "آئی سی سے مراد ہے امپارٹنٹ کلیوز۔ یعنی اہم سراغ۔"

مس روزی نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور سکندر نے سر کے اشارے سے مجلس برخاست کرنے کا اشارہ دیا مس روزی نے کیبن سے نکل کر آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

اب سکندر نے ریوالونگ چیئر کی گڑگڑاہٹ کی پروا کیے بغیر اسے گھما کر کھڑکی کی طرف رخ کر لیا اور باہر کا نظارہ کرنے لگا۔

سکندر نے اس علاقے میں بہ نفس نفیس جا کر ہینڈ بل تقسیم کیے تھے جن میں علاقے کے لوگوں کو یہ نوید دی گئی تھی کہ ان کی زندگی کے تمام سنگین مسائل کے خاتمے کے لیے اس نے سراغ رسانی شروع کر دی ہے اور ساتھ ہی یہ فلسفہ بھی بیان کیا تھا کہ ہر مسئلے کی تہ تک پہنچنے کے لیے بہرحال ایک ذہین سراغ رساں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ وہ اب اس سہولت سے محروم نہیں رہیں گے۔

اگر سکندر یہ اشتہارات ڈالنے کے پانچ منٹ بعد واپس آ کر جائزہ لیتا تو اسے وہ سب کے سب مڑی تڑی حالت میں گولا بنے ادھر ادھر پڑے نظر آ جاتے۔

سکندر نے اپنے دفتر کو متاثر کن بنانے کے لیے سیکنڈ ہینڈ فرنیچر کی دکان سے ایک بک شیلف بھی خرید لیا تھا اور بڑی تگ و دو کے بعد مختلف ٹھیلوں پر ملنے والی پرانی کتابوں میں سے اپنے مطلب کی کئی کتابیں حاصل کی تھیں۔ مثلاً جدید طریقہ تفتیش، تعزیراتی قوانین، اس کے علاوہ ارل اسٹینلے گارڈنر، اگاتھا کرسٹی،

ہٹ یلی ڈے اور ریمنڈ شینڈلر وغیرہ کی تصنیفات کے تراجم بھی تھے جو بعض قارئین کی قدر ناشناسی کا شکار ہو کر ان ٹھیلوں پر پہنچ گئے تھے۔

ان گراں قدر کتب کے مطالعے کے بعد سکندر کو مزید یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب ہر قسم کے مسئلے سے بہ آسانی نمٹ سکتا ہے لیکن ماحول پر نہ جانے کیوں اتنا جمود اور لوگوں پر بے حسی طاری تھی کہ چار دن گزر گئے مگر کوئی شخص اپنا مسئلہ حل کرانے کے لیے اس کے دفتر میں داخل نہیں ہوا۔ سکندر کو کچھ کچھ شبہ ہو رہا تھا کہ شاید اس کی شہرت کی خوشبو زیادہ موثر طریقے سے نہیں پھیل سکی۔

پانچویں دن ماحول پر طاری جمود کے ٹوٹنے کے کچھ آثار دکھائی دیے۔ سکندر اس وقت کچھ رسالوں میں قتل کی وارداتوں سے متعلق تصاویر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جب اس نے مس روزی کی آواز سنی۔

''اچھا تو آپ مسٹر سکندر اعظم کی خدمات سے استفادہ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ وہ اس وقت کئی کیسز کی ''تفتیشوں'' میں مصروف ہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ وہ آپ کے لیے تھوڑا وقت نکال سکیں۔ کیا نام ہے آپ کا؟''

''مصلح الدین۔'' جواباً غراتی ہوئی آواز سنائی دی ''مسٹر سکندر کو بتاؤ کہ میں فوری طور پر اس کی خدمات کرائے پر لینا چاہتا ہوں۔'' وہ کوئی مس روزی سے بھی بڑا زباں داں تھا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ آپ معاوضہ ادا کر کے ان کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں؟'' مس روزی کے لہجے سے مسرت چھلک پڑ رہی تھی۔

''ایک منٹ ٹھہریے۔ اس کے بعد ٹھا۔ کی ایک زور دار آواز سنائی دی۔ مس روزی نے غالباً خوشی اور گھبراہٹ کے ملے جلے جذبات میں انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے نیچے گرا دیا تھا۔

اب مس روزی نے انٹرکام پر بولنا شروع کر دیا تھا ''مسٹر سکندر! نہایت ہینڈسم اور صحت مند قسم کے ایک صاحب جو اپنا نام مصلح الدین بتاتے ہیں حالانکہ کسی طور سے مصلح نظر نہیں آتے' آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ روزی!'' سکندر اعظم نے انٹرکام کا ریسیور اٹھانے کی زحمت کیے بغیر ہی کہا۔

''بہرحال تم انہیں اندر بھیج دو۔''

چند لمحے بعد جو شخص اندر آیا وہ بہت ہی دراز قد' بہت زیادہ جسیم' نہایت بدصورت اور انتہائی کالا تھا۔ مس روزی اسے اندر پہنچا کر جانے لگیں تو سکندر نے انہیں انگلی کے اشارے سے روکا اور پھر اپنا لہجہ بارعب بناتے ہوئے کہا میں مسٹر مصلح الدین سے بات کرتا ہوں تم اس دوران میں فون کر کے معلوم کرو کہ ہم نے باہر سے جو خصوصی دوربین منگوائی ہے' وہ کب تک آئے گی؟ اور یہ بھی معلوم کر لو کہ ہمارے آدمی نے پولیس اسٹیشن میں مفرور مجرموں کا ریکارڈ کھنگال لیا ہے یا نہیں اور اگر مطلوبہ مجرم کی تصویر مل گئی ہے تو فوراً منگوالو۔ اس کے علاوہ میرے لیے کلب سینڈوچ کا آرڈر دے دو۔''

مس روزی نے سر ہلا کے دروازہ بند کر دیا۔ مصلح الدین اس مکالمے سے بڑا متاثر۔۔۔ نظر آ رہا تھا۔'' لگتا ہے آپ کا کام بہت اچھا چل رہا ہے سکندر صاحب۔'' اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔

''اس میں کیا شک ہے۔'' سکندر اعظم نے شان بے نیازی سے کہا'' پرائیویٹ سراغ رساں تو ہمیشہ ہی بے حد مصروف رہتے ہیں۔ ہاں تو میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

وہ دیوزاد ایک لمحے کے لیے ہچکچایا پھر تفصیلات بتاتے ہوئے کہنے لگا'' میں اور میری بیوی کچھ عرصے پہلے ہی اس علاقے میں آئے ہیں۔ حال ہی میں ہم نے قریب ہی ایک مکان کرائے پر لیا ہے۔ اب ایک ایسا مسئلہ آن پڑا ہے کہ ہم بہت پریشان ہیں۔ اگر تم اس مسئلے کو حل کر دو تو میں تمہیں مطلوبہ فیس سے بھی کچھ زیادہ رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔'' چند سیکنڈ میں ہی وہ ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا تھا۔

''ایڈوانس؟'' سکندر اعظم نے بہ مشکل اپنا جوش وخروش دباتے ہوئے خود کو کرسی سے اٹھ کھڑا ہونے سے باز رکھا۔

''نہیں۔ جب کیس حل ہو جائے گا۔'' مصلح الدین نے جواب دیا اور سکندر اعظم کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

بہر حال اس نے اپنی خودی کو بلند رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا ''مسئلہ بیان کریں۔ تفصیل کے ساتھ۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی چھپانے کی ضرورت نہیں۔''

مصلح الدین کی کہانی کوئی زیادہ پیچیدہ نہیں تھی۔ اس کی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مالی طور سے اتنا گیا گزرا بھی نہیں جتنا نظر آتا تھا۔ بات یہ تھی کہ اس کی بیوی کو قیمتی گھڑیوں اور زیورات کا شوق تھا۔ وہ یہ تمام چیزیں گھر میں ہی رکھتی تھی۔ کئی دن پہلے جب وہ کسی دوست کے ہاں دعوت پر گئے تھے تو کسی خبیث چور نے ان کی یہ تمام قیمتی چیزیں چرالی تھیں۔ دونوں میاں بیوی کا خیال تھا کہ پولیس میں چوری کی رپورٹ درج کرانے سے فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہونے کا خطرہ ہے۔ اب مصلح الدین چاہتا تھا کہ سکندر اعظم ان کی چیزیں واپس دلا دے۔

سکندر اعظم نے نوٹ بک اور پین سنبھالا اور ماہر سراغ رسانوں کے سے انداز میں تفتیش کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو کسی پر شک ہے مسٹر مصلح الدین!''

''بے شک مجھے شک ہے اور بہت زیادہ شک ہے مسٹر سکندر!'' مصلح الدین نے جوش میں آتے ہوئے کہا ''تم انور علی کو جانتے ہو؟ وہ لمبا ہڈیوں کا ڈھانچا۔ لالچی صورت نوجوان؟''

''میں اسے جانتا ہوں اور نہیں بھی جانتا۔'' سکندر اعظم نے کہنہ مشق سراغ رسانوں والا محتاط رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی ''میرا مطلب ہے تقریباً روزانہ ہی راہ چلتے اس کا میرا آمنا سامنا ہوتا ہے لیکن کوئی سلام دعا نہیں ہوتی۔ بہر حال۔۔ تمہیں اس پر شبہ کیوں ہے؟''

''یہاں آنے کے بعد میری اس سے رسمی سی جان پہچان ہو گئی تھی۔ ایک مرتبہ ہمارے بیڈ روم کی وائرنگ میں کچھ خرابی ہو گئی تھی تو میں نے اس سے کسی الیکٹریشن کا پتا پوچھا تھا تب وہ خود کسی الیکٹریشن کو لے کر آیا تھا۔۔ اور کام ختم ہونے تک ہمارے بیڈ روم میں ہی رہا تھا۔ اس دوران میں وہ بڑے غور سے بیڈ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی زیادہ تر توجہ الماری کی طرف تھی۔''

''میں سمجھ گیا۔ سراغ رسانوں کی زبان میں اسے جائے واردات کی نقشہ بندی کہتے ہیں۔'' سکندر اعظم نے کہا۔

''اور میری زبان میں اسے کمینہ پن کہتے ہیں۔'' مصلح الدین نے بتایا۔ ''اس کے علاوہ ایک دو مرتبہ رات کو میری آنکھ کھلی اور میں نے کھڑکی سے جھانکا تو اپنے گھر کے گرد ایک سایہ سامنڈلاتے دیکھا۔ سائے کی لمبائی سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ انور علی ہی تھا اور جب بھی وہ مجھ سے ملتا ہے میرے مالی معاملات کے بارے میں کھود کھود کر سوالات کرتا رہتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کرید کرید کر؟'' سکندر کی اپنی گرامر بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی مگر کم از کم اس حد تک وہ تصحیح کر ہی سکتا تھا۔

''ہاں۔۔ہاں' ایک ہی بات ہے۔'' مصلح الدین نے اس کی تصحیح کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

''پھر ایک بات یہ بھی ہے مسٹر سکندر' آخر اس کا ذریعہ معاش کیا ہے؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔'' سکندر نے تسلیم کیا۔

''کوئی بھی صحیح طور پر نہیں جانتا۔'' مصلح الدین نے بتایا۔ ''وہ اکیلا ایک فلیٹ میں رہتا ہے کسی سے گھلتا ملتا نہیں۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس ہر وقت رقم موجود رہتی ہے لیکن وہ کبھی کوئی کام کرتا نظر نہیں آتا' تبھی تو مجھے اس کے چور ہونے کا شبہ بلکہ یقین ہے۔'' مصلح الدین نے جوش میں آتے ہوئے

میز پر ہاتھ مارا۔ سکندر اچھل پڑا اور اپنی خفت مٹانے کے لیے کھانسنے لگا۔

مصلح الدین نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر سکندر کے سامنے رکھا۔ ''یہ ان چیزوں کی فہرست ہے جو چوری ہوئی ہیں۔ اگر میرے پاس اس بات کا ثبوت ہوتا کہ انور علی نے ہی یہ چیزیں چرائی ہیں تو اسے ککڑی کی طرح توڑ دیتا۔''

''یہی تو وہ مرحلہ ہے جہاں پرائیویٹ سراغ رسانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔'' سکندر اعظم نے فاتحانہ لہجے میں کہا ''میرا خیال ہے سب سے پہلے تو مجھے ایک نہایت باصلاحیت اور ہوشیار آدمی انور علی کی مستقل نگرانی کے لیے مقرر کرنا پڑے گا۔''

''کون ہے وہ آدمی؟'' مصلح الدین نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں خود۔۔'' سکندر نے اطمینان سے جواب دیا ''اب میں آپ کے ساتھ جائے واردات کا معائنہ کرنے چلوں گا۔'' اس نے میز کی دراز سے ربر کے دستانے نکال کر پہنے۔ سر پر ہیٹ رکھا اور محدب عدسہ ہاتھ میں لے کر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ مصلح الدین بڑے غور سے اس کی حرکات وسکنات دیکھ رہا تھا اور بڑا متاثر نظر آ رہا تھا۔

بیرونی کیبن میں آکر سکندر اعظم کی نظر مس روزی پر پڑی۔ بھئی۔۔۔ وہ میرا کلب سینڈوچ کہاں ہے؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''وہیں۔۔۔ ریسٹورنٹ میں۔۔'' مس روزی نے اطمینان سے جواب دیا ''ریسٹورنٹ کے مالک حنیف خان نے ادھار دینے سے انکار کر دیا تھا۔''

سکندر اعظم ذرا بھی کھسیائے بغیر مصلح الدین کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا ''ایک تو اس خان کو مذاق کرنے کی بڑی بری عادت ہے۔'' پھر اس نے مصلح الدین کو بتایا ''میرا بڑا اچھا دوست ہے حنیف خان!''

پھر وہ دوبارہ مس روزی کی طرف متوجہ ہوا۔'' میں جائے واردات کا معائنہ کرنے جا رہا ہوں۔ اس دوران میں اگر دفتر میں کلائنٹس کا زیادہ ہجوم ہو جائے تو تم ان کے کوائف ترتیب سے نوٹ کر لینا اور ہاں۔۔۔ وہ فائل بھی مکمل کر کے رکھ دینا جس پر لکھا ہے' مسٹر سکندر اعظم کے حل کردہ کیس۔''

''بہت بہتر ڈارلنگ!'' مس روزی نے محبوبانہ انداز میں کہا۔

''خبردار! اجنبیوں کے سامنے اس طرح بے تکلفی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہیں کتنی مرتبہ ہدایت کی ہے کہ یہ انداز گفتگو تنہائی میں ہی مناسب رہتا ہے۔'' سکندر نے اسے ڈانٹا۔

''معافی چاہتی ہوں چیف!'' مس روزی مارٹن نے بڑی کامیابی کے ساتھ حسرت و یاس کی اداکاری کرتے ہوئے کہا کیا کروں۔۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار ہی نہیں رہتا۔''

سکندر اعظم، مصلح الدین کا بازو پکڑ کر باہر نکلتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''ایک تو سراغ رساں کی سیکریٹری اس کے عشق مین مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہتی۔''

مصلح الدین کے گھر پہنچ کر چونکہ اسے خود کو ایک ماہر سراغ رساں ثابت کرنا تھا۔ کچھ کارکردگی بھی دکھانی تھی اس لیے اس نے مصلح الدین کی بیوی پر سوالات کی بوچھار کر دی۔ جس میں اس قسم کے سوالات بھی شامل تھے۔

''ایک پرائیویٹ سراغ رساں سے بالمشافہ ملاقات کر کے آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ اپنی تمام گھڑیاں اور زیورات کسی دوست کو کسی تقریب میں شرکت کے لیے عاریتاً دے کر بھول گئی ہوں؟''

اس سوال کے جواب میں مسز مصلح الدین نے سکندر کو الماری کی وہ دراز دکھائی جس کا تالا توڑ کر چیزیں نکالی گئی تھیں۔ سکندر نے بڑی باریک بینی سے دراز کا معائنہ کیا۔ محدب عدسے سے ٹوٹے ہوئے تالے کا جائزہ لیا اس دوران مین وہ پرخیال انداز میں سر بھی ہلاتا جا رہا تھا جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہو!

اس دوران میں دونوں میاں بیوی بڑے غور سے اس کی کارروائی کا جائزہ لے رہے تھے۔ سکندر

نے ان کے تاثرات دیکھنے کے لیے ان کے چہروں پر نظر ڈالی تو اسے ان کی نظروں میں اپنے لیے ستائش نظر آئی۔

بالآخر سکندر اعظم نے اپنی ابتدائی تفتیش ختم کی اور مصلح الدین سے درخواست کی کہ وہ اسے خان کے ریسٹورنٹ تک چھوڑ آئے پھر وہ مصلح الدین کی اسی کھٹارا سی کار میں بیٹھ کر واپس آیا جس میں اپنے دفتر سے اس کے گھر تک گیا تھا۔ ریسٹورنٹ کے دروازے پر اتر کر وہ سیدھا حنیف خان کے پاس پہنچا اور اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا ''میں نہ کہتا تھا کہ ایک دن تمہارا سارا ادھار چکا دوں گا۔''

''خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں اتنی توفیق دی۔'' خان نے اطمینان کی سانس لے کر کہا ''لاؤ نکالو پیسے!''

''صبر میرے دوست صبر!'' سکندر نے اس کا کندھا تھپکا میں نے یہ نہیں کہا کہ ابھی اور اسی وقت تمہارا ادھار چکا رہا ہوں۔ بس ایک آدھ دن کی بات اور ہے۔ بالآخر میرے ہاتھ ایک ایسا ہی کیس آ گیا ہے جیسا کہ میں چاہتا تھا۔ عظیم الشان فیس اور بے پناہ شہرت جلد ہی میرے قدم چومنے والی ہے۔ فی الحال تم میرے لیے ایک کلب سینڈوچ اور کولڈ ڈرنک کا آرڈر دو۔''

خان نے رونی سی شکل بنا کر سکندر اعظم کی طرف دیکھا پھر مردہ سی آواز میں ویٹر کو پکار کر اس کا آرڈر نوٹ کرا دیا۔

''اور دیکھو۔'' سکندر نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا ''اگر انور علی نامی وہ لمبا سا نوجوان تمہارے ریسٹورنٹ میں آئے تو جس گلاس میں وہ پانی پیے اسے جوں کا توں محفوظ رکھ لینا۔''

''وہ کیوں؟'' حنیف خان نے حیرانی سے پوچھا۔

''احمق۔ تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔'' مجھے اپنے کیس کے سلسلے میں اس کے فنگر پرنٹس کی ضرورت ہے۔'' سکندر نے اس کی کم عقلی پر ماتم کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم فنگر پرنٹس کا کرو گے کیا؟'' حنیف خان نے پھر پوچھا

''یہ تو مجھے بھی صحیح طور سے معلوم نہیں۔'' سکندر نے تسلیم کیا ''بہر حال کتابوں میں لکھا ہے کہ سراغ رسانوں کو مشکوک افراد کے فنگر پرنٹس ضرور حاصل کرنے چاہئیں۔''

خان سے تعاون کا وعدہ لے کر سکندر نے سینڈوچ کھایا' کولڈ ڈرنک کی بوتل پی اور واپس دفتر لوٹ آیا۔

اس رات سے سکندر نے عملی تفتیش کا آغاز کیا اس نے انور علی کی نگرانی شروع کر دی۔ جونہی وہ اپنے فلیٹ سے نکلا' اس کے پیچھے چل دیا کچھ دور جا کر انور علی ایک ساتھ بنے ہوئے کئی سینما گھروں میں سے ایک سینما گھر میں گھس گیا اور سکندر اعظم باہر ہی کھڑا رہ گیا۔ وجہ نہایت معمولی اور سیدھی سادی تھی کہ وہ ٹکٹ خریدنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے بعد تین دن تک یہی معمول رہا۔ سکندر اعظم دن بھر اس عمارت کے گیٹ کے سامنے ٹہلتا رہتا جس کے ایک فلیٹ میں انور علی رہتا تھا۔ شام کو کسی سینما ہاؤس تک اس کا تعاقب کرتا۔ ایک بات تو طے تھی کہ انور علی لگے بندھے معمولات کا عادی تھا۔ روزانہ ہی سینما ہاؤس جا کر فلم دیکھنے کا ایسے نشہ تھا سکندر کو انور علی کے اس معمول پر حیرت تھی کیونکہ سیٹلائٹ چینلز کے اس دور میں کوئی بھی اتنی پابندی سے سینما ہاؤس جا کر فلمیں نہیں دیکھتا پھر سکندر نے اس کی یہ توجیہہ تلاش کی کہ چونکہ تنہائی کے شکار لوگ اپنا وقت گھر سے باہر پر ہجوم جگہوں پر گزارنا پسند کرتے ہیں اسی لیے انور علی بھی تنہائی سے گھبرا کر روزانہ رات کو سینما ہاؤس کا رخ کرتا ہے۔ غالباً اب وہ اس معمول کا اتنا عادی ہو چکا ہے کہ اس کے بغیر اسے نیند بھی نہیں آتی ہو گی!

اس کے علاوہ ایک بات اور بھی طے تھی کہ اس کیس کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچانے میں سکندر کی بقاء تھی دوسری صورت میں قرض خواہ اس کا جینا دو بھر

دیں گیا ور والد صاحب گھر سے نکال باہر کریں۔ ایک طرح سے یہ اس کی ایجنسی کی بقاء کا مسئلہ بھی تھا۔ اگر وہ ایک کیس کو عمدگی سے پایہ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے تو اسے یقین تھا کہ لوگ محض اس لیے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے لگیں گے کہ سکندر اعظم آکر انہیں اس مصیبت سے نکالے!

ادھر مصلح الدین بھی کئی مرتبہ دفتر کا چکر لگا چکا تھا اور برہم ہو کر جا چکا تھا۔ دل برداشتہ ہو کر سکندر اعظم نے فیصلہ کن قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا محض سراغ رسانی سے کام نہیں چل رہا تھا اب اس نے ایکشن میں آنے کا تہیہ کر لیا۔

اتنے دن تک انور علی کی نگرانی کے بعد اسے اس کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہو چکی تھیں مثلاً یہ کہ اس کا فلیٹ کون سا تھا' دن بھر اس کے پاس ملاقاتیوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی جو نہ جانے کس کام سے اس کے پاس آتے تھے وہ خود کوئی ملازمت وغیرہ نہیں کرتا تھا۔ البتہ وہ شام کو فلم دیکھنے ضرور جاتا تھا اور اس دوران میں کوئی اس کی تلاش میں بھی نہیں آتا تھا۔

سکندر نے فیصلہ کیا کہ اس دوران میں وہ انور علی کے فلیٹ کی تلاشی لے گا۔ اگر چوری کا مال یا اس کا سراغ موجود ہوا تو ٹھیک ورنہ وہ کسی اور شخص کو مشتبہ قرار دے کر اس کے متعلق تفتیش شروع کرے گا۔

فیصلے پر عمل درآمد کی رات اسی نے انور علی کے فلیٹ کی طرف روانہ ہوتے وقت ایک ہتھوڑا اور ایک چھینی بھی کوٹ کے نیچے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لی۔

یوں تو اس کے پاس مدت دراز سے جمع کی ہوئی چابیوں کا ایک گچھا بھی موجود تھا لیکن ہتھوڑا اور چھینی اس نے اس خیال سے ساتھ لے لیا تھا کہ اگر ان چابیوں سے تالا نہ کھل سکا تو وہ سیدھا سادہ طریقہ استعمال کر سکے۔

چوکیدار کی نظر بچا کر وہ عمارت کے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا اور بہ آسانی انور علی کے فلیٹ تک پہنچ گیا دروازے پر رک کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ راہداری سنسان تھی اور اسے یہ بات معلوم تھی کہ سامنے والا فلیٹ آج کل خالی تھا۔ اس کے باوجود جب سکندر نے تالے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو نہ صرف ہاتھ بلکہ ٹانگیں بھی کانپ رہی تھیں۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ فلموں میں سراغ رساں ایسے موقعوں پر ذرا بھی گھبرائے بغیر تالا تو کیا دروازہ تک قبضوں سے اکھاڑ کر کس طرح ایک طرف رکھ دیتے ہیں!

بہر حال یہ سکندر اعظم کی خوش قسمتی تھی کہ تیسری چابی آزماتے ہی تالا کھل گیا گو کہ اس میں چابی سے زیادہ طاقت کا کمال تھا جو وہ گھبراہٹ میں صرف کر بیٹھا تھا اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ تالا اگر کچھ دیر اور نہ کھلتا تو عین ممکن تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر وہیں پٹ سے گر پڑتا اور انور ہی آ کر اسے اٹھاتا۔

اندر پہنچ کر کئی منٹ میں اس کی حالت سنبھلی جس کے بعد اس نے تلاشی کی مہم کا آغاز کیا۔ یہ آغاز باتھ روم سے ہوا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سکندر کے پیٹ میں سخت مروڑ اٹھ رہا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ مجرم عموماً خطرناک چیزیں باتھ روم میں چھپاتے ہیں۔

تلاشی کی مہم کا اختتام انور علی کے بیڈ پر ہوا جس پر وہ تھک ہار کر ڈھیر ہو گیا تھا کیونکہ اسے اب تک اپنی مطلوبہ چیزوں میں سے کسی کا سراغ نہیں ملا تھا۔ تب اسے خیال آیا کہ اس نے بیڈ کے نیچے تو تلاشی لی ہی نہیں!

بیڈ کے نیچے جھانک کر دیکھنے پر اسے ایک ٹرنک نظر آیا اس نے ٹرنک باہر کھینچا اس کا تالا کھولنے کے لیے اسے نہایت ماہرانہ انداز میں ہتھوڑا اور چھینی استعمال کرنا پڑی لیکن ٹرنک کھلتے ہی وفور مسرت سے اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کیونکہ اس میں گھڑیوں' انگوٹھیوں اور زیورات کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔

بالآخر اس نے اپنا پہلا کیس پایہ تکمیل کو پہنچا ہی لیا تھا' چوری کا معما حل کر ہی لیا تھا۔ حق وانصاف کی فتح ہو چکی تھی حق دار کو اس کا حق ملنے والا تھا اور غاصب کیفر کردار کو پہنچنے والا تھا۔ سکندر کے خیال میں اب یہ ضروری تھا کہ چوری کے اس مال میں سے

اپنے کلائنٹ مصلح الدین کی چیزیں علیحدہ کرلی جائیں اور بعد میں غور کیا جائے کہ باقی سامان اور مجرم کے بارے میں کیا قدم اٹھایا جائے۔

اس نے جیب سے مصلح الدین کی دی ہوئی فہرست نکالی اور اس کے مطابق ایک ایک چیز علیحدہ کرلی اور باقی سامان ٹرنک میں چھوڑ کر فلیٹ سے باہر نکل آیا دروازے کی کنڈی اٹکائی اور مصلح الدین کے گھر کی طرف دوڑ لگادی۔

سکندر نے جب مصلح الدین کے گھر پہنچ کر مسروقہ اشیا ایک ایک کرکے دونوں میاں بیوی کے سامنے رکھیں تو ان کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں حتیٰ کہ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ان چہروں پر صرف آنکھیں رہ گئی ہیں اور چہرے غائب ہوگئے ہیں وہ اس وقت چونکے جب سکندر نے ان کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا ''اب نکالیے میری فیس۔''

''کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔'' مصلح الدین نے گویا ہوش میں آتے ہوئے کہا ''تم بلاشبہ ایک عظیم سراغ رساں ہو مسٹر سکندر اعظم۔'' اس نے اپنا پھولا پھولا سا بٹوا نکالا اور اس میں سے سکندر اعظم کی مطلوبہ فیس نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

سکندر ان کے گھر سے نکل کر گویا ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا اپنے دفتر پہنچا اس نے بتی نہیں جلائی اور اندھیرے میں ہی کرسی کھینچ کر کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اچھلے کودے، خوب ناچے گائے۔ لیکن وہ صرف گنگنانے ہی پر اکتفا کررہا تھا تاکہ لوگ اسے کم ظرف نہ سمجھیں کہ پہلی ہی کامیابی پر عظیم سراغ رساں آپے میں نہیں رہا۔ گنگناتے ہوئے اسے سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی اس نے سوچا چلو سگریٹ پی کر ہی جشن منایا جائے۔

جب ہاتھ ڈالا تو اسے خیال آیا کہ وہ اپنا سگریٹ کیس تو مصلح الدین کے گھر پر ہی بھول آیا ہے اس نے سوچا جلدی سے جاکر سگریٹ کیس لے آئے، کہیں وہ دونوں میاں بیوی سو ہی نہ جائیں! اس نے دوبارہ ان کے گھر کی طرف دوڑ لگائی وہ جب مصلح الدین کے گھر پہنچا تو کمرے کی کھڑکی کھلی اور اندر سے باتیں کرنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ غیر ارادی طور پر رک گیا۔ اس کے کان میں مصلح الدین کی آواز آئی۔

''بڑا جاسوس بنا پھرتا ہے۔'' مصلح الدین قہقہہ لگانے کے بعد کہہ رہا تھا ''کیا الو بنایا۔ زندگی بھر یاد کرے گا۔''

''واقعی۔'' اس کی بیوی نے بھی قہقہہ لگایا ''تمہاری ذہانت کا تو جواب ہی نہیں۔''

''اس جاسوس کے بچے کو یہ بھی نہیں معلوم کہ انور علی خفیہ طور پر لوگوں کی چیزیں گروی رکھنے کا دھندا کرتا ہے۔''

مصلح الدین اپنی دھن میں مگن کہہ رہا تھا۔''میں جب اس کے پاس تمہارا وہ واہیات سا پرانا نیکلس گروی رکھنے گیا تو اس نے اسے صندوق میں رکھنے کے لیے ذرا دیر کے لیے صندوق کا ڈھکن اٹھایا تھا اور میرے ذہن اور نظر کی داد دو کہ میں نے اتنی سی دیر میں جن جن چیزوں کی جھلک دیکھی انہیں یاد رکھا اور بعد میں ایک کاغذ پر لکھ لیا کاش میں ساری چیزیں دیکھنے اور ان کی فہرست تیار کرنے میں کامیاب ہوجاتا تاکہ اس کے مطابق وہ جاسوس کا بچہ سب کچھ اٹھا لاتا۔ بہرحال یہ سودا اب بھی برا نہیں اور ہاں تم نے چیزیں حفاظت سے رکھ دی ہیں نا؟ اگلے شہر میں پہنچ کر ہم انہیں فروخت کردیں گے۔''

''ہاں کپڑوں کی الماری کی سب سے نچلی دراز میں رکھ دی ہیں۔'' اس کی بیوی نے جواب دیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ اب جلدی جلدی سامان پیک کرلو، علی الصباح ہی یہاں سے نکل چلیں گے۔'' مصلح الدین نے کہا۔

اس کی بیوی نے پوچھا ''لیکن تم نے مالک مکان کو کچھ رقم ایڈوانس دی تھی، وہ کیسے واپس ملے گی؟''

''ارے۔۔۔ کون سا ایڈوانس۔۔۔! وہ تو میں نے اپنی مالی مشکلات کا رونا رو کر صرف دو ماہ کے کرایے کے برابر رقم دی تھی۔ وہ اب کرائے کی مد

میں پوری ہو چکی! میں نے اس سے کہا تھا کہ جیسے ہی پیسوں کا انتظام ہوا میں اسے مزید رقم ادا کردوں گا۔ بے چارہ نرم دل انسان ہے لہٰذا میری بات مان گیا۔" مصلح الدین نے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے جواب دیا پھر بولا "اور میری درخواست پر اس نے تھوڑا سا فرنیچر بھی ہمارے استعمال کے لیے چھوڑ دیا تھا۔"

اس کے بعد دونوں کپڑے اور دوسرا چھوٹا موٹا سامان سمیٹنے اور پیک کرنے میں مصروف ہو گئے۔

سکندر اعظم کا غم و غصے سے برا حال ہو چکا تھا۔ پہلے تو اس نے ارادہ کیا کہ ایک زوردار ٹکر کے ساتھ دروازہ توڑتا ہوا اندر گھس جائے اور ایک زوردار بڑھک لگا کر مصلح الدین کی اتنی پٹائی لگائے کہ اس کا بھرکس نکل جائے لیکن پھر اپنی اور مصلح الدین کی جسامت کا سرسری سا موازنہ کرتے ہی اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

بہرحال فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا ورنہ اس مجرم کا نکل جانا یقینی تھا جس کی خدمت میں سکندر اعظم، سراغ رسان عظیم نے خود بصد خلوص دوسروں کا مال پیش کیا تھا اور نادانستگی میں خود بھی چوری کا مرتکب ہو چکا تھا۔

وہ مکان کے پیچھے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا اور ان کے سونے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب مکان تاریکی میں ڈوب گیا تو وہ جھاڑیوں سے باہر نکلا۔ چاروں طرف کا جائزہ لیا، ہر طرف مکمل سناٹا اور تاریکی تھی۔ وہ گیٹ پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ مکان میں خاموشی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ آہستہ سے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ اس نے کی ہول سے جھانکا اندر نائٹ بلب کی مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور مکمل خاموشی تھی۔

اب ایک بار پھر اس کی صلاحیتوں کا امتحان درپیش تھا! اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا، کئی چابیاں آزمائیں بالآخر لاک کھل گیا۔ اس نے احتیاط سے دروازہ کھولا۔ دونوں گہری نیند سو رہے تھے۔

کمرے میں ان کے ہلکے ہلکے خراٹے گونج رہے تھے۔ لگتا تھا دونوں پیکنگ کر کے تھک گئے تھے اور اب گھوڑے گدھے۔۔۔ سب بیچ کر سو رہے تھے۔

سکندر کونے میں رکھی ہوئی الماری کی طرف بڑھا۔ ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو الماری کا دروازہ کھل گیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ الماری خالی پڑی تھی، اس پر شدید گھبراہٹ طاری تھی پھر اسے خیال آیا کہ الماری تو خالی ہوگی ہی کیونکہ وہ دونوں کپڑے وغیرہ نکال کر پیک کر چکے تھے۔ اس نے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالا اور امید کی ڈور کے سرے کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے ہوئے، نچلی دراز کو کھولنے کی کوشش کی۔۔۔ دراز لاک تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے یکے بعد دیگرے بہت سی چابیاں آزمائیں لیکن بے سود۔۔۔

اس نے رخصت ہوتے ہوئے حواس کو بہ مشکل پکڑا اور ایک آخری کوشش کی۔ اس مرتبہ اس کی کوشش کامیاب ہو گئی۔ اس نے جلدی سے دراز کو کھینچا تو اس میں ساری مطلوبہ چیزیں موجود تھیں۔ اس پر شادی مرگ کی سی چند ہی بے معنی سی آوازیں نکلی تھیں کہ اس نے جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

پھر اس نے جلدی جلدی تمام چیزیں کوٹ کی جیبوں میں ٹھونسیں اور بڑی احتیاط کے ساتھ باہر نکل آیا۔

☆☆☆

دوسری صبح سکندر اعظم اپنے دفتر میں منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ مس روزی نے آتے ہی ان کی حالت پر تبصرہ کیا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ خود اپنے جنازے میں شرکت کر کے آ رہے ہیں۔"

"تقریباً ایسی ہی بات ہے۔" سکندر نے مس روزی کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے قدرے رکھائی سے جواب دیا تھا۔

مسروقہ در مسروقہ چیزیں اس وقت اس کی میز کی دراز میں موجود تھیں اور مسئلہ یہ درپیش تھا کہ وہ یہ چیزیں انور علی تک کس طرح پہنچائے کہ اس کی اپنی

شخصیت سامنے نہ آئے! دوبارہ چوروں کی طرح اس کے فلیٹ میں گھسنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ اس کے ہاں ایک مرتبہ چوری ہو چکی تھی۔ اب وہ بے حد محتاط ہو چکا ہوگا اور اس نے کچھ نہ کچھ حفاظتی انتظامات بھی کیے ہوں گے۔ سکندر اعظم جس قدر غور کر رہا تھا اس کی الجھن اتنی ہی بڑھ رہی تھی۔

سوا گیارہ بجے سکندر نے دھماکے سے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنی پھر اس نے مس روزی کی آواز سنی جو آنے والے کو یہ بتانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ مسٹر سکندر اس وقت کتنے مصروف ہیں لیکن ان کی تقریر ابھی جاری تھی کہ نو وارد ایک جھٹکے سے سکندر کے کیبن کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

''میرا نام انور علی ہے مسٹر سکندر!'' طویل القامت نوجوان نے ہانپتے ہوئے کہا ''پچھلی رات میرے ہاں چوری ہو گئی ہے۔ کسی خبیث نے میرے فلیٹ میں گھس کر ایک صندوق سے کچھ گھڑیاں اور زیورات وغیرہ چرائے ہیں۔ میں چور کا پتا چلانے کے لیے آپ کی خدمت حاصل کرنا چاہتا ہوں مسٹر سکندر! اگر آپ مجھے میرا مال واپس دلوا دیں تو میں آپ کی پوری فیس ادا کروں گا۔''

سکندر اعظم جس طرح منہ کھولے اور ساکت بیٹھے ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا، اس پر انور علی نے کچھ پریشان ہو کر اس کا کندھا ہلایا ''آپ میری بات سن رہے ہیں نا مسٹر سکندر؟''

تب سکندر کو احساس ہوا کہ اسے ایک سراغ رساں کے شایان شان طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ انور اسے پیٹنے نہیں بلکہ اس کی خدمات حاصل کرنے آیا ہے۔ اس نے منہ بند کیا، پھیلی ہوئی آنکھوں کو بہ مشکل سکیڑ اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو چھپانے کے لیے انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے میز پر جھک کر کہا۔

''اگر آپ کے ہاں چوری ہوئی ہے تو آپ نے پولیس کی خدمات کیوں حاصل نہیں کیں؟''

''آپ سے کیا پردہ سر سکندر!'' انور نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''میں لوگوں کی چیزیں رہن رکھ کر انہیں سود پر رقمیں ادھار دیتا ہوں۔ پولیس کے پاس گیا تو میں الٹا پھنس جاؤں گا۔ چیزیں واپس ملنا تو دور کی بات ہے، باقی چیزیں بھی ہاتھ سے نہ چلی جائیں۔ جو چیزیں چوری ہوئی ہیں وہ در حقیقت لوگوں کی امانتیں ہیں۔''

''ہوں۔'' سکندر اعظم نے کش مکش میں مبتلا نظر آنے کی اداکاری کی حالانکہ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوشی کے مارے میز پر چڑھ جائے اور فلموں میں دکھائی جانے والی کسی کلب ڈانسر کی طرح ڈانس شروع کر دے! بالآخر اس نے اپنی خواہش پر قابو پاتے ہوئے انور علی کو تمام تفصیلات بیان کرنے کا حکم دیا۔

لیکن انور علی نے جو کچھ کہا سکندر نے اس کا ایک لفظ بھی نہیں سنا۔ وہ اس وقت چونکا جب انور علی نے اس سے پوچھا ''آپ اس کیس کو حل کرنے میں کتنا وقت لیں گے؟''

''ایک عام سراغ رساں کو شاید اس میں ایک ہفتہ لگے لیکن میں چونکہ ایک عام سراغ رساں نہیں ہوں اس لیے مجھے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔'' سکندر نے نہایت بردباری سے جواب دیا۔

انور علی نے عقیدت بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور کہا ''مجھے بس چیزیں واپس مل جائیں۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ چور کو سزا ملتی ہے یا نہیں! کیونکہ پولیس کو اس معاملے کی ہوا لگ گئی تو چور کے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی نقصان دہ ہوگا۔''

''بے شک۔۔۔ بے شک۔۔۔'' سکندر اعظم نے تائید کی اور یہ کہتے کہتے رک گیا کہ پولیس کو اس معاملے کی ہوا لگنا خود اس کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔

دوسرے روز گیارہ بجے اس نے انور علی کو فون کیا کہ اس کا مسئلہ حل ہو گیا ہے اور وہ ان کے دفتر آ جائے۔ انور کے آنے سے پہلے سکندر نے تمام چیزیں میز پر پھیلا دیں اور اپنی کلائی سے بھی گھڑی اتار کر ان میں شامل کر دی۔ انور دفتر پہنچا تو میز پر

تمام چیزیں موجود پا کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"آپ یقیناً دنیا کے عظیم ترین سراغ رساں ہیں مسٹر سکندر اعظم!" اس نے کئی لمحے مبہوت رہنے کے بعد کہا۔

"بے شک۔" سکندر نے اس کی تائید کی اور میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمہاری چیزیں تو میں نے ڈھونڈ نکالی ہیں لیکن ان میں کسی اور کی بھی کچھ مسروقہ چیزیں مل گئی ہیں۔ تم اپنی چیزیں خود پہچان کر الگ کر لو۔"

انور نے سب سے پہلے وہی گھڑی اٹھائی جو سکندر کی تھی۔

"خبردار۔" سکندر نے چلا کر کہا "مجھے معلوم ہے اور تمہیں بھی معلوم ہے کہ یہ گھڑی تمہاری نہیں۔ اب اگر تم نے ایسی کوئی چیز اٹھائی جو تمہاری نہیں تو میں پولیس کو بلا لوں گا۔"

انور نے معذرت خواہانہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور نہایت احتیاط سے ایک ایک کر کے اپنی چیزیں اٹھانا شروع کیں پھر اس نے سکندر کی فیس ادا کی اور رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد سکندر نے میز کی طرف دیکھ کر گہری سانس لی۔

میز پر دو گھڑیاں، جن میں سے ایک اس کی اپنی تھی، تین نیکلس، دو جوڑی بندے اور ایک خوب صورت ہیئر کلپ پڑا رہ گیا تھا۔ انور علی نے ان پر اپنی ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ یہ یقیناً مصلح الدین کی بیوی کے زیورات تھے جو اس نے الماری کی نچلی دراز ہی میں رکھے ہوں گے۔ یہ بات بہرحال طے تھی کہ اب وہ دونوں میاں بیوی انہیں لینے کے لیے واپس آنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ خواہ انہیں معلوم بھی ہو جاتا کہ درحقیقت ہوا کیا ہے اور زیورات کہاں گئے؟ کون انہیں لے گیا؟

چنانچہ سکندر اعظم نے مس روزی مارٹن کو طلب کیا اور میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سکندر اعظم کی سی شان کے ساتھ کہا "تم ان میں سے کوئی ایک چیز بطور تحفہ منتخب کر سکتی ہو مس روزی! سراغ رسانوں کے ساتھ کام کرنے میں یہی عیش ہیں اور ہاں۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تم اس ماہ کی تنخواہ ایڈوانس میں لینا پسند کرو گی؟"

"اوہ۔۔۔ آپ کتنے اچھے ہیں مسٹر سکندر!" مس روزی نے قربان جانے والے انداز میں کہا۔

"تنخواہ میں تاخیر کی صورت میں بھی اپنی اس رائے پر قائم رہنا مس روزی۔" خوشی کے عالم میں سکندر اعظم کو مس روزی کے عاشقانہ انداز پر ناراضی کا اظہار کرنا بھی یاد نہ رہا۔

پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا "میں ذرا اس خان کے بچے کا حساب صاف کر آؤں۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ آج چھٹی ذرا جلدی کرنی ہے۔ اماں کو بھی تو اپنی پہلی کامیابی کی خوشی خبری سنانی ہے۔"

☆☆

حقیقت

ایک بار سکندر اعظم کے پاس فلسفی دیو جانس کھڑا تھا۔ سامنے بہت سی انسانی کھوپڑیوں اور ہڈیوں کا ڈھیر تھا اور فلسفی ان کے نظارے میں غرق تھا اس کے انہماک کو دیکھ کر سکندر اعظم نے پوچھا۔

"دیو جانس! کیا سوچ رہے ہو۔" دیو جانس نے جواب دیا۔

"حضور! میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ان میں آپ کے والد کی ہڈیاں بھی ہیں لیکن ان میں آپ کے والد اور ان کے غلاموں کی ہڈیوں میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔"

شہزادہ بدبخت...

کاشف زبیر

دنیا میں "فنکاروں" کی کمی نہیں ہے سیر کو سوا سیر ضرور ملتا ہے جلیل جیسے "فنکار" کو ملنے والے ایک نئے "فنکار" کا قصہ وہ شہر بھر کے ہوٹلوں میں مفت کھانا کھانے کا ماہر تھا۔

آپ کے جانے پہچانے مشہور کردار جلیل کے ساتھ پیش آنے والا دلچسپ واقعہ

لنچ کے باضابطہ خاتمے کا اعلان میں نے ایک ڈکار سے کیا اور اٹھا ہی تھا کہ سامنے شہزادہ بدبخت کو دیکھ کر نہ صرف خود بیٹھ گیا بلکہ میرا دل بھی بیٹھ گیا تھا۔ آج کے دن کا آغاز نہایت خوش گوار رہا تھا۔ اماں نے مجھے گیارہ بجے اٹھا کر نہایت محبت سے ناشتا کرایا اور اس کے بعد ایک عدد تھیلا دے کر سبزی منڈی روانہ کر دیا۔ میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ آخر ایک دن مجھے آدمی سے شوہر بن کر یہی سب کرنا تھا لہٰذا مشق لازمی تھی۔ جب گھر واپس آیا تو شنو اماں کا ہاتھ بٹانے کے بہانے میرا انتظار کر رہی تھی۔ موقع پاتے ہی وہ میرے کمرے میں آتی اور ایک تھیلا میرے حوالے کیا "یہ میں تمہارے لیے لائی ہوں۔"

میں نے تھیلا کھولا اندر سے ایک ٹی شرٹ برآمد ہوئی تھی۔ اس پر تجریدی آرٹ کے ناقابل فہم نمونے بنے ہوئے تھے اور میں نے اس قسم کی شرٹس امریکا کے حبشیوں کو پہنے دیکھا تھا۔ اس کا سائز بھی کسی حبشی والا تھا لیکن بہرحال یہ میری محبوب دلنواز کا تحفہ تھا۔ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر بطور شکریہ ایک ہلکی سی گستاخی کی جس پر شنو نے برہم ہو کر بالوں والے برش کی مضبوطی میرے سر پر آزمانے کی کوشش کی تھی۔ اپنے سر اور برش دونوں کو صحیح سلامت پا کر میں نے خدا کا شکریہ ادا کیا۔ "یہ کیا بے ہودگی ہے۔" شنو نے لال ہو کر کہا۔ بالکل ٹی شرٹ کے خونی رنگ کی طرح۔

"وہی جو تم چاہتی تھیں۔" میں نے اسے ڈانٹا "آخر یہ چیز تم اسی لیے لائی ہو۔ اس کا ڈیزائن دیکھو اور اوپر سے رنگ۔ اسے دیکھ کر آدمی کے جذبات میں خواہ مخواہ ابال آ جاتا ہے۔ یہ شرٹ تم غالباً یہی سوچ کر لائی تھیں کہ میں جذباتی ہو کر۔۔۔"

"جلیل۔" شنو نے کھا جانے والی نظروں سے الماری کو گھورا تھا "کیوں میرے ہاتھوں قتل ہونا چاہتے ہو۔"

"خوں خوار حسینہ، عرف سنگ دل لڑکی۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا "تمہارے اندر رومانی حس اتنی بھی نہیں پائی جاتی جتنی کہ بھینس میں عقل یا اس کے دودھ میں دودھ کا تناسب ورنہ میری حرکت کے جواب میں تم بھی اسی قسم کی کوئی حرکت کر سکتی تھیں۔ برش سر پر مارنا قطعی غیر رومانی حرکت تھی۔" یہ کہتے ہی میں فوراً کمرے سے نکل آیا ورنہ شنو سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کر گزرے۔ سر پر ایک عدد



گومڑ نکل آنے کے باوجود دن میرے لیے بدستور خوش گوار تھا۔ ایک عدد ٹی شرٹ ملی تھی شنو سے گستاخی بونس میں تھی۔ مزید خوش قسمتی کا یقین اس وقت آیا جب اماں سے سو روپے مانگے اور انہوں نے صرف دس منٹ کے ایک لیکچر کے بعد سو روپے دے بھی دیے لیکن ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی کہ وہ دوپہر کے کھانے میں کریلے پکانے جا رہی تھیں۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ لنچ بمبئی بریانی والے کے ہوٹل میں کرنا ہے۔

کیفے ڈی پھونس میں موجود راجا اتنا خوش وخرم اور مطمئن نظر آیا کہ مجھے شبہ ہونے لگا کہ اس کے ستم ظریف باپ نے اسے کچھ کھلا پلا تو نہیں دیا ہے۔ خود راجا نے صرف چرس پی تھی اور اب اس سے بھی تائب ہو چکا تھا۔ پینے کو خون جگر بہت تھا۔

"راجا خیریت آج تو مجھے خلاف معمول نظر آ رہا ہے۔"

میں نے کڑک چائے کے کسیلے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

"میں بچ گیا میرے دوست۔" راجا نے مسرت سے بغلیں بجاتے ہوئے کہا "میرا باپ میرے پلے جو بھینس باندھنے جا رہا تھا میں اس سے بچ گیا۔"

"میں نے سکون کا سانس لیا۔ یعنی یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔"

"رشتہ تو نہیں انجمن کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔" راجا نے کہا "اب وہ چھ مہینے کے لیے بستر سے تو نہیں اٹھ سکتی۔ اس لیے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

مجھے غصہ آنے لگا" راجا معاملہ ختم کیسے ہو... گدھے...۔"

"ہاں گدھے نے ہی دولتی ماری تھی۔" راجا نے میری بات سنے بغیر کہا" کم بخت مجھے دیکھ کر گدھی کی طرح شرما رہی تھی۔"

میں نے دانت پیسے" ظاہر ہے تجھے دیکھ کر وہ گدھی کی طرح شرما سکتی تھی۔ تو اپنے باپ کو نہیں جانتا۔ ممکن ہے وہ اسپتال میں ہی تیرا حجلہ عروسی بنا دے۔"

"ابا تو واقعی ایسا کرنے جا رہا تھا۔" راجا نے اعتراف کیا" لیکن وہ جو میرا ہونے والا سسر ہے۔ اس نے کہہ دیا کہ جب تک انجمن فلمی انجمن کی طرح چھلانگیں لگانے کے قابل نہیں ہو جاتی، یہ شادی نہیں ہو سکتی ہے۔"

"اس پر تیرے دانت آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔" میں نے جل کر کہا" تو بری نہیں ہوا ہے زیادہ سے زیادہ ضمانت پر رہا ہوا ہے۔ جو کسی وقت بھی منسوخ ہو سکتی ہے۔"

"چھ مہینے سے پہلے کوئی امکان نہیں ہے۔" راجا نے اعتماد سے کہا" جیسے وزیر خزانہ پورے اعتماد سے کہتے ہیں کہ ملک کے دیوالیہ ہونے کے کوئی امکانات نہیں ہیں۔"

"اور اس کے بعد۔" میں نے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا۔

"گدھا موجود ہے نا۔" راجا کے منہ سے نکلا۔

میں نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ "گدھا دوبارہ کیا کرے گا۔ کیا اس کی دوسری ٹانگ توڑ دے۔ مجھے صاف صاف بتا کر تو کیا کر رہا ہے۔"

راجا کے لیے مجھ سے کوئی بھی بات چھپانا اتنا ہی دشوار تھا جتنا کہ دائی سے پیٹ چھپانا۔ آخر اس نے اگل دیا کہ گدھے کی دولتی میں جتنا قصور گدھے کا تھا اتنا ہی اس کا بھی تھا۔ میں دم بہ خود رہ گیا۔

"کیا مطلب، یعنی تو نے گدھے کو آمادہ کیا تھا کہ وہ دولتی مار کر انجمن کی لات توڑ دے کیسے؟"

"اس کا کان مروڑ کر۔" راجا نے قہقہہ مارا" اگر تو گدھے کا کان مروڑے گا تو وہ احتجاجاً دولتی تو مارے گا ہی۔"

میں نے غور کیا" چھ مہینے بعد تو انجمن کی دوسری ٹانگ توڑ دے گا۔ کیا اس کے بعد وہ ہوشیار نہیں ہو جائے گی۔ اگر اسے تیری خباثت کا پتا چل گیا تو وہ گدھے کی مدد کے بغیر بھی تیری ٹانگ توڑ سکتی ہے تو بلا وجہ بغلیں بجا رہا ہے۔ اس طرح تو زیادہ سے زیادہ ایک سال اس سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس کے بعد تجھے اس ٹرک کے پہیے کو اپنی زوجیت میں قبول کرنا ہی پڑے گا۔"

"دیکھا جائے گا۔" راجا بے فکری سے بولا" ایک سال بہت ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے فلم انڈسٹری میں کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔ آخر بعض جاں بلب مریض ڈاکٹر کی پیش گوئی کو غلط کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جس طرح اکثر مریض ڈاکٹروں کے یقین کو غلط ثابت کرنے کے لیے بلا وجہ جاں بہ حق ہو جاتے ہیں۔ فلمیں دوبارہ بننے لگیں اور عوام سینما کا رخ کرے جیسے سال کے سال بکرا پیڑی جاتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے امریکا کا ویزا مل جائے یا میری لاٹری نکل آئے اور فرشتہ اجل کی فہرست میں میرے باپ کا نام شامل ہو جائے جو اس سارے فساد کی جڑ تھا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے کی بانسری۔"

میں نے راجا کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے اسے بتایا کہ فلم انڈسٹری تو نہیں البتہ انجمن جلد اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی۔ وہ والی انجمن نہیں جو فلموں کی کمائی پر عیش کر رہی ہے۔ وہ انجمن جو مستقبل میں اس کی ازدواجی زندگی کی فلم میں ولن کا کردار ادا کرے گی۔ اسے امریکا کا ویزا نہیں ملے گا بلکہ وہ بغیر کسی ویزے کے اندر چلا جائے گا۔ اس کے باپ کا نام فرشتہ اجل کی فہرست میں آئے نہ آئے بہت جلد اس کا نام نکاح خواہ کی فہرست میں آ جائے گا اور بانسری نہیں بلکہ اس کا بینڈ بجے گا۔

جب میں کیفے ڈمی پھونس سے رخصت ہو رہا

تھا تو راجا کی خوش دلی وطن عزیز سے حب الوطنی کی طرح رخصت ہو چکی تھی اور وہ پارلیمانی زبان استعمال کر رہا تھا۔ ظاہر ہے فتو کے ڈیک کی آواز میں اس کا شور وغوغا رائگاں ہی گیا تھا۔ راجا سے جھگڑے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ میرے ساتھ نہ لگ جائے۔ وہ اس قسم کے معاملوں میں کتے کی سی حس رکھتا تھا۔ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ میں بمبئی بریانی کھانے جا رہا ہوں تو وہ میرے ساتھ جائے بغیر نہ رہتا۔

خوش قسمتی سے مجھے عین لنچ کے وقت ایک خاص میز بھی مل گئی لیکن ساری خوش قسمتی اس وقت ملیا میٹ ہوتی نظر آئی جب میں نے اپنے سامنے شہزاد بد بخت کو بیٹھے دیکھا۔ نام تو اس کا شہزادہ بخت تھا۔ جو پہلے اس کو دیکھتے ہوئے شہزادہ بخت بنا۔ وہ واقعی شکل وصورت اور حلیے سے شہزادہ نظر آتا تھا۔ سرخ وسفید رنگ اور بے حد معصوم نقوش اوپر سے سنہری بال جو اکثر بکھرے رہتے تھے۔ شخصیت میں شاہانہ وقار اس نے خود پیدا کر لیا تھا۔ کوئی بھی ملنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ موصوف کا دھندا تھا ادھار لے کر کبھی واپس نہ کرنا۔ اس کے علاوہ بھی اس میں ایسی کافی خصوصیات تھیں جن کی بنا پر وہ شہزادہ بد بخت کہلانے لگا تھا۔

کوئی چار سال پہلے کی بات تھی۔ میں جس ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا۔ شہزادہ بد بخت بھی وہاں موجود تھا اور اطمینان سے کھانے کے بعد اس نے منیجر کو بلا کر اطلاع دی کہ بد قسمتی سے وہ پرس گھر بھول آیا تھا اور اب اس کے پاس بل ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ یہ سن کر منیجر نے اسے مطلع کیا کہ ایسے غائب دماغی کے مریضوں کے ساتھ وہ کچھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ منیجر نے کئی مثالیں بھی دی تھیں کہ ہوٹل کے بیروں نے فلاں فلاں مواقع پر اس قسم کی صورت حال میں ان غائب دماغ مہمانوں کے ساتھ کیا کیا تھا۔ مجھے اس کی ڈھٹائی پر رشک آیا جب اس نے ذرا بھی ہراساں ہوئے بغیر اطمینان سے کہا ”آپ مجھے مہلت دیجیے۔ میں کل تک آپ کا بل ادا کروں گا۔“

منیجر نے جواب دیا ”دیکھیے، میں دو بیویوں کا شوہر ہوں اور یقیناً اس وجہ سے خاصا احمق نظر آتا ہوں گا لیکن درحقیقت میں اتنا احمق نہیں ہوں۔ کل آپ تشریف ہی نہ لائے تو۔“

منیجر سچ مچ اتنا احمق نہیں تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ شہزادہ بد بخت کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے ضبط کر کے وہ بل وصول کرنے کی ضمانت حاصل کر سکتا۔ سوائے اس تھری پیس سوٹ کے جو شہزادہ بد بخت نے پہن رکھا تھا اور ظاہر ہے وہ سوٹ نہیں اتروا سکتا تھا۔ شہزادہ بد بخت کا رویہ اتنا پرسکون تھا اور وہ شکل سے اس قدر معزز نظر آتا تھا کہ منیجر کے لیے اس کے ساتھ وہ سلوک کرنا دشوار تھا جو وہ عموماً اس قسم کے گاہکوں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ اس کی دیکھنے والی صورت پر بالآخر مجھے ترس آ گیا اور میں نے اسے بلایا ”بل کتنا ہے؟“

”دو سو پچھتر روپے۔“ اس نے خفگی سے کہا ”اب تو یہ رقم میری تنخواہ سے کٹے گی۔“

”اس کا بل مجھ سے لے لو۔“ میں نے کہا۔ ایک تو میں ذرا سخاوت کے موڈ میں تھا اور دوسرے اس ہی دن ایک سودے میں مجھے خاصا نفع ہوا تھا۔ منیجر کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے فوری طور پر مجھ سے دونوں بل وصول کر لیے۔ اس کے بعد شہزادہ بد بخت اٹھ کر میری میز تک آیا اس نے نہایت شاہانہ لہجے میں میرا شکریہ ادا کیا۔ چرب زبان اتنا تھا کہ میں نے نہ صرف اسے چائے پلائی بلکہ وہ جاتے ہوئے مجھ سے سو روپے بھی لے گیا تھا۔ کل ادا کرنے کے وعدے پر۔ یہ تو مجھے اس کے جانے کے بعد یاد آیا کہ میں اس کے پتے ٹھکانے سے واقف نہیں تھا اور نہ ہی اس نے مجھ سے میرا پتا لیا تھا۔ گویا سو کے نوٹ پر بھی فاتحہ پڑھ لوں۔

شہزادہ بد بخت سے اگلی ملاقات ایک نہایت غیر متوقع جگہ ہوئی تھی۔ یعنی تھانے میں، نادر شاہ نے جن حضرات کو اشرف المخلوقات کے عہدے سے گرا

لر پرندوں کے عہدے پر فائز کر دیا تھا ان میں شہزادہ بدبخت بھی شامل تھا۔ آسان الفاظ میں مرغا بنا اپنی ٹانگوں سے دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ میں نادر شاہ کے ہا ...ے پر تھانے آیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس یاد آوری کا سبب کیا ہے لیکن میں اپنی سلامتی کے لیے ...ت متفکر تھا۔ نادر شاہ سے کچھ بعید نہیں تھا۔ حوالات ...ں پہلے ڈال دے اور قصور بعد میں بتائے یا نہ بھی ... تو کیا فرق پڑتا ہے۔

''اس۔۔۔ کو جانتے ہو۔'' نادر شاہ نے خالی ...ی مہارت سے گالی فٹ کرتے ہوئے مرغ ...کی طرف اشارہ کیا۔ دیوار کے ساتھ قطار میں ...دہ آدمی مرغا نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہے ...الہ جس کی تشریف ذرا بھی نیچے جاتی تھی۔ ...کر پر تیرہ نمبر کا لتر برداشت کرنا پڑتا تھا۔

''شاہ جی، صرف کمر دیکھ کر بندہ پہچاننے کا فن ...ہیں آیا۔'' میں نے انکساری سے کہا۔

''بہت چہک رہے ہو۔'' نادر شاہ نے غرا کر کہا ...زادہ بدبخت کے شجرہ نسب میں اپنی خاندانی ...اُلتے ہوئے اسے انسانوں کی طرح سیدھا ...نے کو کہا لیکن خاصی دیر تک وہ سرنگوں رہنے ...بعد فوری طور پر سیدھا نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے ...بے ساختہ ہی میرے منہ سے نکلا۔ شہزاد بخت اور میں فوراً ...لگا تھا۔

''یعنی تم اس سے واقف ہو۔'' نادر شاہ نے معنی ...از میں کہا۔

...میری تردید رائگاں ہی گئی کہ میں شہزادہ ...سے صرف ایک بار ملا تھا۔ وہ بھی صرف دس ...لیے اور وہ مجھے بھی ٹھگ کر لے گیا تھا۔ نادر ...اس کے بارے میں سنسنی خیز بیان جاری ...ہوئے اسے میری برادری کا فرد قرار دیا اور ...اس لمحے کو کوسنے لگا جب میں نے جذبہ حماقت ...مجبور ہو کر اس بدبخت کی مدد کی تھی۔ مجھے اپنی ...ت خطرے میں لگ رہی تھی لیکن خوش قسمتی ...اسی لمحے ہنگامی طور پر تھانے میں ڈی ایس پی کی آمد ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ خاص ملزمان لایا تھا جنہیں پولیس نے آف دی ریکارڈ گرفتار کیا تھا۔ انہیں تھانے میں خفیہ طریقے سے رکھنے کے لیے ڈی ایس پی کے حکم پر باقی ملزمان کی چھٹی کر دی گئی جن میں، میں بھی شامل تھا۔

اس کے بعد وقفے وقفے سے میری اور شہزادہ بدبخت کی ''اتفاقیہ'' ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اتفاق سے جب اسے کچھ رقم کی اشد ضرورت پیش آتی تھی۔ وہ نہایت خلوص سے وعدہ کرتا کہ لی جانے والی رقم وہ اگلے روز لوٹا دے گا لیکن یہ اگلا روز کبھی نہیں آیا۔ اسے قرض یاد دلانا یا شرمندہ کرنا بھی بے کار تھا۔ وہ پورے اعتماد اور سکون سے اگلے روز کا وعدہ کر لیتا تھا۔ آخری بار میں نے اسے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پرتکلف ڈنر کرتے دیکھا تھا اور اس خبیث نے مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں میری تشریف آوری کی وجہ ایک الگ کہانی ہے۔

☆☆☆

میں نے غصے کی آگ پر ایک گلاس پانی ڈالا اور شہزادہ بدبخت سے کہا ''تمہیں ہمت کیسے ہوئی میرے سامنے آنے کی کمینے، مردود۔۔۔'' آگے کی گالیاں سنسر کی زد میں آسکتی تھیں۔

وہ یوں اطمینان سے مسکراتا رہا جیسے میں اس بدبخت کی مدح سرائی کر رہا تھا۔ بالآخر میں بک جھک کر خاموش ہوا تو اس نے اطمینان سے کہا ''مجھے معلوم ہے تو کیوں ناراض ہے پر یار وہ موقع ہی ایسا تھا وہاں میں ایک غیر ملکی بن کر گیا تھا۔ اب تو بتا کہ کوئی اسپینش بھلا تیرا دوست کیونکر ہوسکتا ہے۔''

''بکواس نہ کر، تو ذرا بھی اسپینش نہیں لگ رہا تھا۔'' میں نے غرا کر کہا ''اب تو فوراً سے پیشتر یہاں سے دفع ہوجا اس سے پہلے کہ میں تجھے قتل کر کے یہاں سے فرار ہوجاؤں۔''

''بدقسمتی سے ہوٹل والوں کو بھی میں اسپینش نہیں لگا تھا۔ جب میں نے قورمے میں سے فلائیو

برآمد کی تھی۔'' اس نے اعتراف کیا۔ میں نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔
''یہ فلائیو رشتے میں تمہارے ننھیال سے آئی ہے یا ددھیال سے؟''
''میرا خیال تھا کہ اسپینش میں مکھی کو فلائیو کہتے ہیں۔''
''اور ہوٹل والوں نے تمہارے خیال سے اتفاق نہیں کیا ہوگا۔'' میں نے طنز کیا ''انہوں نے سچ مچ کوئی اسپینش زبان بولنے والا ڈھونڈ نکالا ہوگا۔''
شہزادہ بدبخت نے سرد آہ بھری ''وہ بدبخت نہ صرف اسپینش بلکہ شاید دنیا کی بیشتر زبانیں جانتا تھا جن میں پولیس کی مخصوص زبان بھی شامل ہے۔''
''جو وہ اپنے تھانے کے ڈرائنگ روم میں مبینہ ملزمان سے بولتے ہیں تو وہ جلد یا بدیر مجرم ہونے کا اعتراف کرلیتے ہیں۔''
میں نے کہا تو اس نے سر ہلایا ''اس خبیث نے ہوٹل کے جمنازیم میں مجھے پنچنگ بیگ کی جگہ استعمال کیا تھا۔ ذرا سوچ اگر اس وقت تو میرے ساتھ ہوتا تو کیا اس کی ضرب کلیم سے بچ سکتا تھا۔ وہ تو منیجر کے دل میں رحم آگیا تھا ورنہ وہ مجھے فوت کیے بغیر نہ رہتا۔''
میں نے دل ہی دل میں رحم دل منیجر کو کوسا ''سب منیجر اتنے رحم دل نہیں ہوتے۔''
''مجھے معلوم ہے اس لیے اب میں سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر جاتا ہوں۔''
اس وقت شہزادہ بدبخت نے سیاہ رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا جو غالباً پیرس کے درزی نے سیا تھا۔ وہ اکثر اس قسم کے کپڑوں میں نظر آتا تھا۔ نہ جانے کیسے اسے اس قسم کے قیمتی کپڑے مل جاتے تھے۔ ممکن ہے یہ بھی ادھار کے ہوں۔ ان کپڑوں کی وجہ سے اس کا تاثر ایک رئیس زادے کا بن جاتا تھا اور اچھے خاصے عقل مند لوگ اس کے جھانسے میں آجاتے تھے۔ خاکسار کی مثال کافی ہے۔ اس وقت بھی وہ حلیے سے ایک امیرزادہ معلوم ہو رہا تھا جسے صرف یہ فکر ہو کہ باپ کی محنت کی کمائی کس طرح ٹھکانے لگائے حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ اس کی جیب میں اتنے روپے بھی نہیں ہوں گے کہ وہ چائے پی سکے۔ میں نے جلدی سے کہا۔
''دیکھ بے نام نہاد شہزادے، اس وقت میں ادھار دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔''
''ادھار کون مانگ رہا ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا ''بلکہ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اب تیرا ادھار واپس کر ہی دوں۔''
میں بھونچکارہ گیا۔ ''سچ مچ۔۔۔ یعنی تو درحقیقت میری رقم واپس کرنا چاہتا ہے۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے۔''
ہاں، یہ کوٹ دیکھ رہے ہو نا؟''
''میری نظر بالکل ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا'' اور مجھے یہ کوٹ بالکل صاف نظر آرہا ہے۔''
''یہ میرا نہیں ہے۔'' اس نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔
''اچھا۔'' میں نے تعجب ظاہر کیا ''کیا یہ بھی ادھار لیا ہے۔''
اس نے کوٹ کی جیب سے ایک قیمتی چرمی بٹوا نکالا جو نوٹوں سے خاصا وزنی ہو رہا تھا۔ اس نے تین عدد سرمئی نوٹ نکالے۔ ''مجھے حساب کتاب تو صحیح یاد نہیں ہے لیکن کل رقم شاید اتنی ہی بنتی ہوگی۔'' اس نے کہا۔
نوٹ لیتے ہوئے میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ میرا کل دو ہزار چار سو بیس روپے کا مقروض تھا۔ نوٹ اصلی ہی تھے۔ اب مجھے شبہ ہونے لگا کہ شہزادہ بدبخت کے بخت جاگ اٹھے تھے۔ اس نے کوئی لمبا ہاتھ مارا تھا۔ میں نے رشک سے کہا'' لگتا ہے تیرے نصیب بدل گئے ہیں۔''
''نصیب نہیں کوٹ بدل گیا ہے۔''
''کوٹ بدل گیا۔'' میں تیسری بار دنگ رہ گیا'' کیسے راہ چلتے؟''
''یہ میں تجھے ایک اور جگہ چل کر بتاؤں گا۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا ''وہاں کی چائے اچھی ہوتی ہے اور کنفیکشنری کا تو جواب ہی نہیں ہے۔''
تھوڑی دیر بعد ہم زیب النساء اسٹریٹ کے

ایک ہائی کلاس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ شہزادہ بدبخت نے شاہانہ انداز میں چائے کا آرڈر دیا اور مجھ سے کہا "میری خوش قسمتی ہے کہ اس کوٹ کی جیب میں اتنا بھرا ہوا بٹوا تھا ورنہ میں اس وقت حوالات میں ہوتا۔ پرانے کوٹ میں میرا کل اثاثہ تھا۔"

"کل اثاثہ۔" میں نے متاثر ہو کر کہا "خاصی رقم ہوگی۔"

"رقم۔۔۔ رقم تو نہیں تھی۔" وہ بولا "ایک ماچس کی ڈبیا تھی۔"

"ماچس کی ڈبیا۔" میری عقل خبط ہونے لگی "تیرا کل اثاثہ ماچس کی ایک ڈبیا تھی۔ اس میں کل کتنی تیلیاں تھیں؟"

"ایک بھی نہیں۔" اس نے اطمینان سے کہا "اس میں ایک لال بیگ، پانچ مری ہوئی مکھیاں اور ایک چیونٹا تھا۔"

میں غالباً چوتھی بار دم بہ خود رہ گیا تھا "یہ تھا تمہارا اثاثہ؟" میں نے تقریباً چلا کر کہا۔

"ہاں فائیو اسٹار ہوٹلوں اور ریستورانوں میں یہی میرا اثاثہ ہوتا ہے۔" اس نے کہا تو بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔

"لال بیگ، مکھیاں اور چیونٹے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا "تمہارا اثاثہ تو ہر جگہ مل جائے گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ لال بیگ، مکھی یا چیونٹا میرے کام نہیں آتا۔ میں انہیں خاص طور پر تیار کرتا ہوں۔"

میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا "وہ کیسے؟"

"میں لال بیگ اور مکھیوں کو کھولتے پانی میں ابال لیتا ہوں۔" اس نے وضاحت کی "اس طرح وہ خوب اچھی طرح پکے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔ دراصل یہ ہوٹلوں والے بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ ایک بار ایک ہیڈ ویٹر نے تاڑ لیا تھا کہ مکھی بالکل تازہ ہے اور ابھی ابھی شوربے میں ڈالی گئی ہے۔ اس منحوس کی تیز نظر کی وجہ سے مجھے دو دن حوالات میں گزارنا پڑے۔"

میں پہلی بار شہزاد بدبخت سے متاثر ہوا تھا۔ وہ واقعی فنکارانہ صلاحیتیں رکھتا تھا۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اچھی طرح کھا پی کر میں موقع پاتے ہی مکھی یا لال بیگ کھانے میں اس طرح شامل کر دیتا جیسے یہ کچن سے ہی آیا ہو اور پھر کسی چیز کے آرڈر کے بہانے ویٹر کو بلاتا اور اس کے سامنے اتفاق سے مکھی دریافت کر لیتا۔ اس کے بعد ایسا ظاہر کرتا کہ مکھی یا لال بیگ دیکھ کر مجھے دل کا دورہ پڑنے والا ہو یا میرا سب کھایا پیا ڈائننگ ہال میں ہی باہر آنے والا ہو۔ میں بلند آواز میں واویلا مچاتا اور منیجر کو بلانے کا مطالبہ کرتا لیکن اس طرح کہ دوسرے لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہ آئے۔"

"ظاہر ہے ہوٹل والے دوسروں سے چھپانے کے لیے تیرا منہ بند رکھتے ہوں گے۔"

"منیجر کے آنے پر میں اس پر برس پڑتا کہ یہ کس قسم کا ہوٹل ہے اور یہاں گاہکوں کو بریانی اور قورمے میں کیا ڈال کر کھلایا جاتا ہے۔ منیجر کے ہاتھ پیر پھول جاتے اور وہ خوشامد پر اتر آتا۔ آخر وہ پیش کش کرتا کہ میں بے شک کھانے کا بل نہ دوں۔ میں اسے آگاہ کرتا کہ بل تو میں ویسے بھی نہیں دوں گا لیکن اس واقعے کی رپورٹ ضرور کروں گا۔ میرے چچا ایک صحافی ہیں۔ میں ان کا حوالہ دیتا تو منیجر کی حالت بالکل ہی غیر ہو جاتی اور وہ مجھے ہرجانہ دینے پر آمادہ ہو جاتا۔ دو چار ہزار میں جان چھوٹ جانے پر خدا کا شکر ادا کرتا۔"

"کوئی اتنی آسانی سے بے وقوف نہیں بنتا۔" میں نے شک سے کہا۔

"تو نے صحیح کہا لیکن معاملہ ایسا تھا کہ ان کی گوٹ پھنس جاتی تھی اور اگر وہ مجھ پر شک کرتے تو میں شور مچا دیتا۔ انہیں لینے کے دینے پڑ جاتے۔ بات دوسرے گاہکوں تک جا پہنچتی۔ وہ اس معیار کے ہوٹل اور ریسٹورنٹ ہوتے ہیں کہ انہیں اپنی ساکھ زیادہ عزیز ہوتی ہے بہ نسبت معمولی سے بل اور معمولی سے رقم کے۔"

"یعنی ہر بار تیرا سر کڑاہی۔۔۔ انگلیوں گھی میں

ہوتی ہیں۔" میں نے رشک سے کہا۔

وہ ہنسا "ہر بار تو نہیں بعض اوقات معاملہ الٹ بھی جاتا ہے۔ ایک بار بد قسمتی سے برابر والے گاہک نے مجھے شوربے میں مکھی ڈالتے دیکھ لیا تھا اور جب میں نے ویٹر کو بلایا تو اس کمبخت نے دخل در معقولات کرتے ہوئے میرا بھانڈا عین چوراہے پر پھوڑ دیا۔ میں نے اس پر اسے بھی خاصی سنائیں اور اسے انتظامیہ کا ٹٹو قرار دیا جو گاہکوں کے ساتھ اس دھوکے بازی میں ملوث تھا مگر وہ بھی ایک خبیث تھا کہنے لگا "اس کی تلاشی لو، اس نے جیب میں کچھ نہ کچھ چھپا رکھا ہوگا۔"

"اور تیرا اثاثہ پکڑا گیا۔" میں نے کہا۔

"ضبط ہوگیا۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری "لیکن زیادہ برا میرے ساتھ ہوا تھا انہوں نے مار مار کر مجھے پاپڑ بنا دیا تھا۔ بس اتنا کرم کیا کہ پولیس کے حوالے نہیں کیا۔"

"یہ کوٹ تیرے ہاتھ کہاں سے لگا؟ میں نے دریافت کیا "جس نے تجھے حاتم طائی ثانی بنا دیا ہے۔"

"اس نے پیار سے کوٹ پر ہاتھ پھیرا "یہ ذرا لمبی کہانی ہے۔"

"تو اور چائے کا آرڈر دے ساتھ میں کچھ بسکٹس وغیرہ بھی ہوں۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

بادل ناخواستہ شہزادہ بدبخت نے مزید چائے اور بسکٹ کہا۔ اسے میری خاطر تواضع مہنگی پڑنے لگی تھی۔ اس ریستوران میں سب کچھ مہنگا ملتا تھا۔ چائے کو اس نے خون جگر کی طرح پینے اور بسکٹ کو کلیجے کی طرح چباتے ہوئے کہا۔

"کل تک میری حالت ملک کی اقتصادی حالت سے بھی زیادہ خراب ہوگئی تھی اور دو دن سے میرے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تھا۔ کم از کم کوئی معقول چیز نہیں گئی تھی۔ ایک تو ان جگہوں کی تعداد تیزی سے کم ہو رہی ہے جہاں میں جا سکتا ہوں۔ ظاہر ہے ایک ہی جگہ ایک ہی ڈراما کرنے کا مطلب میری وفات حسرت آیات بھی نکل سکتا تھا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "اس کی حسرت واقعی بہت سارے لوگوں کو ہوگی۔"

اس پر شہزادہ بدبخت نے خاصی غلط نظروں سے مجھے گھورا اور اپنی کہانی جاری رکھی۔ "اتفاق سے میری نظر حال ہی میں کھلنے والے ایک ہوٹل کے اشتہار پر پڑی اور میں نے اسے رات کے ڈنر کے لیے منتخب کر لیا۔ ڈنر کا وقت یوں بھی موزوں رہتا ہے کہ روشنی کم ہونے کی وجہ سے کسی کو میری کارروائی کا پتا نہیں چلتا۔ دوسرے اس وقت رش بھی اچھا خاصا ہوتا ہے۔ عام طور سے ہوٹل والے میرا منہ بند کرنے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن جب میں شام آٹھ بجے ہوٹل میں داخل ہوا تو وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ چاروں طرف آئینے لگے ہوئے تھے اور فرش پر گری سوئی بھی صاف نظر آ سکتی تھی۔ کم بختوں نے ڈائننگ ہال بال روم بنا دیا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے کافی کا آرڈر دیا لیکن نو بجے بھی وہی صورت حال رہی پورے ہال میں شاید چار افراد تھے مجھ سمیت اور بھوک سے میرا برا حال تھا۔ ہال میں چکراتی اشتہا انگیز خوشبوئیں میرے صبر کو آزما رہی تھیں۔ بالآخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔"

"اور تو نے چکن قورمے کا آرڈر دے دیا۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"ہاں ساتھ میں فرنچ رائس بھی تھے۔ میٹھے میں فروٹ کسٹرڈ تھا اور آخر میں کافی پیٹ بھر کر کھانے کے بعد میں نے اپنی جیب سے لال بیگ اور مکھی والی ماچس کی ڈبیا نکالی۔ اسی لمحے ایک فیملی ہال میں داخل ہوئی جس کے ساتھ چند خبیث قسم کے بچے تھے۔ وہ میری برابر والی میز پر آئے تھے۔ ایک بچہ جو کسی ہاتھی کا بچہ لگتا تھا میرے برابر سے گزرتے ہوئے میری کرسی سے ٹکرایا۔ میں فرش پر گرتے گرتے بچا تھا اور یہیں سے ساری خرابی کا آغاز ہوا۔ ماچس میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گری اور اس ہاتھی کے بچے کی ٹھوکر سے برابر والی میز تلے چلی گئی پھر وہ خاندان اسی میز پر براجمان ہوگیا تھا تو سوچ سکتا ہے کہ میری

کیا حالت ہوئی ہوگی۔"

"تو اطمینان سے جاتا اور معذرت کر کے واپس اٹھالاتا۔" میں نے کہا۔

"یہی تو مجھ سے نہیں ہوسکا تھا۔ اچانک میرے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔" اس نے اعتراف کیا۔ "میں یہ سوچ کر پریشان تھا کہ اب کیا کروں۔ بل کیسے ادا کروں۔ میرا مطلب ہے کہ بل سے کیسے جان چھڑاؤں۔ پورے ہال میں کم بخت ایک بھی مکھی نہیں تھی جسے میں پکڑ کر سالن میں ڈال سکتا۔ لال بیگ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر گزرتے لمحے میری حالت غیر ہو رہی تھی لیکن میں کھائے جا رہا تھا اگر میں کھانا روک دیتا تو ویٹر نازل ہو جاتا۔ برتن اٹھانے کے لیے۔ میں کوئی ترکیب سوچ رہا تھا جس کی مدد سے ماچس کی ڈبیا واپس حاصل کر سکوں۔ میرے دماغ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ کوئی ترکیب بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔"

"ناقص چیز کا یہی نقصان ہوتا ہے۔" میں نے تبصرہ کیا "عین موقع پر جواب دے جاتی ہے۔"

شہزاد بدبخت نے خفگی سے مجھے دیکھا "اگر تو ہوتا اس موقع پر تو عقل بھی جواب دے جاتی۔ خیر میں نے سوچا کہ چپکے سے جا کر ماچس کی ڈبیا اٹھالاؤں۔"

"چھ سات افراد کے سامنے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

شہزاد بدبخت نے خون کے گھونٹ پی کر کہا "اتنی عقل باقی رہی تھی۔ میں نے اپنی انگوٹھی انگلی سے نکال کر گرادی اور وہ لڑھکتے ہوئے میز کے نیچے چلی گئی۔

"چل تو نے اس بہانے ماچس کی ڈبیا واپس حاصل کر لی۔"

"یہی تو نہیں ہوا۔" شہزادہ بدبخت نے سرد آہ بھری "انگوٹھی لڑھک کر ایک اور میز تلے جا پہنچی تھی۔ میں نے جا کر میز والوں سے معذرت کر کے انگوٹھی اٹھائی اور آ کر غلطی سے دوبارہ گرادی۔ اس بار انگوٹھی صحیح میز تلے گئی لیکن غلط سمت میں۔ انگوٹھی خاتون خانہ کے پائے مبارک میں جا کر رکی تھی اور اگر میں اسے وہاں سے اٹھانے کی کوشش کرتا تو اس کا باکسر نظر آنے والا شوہر نہ جانے میرا کیا حال کرتا۔ بہر حال مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ میں نے ان کے پاس جا کر کہا "معاف کیجیے گا۔"

"معاف کیا۔" باکسر نے بدتمیزی سے کہا تو اس کے۔۔۔ بدتمیز بچے مزید بدتمیزی سے ہنسنے لگے تھے۔ میں نے جھلا کر کہا "میری انگوٹھی گرگئی ہے۔ آپ کی میز کے نیچے آگئی ہے اسے اٹھانا ہے۔" یہ کہہ کر میں یوں میز تلے جھانکنے لگا جیسے انگوٹھی کہاں تھی۔ بدقسمتی سے ماچس میز کے عین وسط میں چلی گئی تھی اور اسے وہاں سے نکالنے کے لیے مجھے میز تلے تقریباً گھسنا پڑتا لیکن اس صحت مند خاندان نے میز کو یوں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا جیسے جانور شکار کو گھیر لیتے ہیں۔ جو خلا تھا اس میں بلی کا بچہ بھی بہ مشکل گزر پاتا۔"

"پھر تو نے کیا کیا۔ میرا مطلب ہے اس خلا سے کیسے گزرا تو بلی کا بچہ تو نہیں ہے۔"

"میں نے اس ہاتھی کے بچے کا فیل نما پیر ذرا سا کھسکا یا تھا۔ اس سے اتنا خلا ہو گیا کہ میں ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ میرا مقصد ماچس کی ڈبیا حاصل کرنا تھا انگوٹھی تو کہیں اور ہی پڑی تھی۔ بہ مشکل میرا ہاتھ ماچس تک پہنچا لیکن ایک انچ دور جام ہو گیا۔ موٹے بچے کو کھسکائے بغیر ایک انچ کا یہ فیصلہ طے کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ میں اسی تگ ودو میں تھا اور میں نے ماچس کو چھو بھی لیا تھا کہ صحت مند بچوں کی دبلی پتلی سی اماں جان نے مجھ سے کہا "آپ کی انگوٹھی یہ ہے نا؟"

اس کے ہاتھ میں اپنی انگوٹھی دیکھ کر مجھ پر بجلی سی گری تھی۔ اس کے موٹے بچے نے بدتمیزی سے کہا "اب تو میز کے نیچے سے ہاتھ نکال لو۔"

"میں نے بادل ناخواستہ ہاتھ واپس کھینچا۔ میری کمند ٹوٹ گئی تھی جب دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا تھا۔ عورت سے انگوٹھی لے کر میں نے دل ہی دل میں اسے کوستے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس اپنی میز پر لوٹ آیا۔"

"تیری کہانی میں تجسس بڑھتا جارہا ہے۔" میں نے کہا اور چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا "پھر تو نے کیا کیا؟"

"میں کیا کرتا؟ بیٹھا حسرت سے ان کی میز تلے پڑی اپنی ماچس کی ڈبیا دیکھتا رہا۔ باکسر کو میرے بار بار دیکھنے سے شاید شک ہوگیا تھا اس نے ایک بار جھک کر میز کے نیچے دیکھا تو اسے ماچس کی ڈبیا نظر آگئی تھی۔ اس نے ڈبیا اٹھائی۔ اسے ذرا کھول کر دیکھا اور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ میری رہی سہی امید بھی ختم ہوگئی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ آج میری رات حوالات یا ہوٹل کے باورچی خانے میں برتن مانجھتے ہوئے گزرے گی۔ اس وقت تک اچھے خاصے لوگ آچکے تھے۔ جب باکسر نے پھاڑ کھانے والے انداز میں ہوٹل کے ویٹر کو طلب کیا۔ اپنی میز پر آنے والے کھانے کے ایک عظیم الشان انبار کا وہ پہلے ہی صفایا کرچکے تھے۔ ویٹر نے آکر ادب سے کہا۔

"جی سر، اب کیا لاؤں؟"

"لال بیگ مارنے والا اسپرے۔" باکسر نے دہاڑ کر کہا "پورا ہال چونک گیا تھا۔ میری پلیٹ میں دیکھو۔"

ویٹر نے جھک کر دیکھا اور اس کے تاثرات کچھ ایسے تھے جیسے اس نے باکسر کی پلیٹ میں کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ اس نے منمنا کر کہا "سر شاید غلطی سے ہوگیا۔ میں آپ کو دوسری پلیٹ لادیتا ہوں۔"

"دوسری پلیٹ۔" باکسر مزید بلند آواز میں بولا "احمق میں کھانا کھاچکا ہوں جو الٹ کر باہر آنے والا ہے۔ یہ کس قسم کا ہوٹل ہے۔ تم لوگ کھانے میں یہ بھی پکادیتے ہو۔" اس نے پلٹ کر مونچھ پکڑ کر سالن میں لتھڑا لال بیگ اٹھایا۔ اپنا لال بیگ پہچان کر میرا صدمے سے برا حال ہوگیا تھا۔ وہ خبیث میرے پلاٹ پر میرے ہی لال بیگ کے ذریعے ڈراما کھیل رہا تھا۔ باکسر کی بیوی کا کراہیت سے برا حال تھا اور بالآخر وہ ابکائیاں لیتی واش روم کی طرف بھاگی۔ ویٹر کی حالت اس سے زیادہ غیر ہورہی تھی۔ اس نے کھسیا کر کہا۔

چٹکلے

☆

دلہن رخصت ہورہی تھی۔ خواتین آنسو بہارہی تھیں۔ ٹیپ ریکارڈر پر بلند آواز سے یہ گانا بج رہا تھا۔ "چھوڑ بابل کا گھر' موہے پی کے نگر آج جانا پڑا۔" مہمانوں میں ایک لڑکی ایسی بھی تھی جو غم زدہ نظر آنے کے بجائے ایک کونے میں کھڑی دانت پیس رہی تھی۔ لڑکی کی ایک سہیلی نے پوچھا۔ "رخسانہ' تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ تمہیں کرن کی رخصتی کا دکھ ہورہا ہے۔"

لڑکی بولی۔ "دکھ کرتی ہے میری جوتی! کرن نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کرتا۔ اس نے ہمیشہ مجھے یہ مشورہ دیا کہ عامر سے جتنی ترش روئی سے پیش آؤ گی' وہ تم سے اتنی ہی محبت کرے گا۔"

سہیلی نے پوچھا۔ "یہ عامر کون ہے۔"

"وہ جو سہرا باندھے' پھولوں سے آراستہ کار کی طرف بڑھ رہا ہے۔"

☆

رئیل اسٹیٹ ایجنٹ مکان کے متوقع خریدار سے کہنے لگا۔ "یہ گھر فوائد اور نقصان دونوں رکھتا ہے۔ میں ایک دیانتدار انسان ہوں' اس لیے پہلے آپ کو نقصان بتاتا ہوں۔ گھر کے مغرب میں ایک میل دور بھینسوں کا باڑہ ہے۔ مشرق کی جانب ربڑ بنانے والا ایک کارخانہ ہے۔ شمال کی طرف تھوڑے ہی فاصلے پر کوڑے کرکٹ سے کھاد بنانے والا پلانٹ ہے اور جنوب کی طرف سیمنٹ فیکٹری ہے۔"

متوقع خریدار نے کڑوا گھونٹ نگلتے ہوئے کہا۔ "فوائد کیا ہیں۔"

"آپ ہمیشہ آسانی سے جان سکتے ہیں کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔"

"پلیز آہستہ بولیں سر۔"

"آہستہ بولوں۔" باکسر نے لاؤڈ اسپیکر کی سی آواز نکالی "کہاں ہے اس ہوٹل کا منیجر بلکہ مالک کو بلاؤ۔"

ہیڈ ویٹر نے صورت حال میں گڑبڑ محسوس کر لی تھی۔ وہ تیزی سے ان کے پاس آیا۔ "اینی پرابلم سر؟"

"یہ ہے پرابلم۔" باکسر نے لال بیگ ہیڈ ویٹر کی ناک کے سامنے لہرایا "میری پلیٹ سے برآمد ہوا ہے۔"

باکسر کسی قدر اناڑی پن سے کام لے رہا تھا۔ اس نے پورے ہال کو متوجہ کر لیا تھا اور سب کو پتا چل گیا تھا کہ اس کی پلیٹ سے ایک عدد لال بیگ برآمد ہوا ہے۔ جو لوگ کھا رہے تھے ان کی بھوک مر گئی تھی اور جنہوں نے ابھی آرڈر دیا تھا وہ متفکر نظر آ رہے تھے۔ غالباً یہ سوچ کر ان کے کھانوں سے کیا برآمد ہوتا ہے۔ احمق باکسر نے سب کو متوجہ کر کے ہوٹل والوں کا ایک خوف تو ختم کر دیا تھا کہ بات دوسروں تک نہ جا پہنچے۔ اس سے باکسر کا اناڑی پن ظاہر تھا اور کمینگی بھی جھلکتی تھی ورنہ وہ بل بچانا چاہتا تو یہ کام خاموشی سے بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے ہوٹل کی ساکھ کا نقصان کرنا قطعی ضروری نہیں تھا جیسا کہ میری عادت تھی۔ اس خبیث نے صرف ہوٹل کی ساکھ ہی کو نہیں بلکہ مجھے بھی نقصان پہنچایا تھا۔ ایک بار کھیلا جانے والا ڈراما دوسری بار ذرا مشکل سے ہی ہٹ ہوتا ہے پھر بھی مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا ورنہ عین ممکن تھا کہ باکسر کا غصہ بھی ہوٹل والے مجھ پر اتارتے۔

یہاں تو کچھ دستیاب نہیں تھا لیکن واش روم سے کچھ ملنے کا امکان تھا۔ یعنی کوئی مکھی مچھر یا لال بیگ، ایک لال بیگ تو برآمد ہو ہی چکا تھا دوسرا بھی ہو جاتا تو ہوٹل والوں کا کیس کمزور ہو جاتا لیکن اس سے پہلے کہ میں اٹھتا میں نے باکسر کو واش روم کی طرف جاتے دیکھا غالباً وہ ماچس کا بقیہ اثاثہ ضائع کرنے جا رہا تھا۔ یہاں وہ پھینک نہیں سکتا اور ہر ایک میری طرح بہادر نہیں ہوتا کہ ایسی چیزوں کو جیب میں ڈال کر پھرے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں اٹھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ میرا خیال تھا کہ میں اس سے ماچس کی ڈبیا حاصل کر سکتا تھا۔ جب میں اسے بھانڈا پھوڑنے کی دھمکی دیتا تو اس کا باپ بھی ڈبیا میرے حوالے کرتا لیکن میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ واش روم میں جا چکا تھا۔ پاس ہی ہینگر پر اس کا کوٹ ٹنگا ہوا تھا۔ میں نے اپنا بھی کوٹ وہاں ٹانگا اور واش روم میں چلا گیا۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ اس نے پہلی فرصت میں ماچس کی ڈبیا فلش میں بہا دی ہوگی۔ ظاہر ہے وہ یہاں اسی مقصد کے لیے آیا تھا۔ میں نے واش روم میں نظر دوڑائی لیکن وہ کسی آئینے کی طرح چمک رہا تھا کسی کونے کھدرے میں لال بیگ تو ایک طرف رہا کوئی چیونٹی بھی موجود نہیں تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ہوٹل میں حفظان صحت کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا۔

مایوسی کے عالم میں، میں باہر آیا تو میری آنکھوں تلے اندھیرا اچھا رہا تھا۔ میں نے کوٹ پہنا اور واپس اپنی ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا۔ اگرچہ فروٹ کسٹرڈ موجود تھا۔ میں نے اسے چکھا تک نہیں تھا لیکن میری بھوک مر چکی تھی اور اپنا انجام سوچ کر مجھ پر رقت طاری ہو رہی تھی باکسر نے مجھے مروا دیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد آیا۔ جہاں منیجر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس نے واویلا وہیں سے شروع کیا جہاں سے اس کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔ بہ مشکل منیجر نے اسے ٹھنڈا کیا اور اسے پیش کش کی کہ وہ اس ڈنر کو ہوٹل کی طرف سے تحفہ سمجھے۔ لال بیگ گرنا ایک اتفاقی واقعہ تھا جس پر قومہ بنانے والے باورچی کو معطل کر دیا گیا تھا اور اس سے تفتیش کی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے یہ ایک سرکاری بیان تھا جو عوام کو مطمئن کرنے کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ منیجر کو معلوم تھا کہ کچھ لوگ کھا کر رخصت ہو جائیں گے اور جلد ان کی جگہ دوسرے لوگ آ جائیں گے۔ اس کے گلشن کا کاروبار اسی طرح چلتا رہے گا۔

مفت ڈنر کی پیش کش سن کر احمق باکسر کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے نئے جوش و خروش سے آرڈر دیا۔ بقول اس کے وہ سارا کھایا پیا واش روم میں نکال آیا تھا منہ کے راستے۔ اس کی امت نے بھی

نئے سرے سے ڈنر کا آغاز کیا۔ بلاشبہ انہوں نے کئی ہزار کا کھانا کھالیا تھا۔ آخر وہ وقت آ گیا جس کے تصور سے میری حالت خراب ہو رہی تھی۔ یعنی ویٹر بل لے کر آ گیا اور اس نے برتن سمیٹنا شروع کر دیے تھے۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا ''اور کچھ لاؤں سر؟''

مہذب انداز میں اس نے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر میں کھا چکا ہوں تو میز دوسروں کے لیے خالی کر دوں۔

ویٹر سر پر کھڑا تھا اور میرے پاس بل ادا کرنے کے لیے رقم نہیں تھی۔ میں نے بادل ناخواستہ جیب میں ہاتھ ڈالا جو خالی ہی تھی لیکن میں دنگ رہ گیا جب میرا ہاتھ ایک بٹوے سے ٹکرایا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ پچھلے کئی سالوں سے میرے پاس بٹوے نام کی کوئی چیز رہی ہو۔ ابھی میں اس واقعے پر دنگ ہی ہو رہا تھا کہ اس بار ویٹر نے زیادہ کرخت لہجے میں بل کا یاد دلایا۔ میں نے جیب سے بٹوا نکالا اور اس میں سرمئی، ہرے اور لال نوٹوں کی ایک موٹی رقم پا کر مجھے شادی مرگ ہوتے ہوئے بچا۔ میں نے بل سے زیادہ مالیت کے نوٹ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور ویٹر سے کہا۔ ''باقی تمہاری ٹپ ہے۔''

وہ بھی فیاضی کے اس مظاہرے پر دنگ تھا۔

جب میں ہوٹل سے رخصت ہوا تھا غالباً تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ کیا ہوا ہوگا۔'' شہزادہ بدبخت نے جو اس بار خوش قسمت ثابت ہوا تھا مجھ سے بولا۔

''ہاں، باکسر کا کوٹ تیرے پاس آ گیا تھا۔ کیا تجھے فرق محسوس نہیں ہوا؟''

''وہ رنگ، سائز اور سلامتی میں بالکل میرے کوٹ جیسا تھا بلکہ یہ میرے کوٹ جیسا ہے۔ میرا کوٹ تو اسی باکسر کے پاس چلا گیا۔ بعد میں وہ میری ماچس کی ڈبیا مارنے پر پچھتایا ہوگا۔ بٹوے میں اتنی رقم تھی کہ وہ اس جیسے کئی ڈنر کر سکتا تھا۔ اس میں اس کے کریڈٹ کارڈ اور دیگر کاغذات بھی تھے جیسے شناختی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس جو میں نے شکریے کے خط کے ساتھ اسے بھجوا دیے تھے۔''

''تو یہ راز تھا تیری سخاوت کے پیچھے۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''بٹوے کی رقم کب تک چلے گی؟''

''ابھی ایک دو مہینے تو مجھے لال بیگ یا مکھی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' اس نے بے پروائی سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا ''اچھا یار اب مجھے میٹرو پول جانا ہے۔ وہاں ایک دوست کو ٹائم دے رکھا ہے پھر ملیں گے۔''

''خدا نہ کرے۔'' میں نے کہا ''تجھے ہر بار ایسا ہی بٹوا نہیں ملے گا شہزادہ بدبخت۔''

اس خطاب پر وہ برا مان کر رخصت ہوا اور میرے چودہ طبق اس وقت روشن ہو گئے جب ویٹر نے بل لا کر میرے سامنے رکھا تھا۔ نصف درجن چائے اور دو درجن بسکٹوں کا بل اتنا بن گیا تھا کہ شہزادہ بدبخت کی دی ہوئی آدھی رقم بل میں چلی گئی تھی۔ وہ بدبخت جاتے جاتے میرے ساتھ ہاتھ دکھا گیا تھا۔

☆☆

ادب سے.....!

شاعر' دل شاہجہانپوری زندگی کے آخری برسوں میں بہت بیمار رہے اور تقریباً چار برس تک متفرق امراض کا شکار رہے۔ صحت بہت خراب ہوگئی۔ ایک بار اتنے شدید بیمار ہوئے کہ زندگی کی امید نہ رہی۔ بے ہوشی طاری ہوگئی۔ ایک بار جب ہوش آیا تو کچھ دوستوں نے مزاج پرسی کی۔ آپ کہنے لگے۔

''موت اور زندگی کے مابین جنگ ہو رہی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ فتح کس کو ہوتی ہے۔'' پھر اپنی یہ رباعی پڑھی۔

مہلت تو ہو' دنیا سے گزرنے کے لیے
فرصت تو ملے' قصد یہ کرنے والے
اے پیکر اجل' تو اسے مجبور نہ کر
تیار نہیں جو ابھی مرنے کے لیے

جرم وفا

غلام قادر

زندگی میں اگر کوئی چیز اہم ہے تو وہ محبت ہے اور محبت کے لیے وفاداری شرط ہے یہ شرط پوری کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ بڑے بڑے محبت کے دعوے دار یہ شرط پوری کرنے سے قاصر رہتے ہیں مگر دعوے محبت سے باز نہیں آتے۔اس عورت کا قصہ جسے محبت تو مل گئی تھی مگر ایک بے وفا کی۔ وہ ایک چھوٹے سے پر سکون گھر کی خواہش مند تھی مگر اس کی یہ خواہش بھی ادھوری ہی تھی۔ پھر ایک مرحلے پر اسے اپنی محبت کو بھی قربان کرنا پڑ گیا۔

(ماں کا خون کرنے والے اس مجرم کا قصہ جو دھرتی کا بھی مجرم تھا)



احسان لکھنوی کی اچانک آمد سے نوری کو ں قدر حیرت ہوئی تھی، اس سے زیادہ حیرت اسے اس وقت ہوئی جب احسان لکھنوی نے اسے بتایا کہ وہ پناہ کی تلاش میں اس تک پہنچا ہے۔

"زمین میرے لیے تنگ ہو چکی ہے نوری۔" احسان لکھنوی نے افسردہ لہجے میں کہا تھا اور نوری کو اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔

"آپ افسردہ کیوں ہوتے ہیں۔" نوری نے تسلی دینے والے انداز میں کہا "میں جو کچھ بھی ملتی ہوں ضرور کروں گی۔"

نوری نے حوصلہ دینا چاہا لیکن احسان لکھنوی ں کے باوجود اس کے سامنے خاموش بیٹھا اس کی رت دیکھتا رہا۔

"میں بڑی امید کے ساتھ تمہارے پاس آیا ں حالانکہ ۔۔۔" احسان لکھنوی نے اپنا فقرہ ادھورا ا ہی تھا کہ نوری تڑپ کر بول پڑی۔

"پرانی باتوں کو جانے دیں۔" نوری نے نظریں جھکائے ہوئے احسان لکھنوی کو شرمندگی سے بچانے والے انداز میں کہا لیکن احسان لکھنوی اسی طرح نظریں جھکائے رہا۔

"کاش میں نے اس وقت تمہارے جذبات کی قدر کی ہوتی۔" احسان لکھنوی نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس انداز میں کہا جیسے وہ پچھتا رہا ہوں لیکن اب نوری کے پاس کچھ کہنے کے لیے نہیں تھا۔

"لیکن شاید اس میں بھی قدرت کی مصلحت ہوگی کیونکہ آج اگر تم اعزاز الدین شاہ جیسے بڑے آدمی کی بیوی نہ ہوتیں تو امید کا یہ آخری دامن بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہوتا اور میرے پاس خودکشی کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ ہوتا۔"

احسان لکھنوی افسردہ لہجے میں بولتا چلا گیا۔

"اگر شاہ صاحب آپ کا کام کر سکتے ہوں گے تو کبھی انکار نہیں کریں گے۔" نوری نے پورے اعتماد سے اطمینان دلانا چاہا۔

"اور تم میری سفارش کرو گی؟" احسان لکھنوی

نے سوال کیا لیکن اس انداز میں جیسے کنفرم کر رہا ہو۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے احسان صاحب۔" نوری نے احتجاج کرنے والے انداز میں کہا۔

"یہ جانے بغیر معاملہ کیا ہے؟" احسان لکھنوی نے پہلے سے انداز میں دوسرا سوال کیا لیکن اس بار نوری نے محض گردن ہلا کر اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"لیکن شاہ صاحب تو شاید غیر ملکی دورے پر ہیں؟" احسان لکھنوی نے ایک اور سوال کیا۔

"دو روز بعد ہی وہ آرہے ہیں۔" نوری نے اس کی پریشانی دور کرنی چاہی لیکن احسان لکھنوی کے انداز سے نوری کو یہ محسوس ہوا جیسے یہ بات وہ پہلے سے جانتا ہو۔

"انہیں میرے یہاں رہنے پر اعتراض تو نہیں ہوگا؟" احسان لکھنوی نے سوال کیا اور نوری ہنس دی۔

"آپ بے فکر ہو کر یہاں جب تک چاہیں رہ سکتے ہیں۔" نوری نے اسے ایک بار پھر اطمینان دلایا۔

نوری کا جی چاہا کہ وہ احسان لکھنوی سے پوچھے کہ آخر وہ ایسی کون سی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے کہ وہ رشتے جو اس نے خود ختم کیے تھے، انہیں ایک بار پھر جوڑنے چلا آیا ہے لیکن احسان لکھنوی کی خاموشی دیکھتے ہوئے اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"اگر یہ چاہیں گے تو خود ہی بتا دیں گے۔" نوری نے خود کو مخاطب کیا اور اس کے ساتھ ہی وہاں سے جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"آپ آرام کریں۔" اس نے اجازت طلب انداز میں کہا۔ "یہاں پر جتنے بھی ملازم ہیں۔ وہ شاہ صاحب کے وفادار ہیں اور ان سے اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ بات باہر نہیں جانی چاہیے کہ آپ یہاں پر ہیں۔" نوری نے جاتے جاتے ایک بار پھر اطمینان دلانا ضروری سمجھا تھا اور جواب میں احسان لکھنوی نے مشکور نظروں سے اسے دیکھا تھا لیکن اس موضوع پر اس نے پھر بھی کوئی بات نہیں کی کہ وہ کن حالات کا



شکار ہو کر وہاں پہنچا ہے۔
نوری نے احسان لکھنوی کے پاس سے آنے کے بعد اس مسئلے پر کچھ دیر سوچا بھی لیکن اس کی سوچ کی لہریں ایک مخصوص حد سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔
''ایک آدھ دن میں وہ خود ہی بتا دیں گے۔'' نوری نے سوچا اور پھر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دینے کی کوشش کی لیکن نیند کی وادیوں میں قدم رکھنے تک وہ اس خیال سے پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا سکی تھی۔
اعزاز الدین شاہ کی بیوی بننے سے پہلے وہ فلموں کی نمبرون ویمپ سمجھی جاتی تھی اور فلموں میں آنے سے قبل اس کا مشغل وہی کچھ تھا جو فلم میں آنے سے قبل انڈسٹری کی بیشتر خواتین کا ہوا کرتا تھا۔
فلم انڈسٹری میں آنے اور پہلی ہی فلم سے ہٹ ہو جانے کے باوجود اس نے نہ تو اپنے رابطے ختم کیے تھے اور نہ ہی وہ سب کچھ پوری طرح ختم کیا تھا جو فلموں میں قدم رکھنے سے قبل کرتی تھی۔ سب کچھ اسی طرح سے تھا لیکن صرف اتنے سے فرق کے ساتھ کہ اب وہ ہرا یرے غیرے کے لیے محفل نہیں سجاتی تھی۔
اتنے سے فرق کے علاوہ سب کچھ پہلے کی طرح تھا بلکہ پہلے سے زیادہ بہتر چل رہا تھا۔ اتنا زیادہ بہتر کہ کبھی کبھی تو وہ خود حیران رہ جاتی تھی کہ تقدیر پر اس پر اتنی مہربان کیسے ہو گئی کہ دولت اس کے چاروں طرف سے اچانک برسنی شروع ہو گئی تھی۔
فلموں میں اس کی شہرت مہوش کے نام سے ہوئی تھی۔ جب تک وہ نوری تھی اس میں اور مخصوص محلے کی دوسری پیشہ ور خواتین میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس کا معمول بھی وہی تھا جو باقی گھروں کا تھا۔ وہ بھی شام ڈھلتے ہی اپنی دونوں بہنوں اور ماں کے ساتھ محفل سجا کر بیٹھ جاتی اور پھر رات گئے جب تک جیب سے نوٹ نکلتے رہتے محفل سجی رہتی۔ ناز و انداز کا تبادلہ نوٹوں سے ہوتا رہتا اور پھر جب اس کی تیزی ختم ہو جاتی اور نوٹ آخری سانس لیتے ہوئے مریضوں کی طرح نکلنے لگتے تو اس کی ماں خاص محفل اکثر عام محفل میں تبدیل ہونے کا اشارہ دے دیتی۔

نوری کی زندگی اسی طرح شروع ہوئی تھی جس طرح اس کے محلے کی دوسری عورتوں کی شروع ہوئی تھی۔ وہ ختم بھی شاید اسی طرح ہو جاتی لیکن پھر اچانک ایک شام احسان لکھنوی اس کی زندگی میں داخل ہوا۔
پہلی بار جب نوری نے اسے دیکھا تھا تب بھی وہ اسے روزانہ آنے والوں سے مختلف دکھائی دیا تھا۔ لانبے قد اور چھریرے بدن والے شخص میں لباس کے سوا کوئی ایسی بات نہیں تھی جو اسے دوسرے آنے والوں سے ممتاز کرتی۔ اس کی سیڑھیاں چڑھنے والوں میں پینٹ قمیص والے بہت کم لوگ ہوتے تھے لیکن احسان لکھنوی پہلی بار بھی اس کے ہاں ٹائی کے ساتھ آیا تھا۔ کوئی خاص بات محسوس نہ کرنے کے باوجود پہلی بار آنے والے کا مخصوص پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا گیا تھا مگر جب دوسری غزل ختم ہونے کے بعد بھی اس نے جیب سے ایک دھیلا بھی نہیں نکالا تو نوری نے ماں کی جانب دیکھا جو پہلے ہی اس شخص کو غور سے دیکھ رہی تھی۔
''مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' احسان لکھنوی نے جو اس وقت تک ایک عام سا شخص تھا، ایک نظر نوری پر ڈالتے ہوئے اس کی ماں سے کہا۔
''الگ جانا ضروری ہے کیا؟'' نوری کی ماں نے جو اسے اس وقت ایک خاص انداز میں تول چکی تھی، قدرے روکھے انداز میں کہا۔
''جی۔ کچھ ایسا ہی ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ جب بول رہا تھا تو نوی کو اس کی آواز محسوس نہیں ہوئی تھی کیونکہ جسمانی طور پر لاغر ہونے کے باوجود اس کی آواز خالص مردانہ آواز تھی۔ رعب اور دبدبے کے ساتھ ساتھ اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی گونج سی تھی۔
''چلیں اگر آپ کی یہ خواہش ہے تو۔۔۔'' نوری کی ماں نے ایک ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے اٹھنے سے قبل کہا۔
''ارے تم نے اپنے ہاتھ کیوں روک دیے استاد جی۔'' نوری کی ماں نے وہاں سے جانے سے

اں طبلے پر بیٹھے ہوئے نواز علی کو مخاطب کرتے ہوئے اندیہ دیا۔

"تیرے عاشقوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا۔" مجھلی سروری نے نوری کے کان میں سرگوشی والے انداز میں کہا اور نوری مسکرا کر رہ گئی۔

اس وقت وہاں جو کچھ بھی ہوا، اس میں سے کچھ بھی نوری کے لیے نیا نہیں تھی۔ ان کے ہاں آنے والوں میں بہت سے ایسے ہوتے تھے جو سب کی موجودگی میں اپنی خواہش کا اظہار کر دیتے تھے۔ کچھ شرفا محفل میں ہی اس کی ماں سے کھسر پسر کرتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کرتے تھے اور جو کچھ زیادہ ہی "شریف" ہوتے تھے، وہ تنہائی کے خواہشمند ہوتے تھے۔

نواز علی نے نوری کی ماں کے کمرے سے نکلنے سے پہلے ہی طبلے پر ہاتھ مارنا شروع کر دیے حالانکہ موجود ہر شخص جانتا تھا طبلہ بالکل سیٹ ہے پھر نواز علی اس وقت تک یہ کرتا رہا جب تک نوری اور احسان لکھنوی وہاں سے چلے نہ گئے۔

ان دونوں کے رخصت ہوتے ہی بڑی بہن اختری نے ایک فرمائش پوری کی اور نوری مجھلی کو اشارہ کرتے ہوئے وہاں سے نکل آئی۔ نہ جانے کیوں اسے اس اجنبی شخص کی ذات میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اس دلچسپی میں وہ آداب محفل بھی بھول گئی جو بچپن سے انہیں سکھائے جاتے تھے۔ نوری کو وہاں سے جاتا دیکھ کر دونوں بہنوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور دونوں مسکرا کر رہ گئیں۔

"اسے ہمیشہ سے کوٹ پتلون والے بندے اچھے لگتے ہیں۔" وہ دونوں اکثر فارغ اوقات میں نوری کا اس بات پر مذاق اڑاتی تھیں۔

کوٹ پتلون والے شخص سے ان کی مراد ہمیشہ پڑھا لکھا شخص ہوا کرتا تھا اور نوری کو وہ اجنبی بھی اس طرح کا شخص دکھائی دیا تھا۔

"تو احسان لکھوی صاحب میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔" چھوٹے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نوری نے اپنی ماں کی آواز سنی۔ ماں کا لہجہ نوری کو خاصا سخت محسوس ہوا تھا پھر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ان دونوں میں سے پہلے احسان لکھنوی نے دیکھا تھا۔

"چلیں یہ تو اور بھی اچھا ہوگیا کہ آپ خود ہی یہاں آ گئیں۔" اس شخص نے جسے نوری نے اپنی ماں کو احسان لکھنوی کے نام سے پکارتے ہوئے سنا تھا، براہ راست نوری سے مخالف ہوتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں اٹھ کر چلی آئیں وہاں سے۔" ماں نے احسان لکھنوی کی آواز پلٹ کر اسے دیکھا اور قدرے ناراض لہجے میں اس سے کہا۔ اس سے پہلے کہ ماں مزید کچھ کہتی۔ احسان لکھنوی نے اس کی بات درمیان سے ہی اچک لی۔

"آخر ہم ان کے بارے میں ہی تو بات کرنے جا رہے تھے اس لیے کیا برائی ہے اگر وہ خود بھی سن لیں تو۔۔۔" احسان لکھنوی نہایت شائستہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ نوری کی ماں کو اس کی یہ بات بھی بری لگی تھی۔

"احسان صاحب یہ کسی شریف آدمی کا گھر نہیں ہے کہ جہاں لڑکیوں کی رائے کو بھی اہمیت دینے کا رواج ہو گیا ہے۔" ماں کا لہجہ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔

"یہ طوائف کا کوٹھا ہے اور یہاں کی لڑکیوں نے ابھی تک اپنے بارے میں فیصلے کا اختیار اپنے بڑوں کو دے رکھا ہے۔" نوری سمجھ رہی تھی کہ اس کی ماں کیوں غصہ ہو رہی ہے لیکن احسان لکھنوی معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ سکا اور صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

"اب آئی ہے تو بیٹھ جا۔" نوری نے محسوس کیا کہ ماں کو جیسے اچانک ہی اپنی زیادتی کا احساس ہوگیا تھا۔ گاہک جیسا بھی ہوگا گاہک ہی ہوتا ہے۔ اس کی ماں نے سیلز اور مارکیٹنگ کی بڑی بڑی کتابیں تو نہیں پڑھی تھیں لیکن اس کے باوجود اتنی بات وہ ضرور جانتی تھی کہ "گاہک جو بھی کہتا ہے وہی ٹھیک ہوتا ہے۔"

"جی آپ کچھ کہہ رہے تھے؟" ماں نے خاموش بیٹھے ہوئے احسان لکھنوی کو مخاطب کیا۔

"جی۔" پہلی بار میں احسان لکھنوی کی زبان

سے اتنا ہی کچھ نکلا۔

"میں نے آپ سے عرض کی تھی کہ لوگ مجھے احسان لکھنوی کے نام سے جانتے ہیں۔" احسان لکھنوی نے اپنے خطا ہوئے اوسان دوبارہ سے مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

"جی یہ تو آپ نے بتایا تھا۔" نوری نے چونک کر ماں کی جانب دیکھا۔ عام طور پر وہ کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھنے والوں سے اس انداز میں مخاطب نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے سامنے بچھ بچھ جاتی تھی لیکن اس بار اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ "آگے بھی بکے گا یا یہیں پر اٹکا رہے گا۔"

"شاید یہ نام آپ پہلے بھی سن چکی ہوں۔" نوری کو اب احسان لکھنوی کے لہجے میں کھویا ہوا اعتماد لوٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"میرا تعلق فلموں سے ہے اور میں اب تک کوئی بائیس فلموں کی کہانیاں اور اسکرپٹ لکھ چکا ہوں۔" احسان لکھنوی کا فقرہ ابھی اس کے ہونٹوں سے مکمل طور پر ادا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اچانک ہی ماں اور بیٹی دونوں کے لیے دنیا کا معزز ترین آدمی ہو گیا۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں احسان صاحب۔" لہجے میں آنے والے فرق کو شاید احسان لکھنوی نے بھی محسوس کیا تھا لیکن نوری کو تو یوں محسوس ہوا تھا کہ "ماں ہر لفظ کو پہلے شہد میں ڈبو کر پھر زبان سے ادا کر رہی ہے۔"

"جو بات آپ کو پہلے بتانی چاہیے تھی وہ آپ بعد میں بتا رہے ہیں۔" بوکھلاہٹ میں نوری کی ماں اپنی زیادتی کا اعتراف کر چکی تھی۔

"کہانیوں کے علاوہ میں بہت سی فلموں کے گانے بھی لکھ چکا ہوں۔" احسان لکھنوی نے اپنے تعارف کا دوسرا حصہ مکمل کیا اور نوری کو ماں کی گردن کچھ اور تیزی سے ہلتی ہوئی نظر آئی۔

"میں جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں۔" اس کی ماں نے فوراً ہی اس کی تصدیق کی۔

"ریڈیو سے روز ہی آپ کے گانے آتے ہیں۔" نوری کو اب احساس ہوا تھا کہ احسان لکھنوی کا نام اسے اتنا جانا پہچانا کیوں محسوس ہو رہا تھا۔

"تو ٹکر ٹکر بیٹھی کیا منہ دیکھ رہی ہے۔" نوری کی ماں کی پوری زندگی میں ایسا موقع اس سے پہلے نہیں آیا تھا اس لیے وہ جتنا بھی بوکھلاتی کم تھا۔

"بلکہ نہیں تو یہیں بیٹھ میں ہی دیکھتی ہوں۔" نوری ابھی اٹھنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ماں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے پہلا حکم منسوخ کرتے ہوئے دوسرا حکم جاری کیا۔

"بچی ہے۔" ماں کو اپنی جگہ سے اٹھتے دیکھ کر نوری کو ہوش آ گیا اور وہ سمجھ گئی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ "اسے اندازہ نہیں ہے کہ کس مہمان کی خاطر کس طرح کرنی چاہیے۔" ماں نے جاتے ہوئے مخاطب تو احسان لکھنوی کو ہی کیا تھا لیکن ہدایات نوری کے لیے جاری کی تھیں۔

"کیا نام ہے آپ کا۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آخر کار احسان لکھنوی نے ہی اسے مخاطب کیا۔ نوری تو اس دوران میں اپنے دوپٹے کے کونے سے نظریں جھکائے ہوئے کھیلتی رہی تھی۔

"جی۔ نوری۔" اس نے شرمائے ہوئے انداز میں کہا۔

"فلم میں کام کرنے کا شوق تو ہو گا تمہیں۔۔۔؟" احسان لکھنوی نے ایک اور سوال کیا۔

"میں تو جی۔۔۔" نوری نے اسی طرح جھکی جھکی نظروں کے ساتھ ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں تو جی فلمیں دیکھتی ہی نہیں ہوں۔" اس نے دوسری کوشش میں فقرہ مکمل کیا تو احسان لکھنوی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھرتی چلی گئی۔

"ایک بات کہوں تم سے نوری۔" احسان لکھنوی کا انداز ایسا ہی تھا کہ نوری کو اپنی نگاہیں اوپر اٹھانی پڑیں۔

"جی۔" اس نے احسان لکھنوی کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک محسوس کی تھی کہ اس کی نگاہیں خود بخود جھکتی چلی گئیں۔

"میں گزشتہ آٹھ برسوں سے فلم انڈسٹری میں ہوں۔" نوری کو اس کے لہجے میں طنز محسوس ہوا تھا۔ "ان آٹھ برسوں میں تم جیسی اتنی خواتین سے مل چکا ہوں کہ اب تو ان کی گنتی بھی یاد نہیں رہی ہے۔" نوری احسان لکھنوی کی اس بات پر نگاہیں اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔

"ابتدا میں ایک آدھ بار کچھ بے وقوف بن گیا تھا لیکن اس بات کو بھی اب ایک عرصہ بیت چکا ہے۔" احسان لکھنوی کی گفتگو کا ایک ایک لفظ وہ سمجھ رہی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دینا چاہیے۔

"اور اب تو اس بات کی عادت پڑ گئی ہے کہ جب بھی کسی کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوں۔ اپنی آنکھوں اور کان کے ساتھ ساتھ ذہن بھی کھلا رکھتا ہوں۔" احسان لکھنوی اسے بدستور دیکھ کر مسکراتا رہا تھا اور نوری کو اس مسکراہٹ میں اپنے لیے طنز ہی طنز محسوس ہوا تھا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکی؟" اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ ہے بے بی کہ میں نہ تو تمہارا خریدار ہوں اور نہ ہی یہاں پر تمہارے ناز و انداز دیکھنے آیا ہوں۔" اس کے فقرے میں نوری کو اپنی مکمل شکست نظر آئی تھی۔

نوری کو پہلی بار اس پھل کو چکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے جز بز ہونے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔

"مختصراً تم یہ سمجھ لو کہ میں یہاں کچھ خریدنے نہیں بلکہ بیچنے آیا ہوں۔" اب کی بار نوری کی سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ یہ معلوم کرتی کہ وہ کیا بیچنے آیا ہے، اسے ماں اور اس کے پیچھے ٹرے ہاتھ میں لیے ماسی عنایتے آتی ہوئی نظر آ گئیں۔

"ارے آپ دونوں تو خاموش بیٹھے ہیں۔" ماں نے چھوٹی ٹیبل کو احسان لکھنوی کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس نے نوری کی طرف بھی دیکھا تھا لیکن نوری نے فوراً ہی اپنی نظریں دوسری جانب کر لی تھیں۔ وہ ماں کو اپنی بھرپور شکست کی خبر نہیں دینا چاہتی تھی کیونکہ اصل شکست تو اس کی تھی۔

"بات تو مجھے آپ سے ہی کرنی تھی اور آپ ہی اٹھ کر چلی گئیں۔" احسان لکھنوی نے عام سے لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا کہ آپ پہلی بار گھر پر تشریف لائے ہیں تو پہلے کچھ چائے پانی ہی ہو جائے۔" ماں نے فدویانہ انداز میں بات کی تو نوری کا جی چاہا کہ ماں کو خبردار کر دے کہ یہ بندہ ان حربوں سے قابو میں آنے والی شے نہیں ہے لیکن اپنی اس خواہش کو وہ دل میں ہی دبا کر رہ گئی۔ کیونکہ ماں اس کی جانب دیکھے بغیر اپنی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھی۔

"اس کے بعد تو باتیں ہوتی رہیں گی کیونکہ رات بھی اپنی ہے اور بات بھی اپنی ہے۔" ماں کا فقرہ ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ نوری کو احسان لکھنوی کے چہرے پر ایک بار پھر سے وہی مسکراہٹ بکھرتی ہوئی نظر آئی۔

"آپ باقی باتیں تو رہنے دیں صرف چائے پلوا دیں کیونکہ مجھے ایک اور جگہ بھی پہنچنا ہے۔" احسان لکھنوی کے لہجے میں دو ٹوک انداز میں بات ختم کرنے والا انداز تھا۔ اس کی ماں نے اس پر غور نہیں کیا لیکن نوری کے لیے اب بھی موقع نہیں تھا کہ ماں کو خبردار کرتی۔

"میں نے تو چھوٹو کو بازار کی طرف دوڑا بھی دیا ہے۔" نوری کی ماں نے اتنے دلار سے کہا کہ کوئی اور ہوتا تو اس دلار پر ہی قربان ہو جاتا۔

"وہ کھانے کا آرڈر دیتے ہوئے نعیم کی دکان سے بلیک لیبل لیتا ہوا کھانا لے کر آ جائے گا۔ بس ابھی آدھے پونے گھنٹے میں۔" ہمیشہ کے آزمودہ نسخے کو ایک بار پھر آزمایا گیا۔ نوری جانتی تھی کہ ماں کا یہ حربہ بھی اس کے اپنے حربے کی طرح ناکام ہو جائے گا۔

"بہتر ہوتا کہ آپ ان تکلفات میں الجھے بغیر میری بات سن لیتیں ہو سکتا ہے میری بات سننے کے بعد آپ مجھے چائے پلائے بغیر ہی دھکے دے کر نکال

دیں۔" ماں نے پہلے حیرت بھری نظروں سے نوری کی جانب دیکھا اور وہاں سے آتے ہوئے سگنل اس کی سمجھ میں نہ آسکے تو اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ ابھی احسان لکھنوی نے اپنی گفتگو کا آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ ماسی عنایتے ٹرے میں چائے کے برتن لیے داخل ہوگئی۔

"بائی جی۔" کیتلی میز پر رکھتے ہوئے اس نے نوری کی ماں کو مخاطب کیا۔

"ادھر کچھ لوگ نوری بی بی کا ہی گانا سننے کو مانگتے ہیں۔" عنایتے نے اپنے مخصوص انداز میں ادھر سے آنے والا پیغام دیا۔

"آں۔۔۔" نوری نے اپنی ماں کو چونکتے ہوئے محسوس کیا۔

"ادھر کہہ دے فلم کمپنی والے آئے بیٹھے ہیں اور نوری بی بی ان کے ساتھ بیٹھی ہیں۔" نوری کو اپنی ماں کی بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی لیکن اس نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی کچھ کہنے سے گریز کیا۔

نوری کو اپنی ماں کا اس طرح پیغام بھجوانا کچھ عجیب سا لگا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت اسے احسان لکھنوی کی مسکراہٹ پر ہوئی تھی۔

"آپ واقعی بہت ہوشیار کاروباری ہیں۔" نوری نے احسان لکھنوی کو اپنی ماں سے یہ کہتے ہوئے سنا لیکن ماں نے جواب میں کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔

"بائی جی میں پہلے ایک شاعر تھا۔ بعد میں مصنف بنا اور اب میرا ارادہ اپنی فلم بنانے اور اس کی ہدایت کاری کا ہے۔" نوری کا دل اتنا سنتے ہی بلیوں اچھلنے لگا۔ ماں نے کسی بھی طرح کا ردعمل ظاہر کیے بغیر احسان لکھنوی کی اس بات کو خاموشی سے سنا۔

"فلم کا اسکرپٹ میں نے بڑی محنت سے لکھا ہے اور گانے بھی مکمل ہیں۔ یعنی یوں کہہ لیں کہ کاغذی کارروائی بالکل مکمل ہے۔" نوری کو ماں کی خاموشی سے وحشت ہونے لگی تو اس نے چائے کے برتنوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"فلم بنانے کا ارادہ تو کرلیا لیکن ظاہر ہے ایک شاعر یا ادیب کے پاس سرمایہ کہاں کہ وہ فلم کے اخراجات اٹھاتا پھرے اس لیے خرچ کم کرنے کے لیے میں نے پوری نئی کاسٹ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔" احسان لکھنوی نے بولتے ہوئے رک کر نوری کی جانب دیکھا جو ہاتھ میں چمچہ لیے اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن ساتھ ہی ایسے ڈسٹرب بھی نہیں کرنا چاہ رہی تھی اس لیے خاموش تھی۔

"ڈیڑھ چمچہ۔" احسان لکھنوی نے اس کی خاموشی کی زبان سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک اور بڑا خرچ سیٹ کا تھا تو میں نے اسکرین پلے ہی اس انداز کا لکھا ہے کہ اس میں سیٹ بہت کم ہیں اور زیادہ تر آؤٹ ڈور میں فلم بنے گی۔ ساتھ ہی میں نے یہ کیا ہے کہ کچھ ایسی جگہیں منتخب کرلی ہیں جن پر کوئی خرچ نہیں آئے گا۔ جیسے کچھ دوستوں کے ڈرائنگ روم ہیں یا پھر ایک دو دفتر کے سین ہیں۔ وہ ہم اور ریجنل جگہوں پر فلم بند کرلیں گے۔" احسان لکھنوی تیزی سے اپنے مقصد کی طرف آرہا تھا لیکن نوری یہ نہیں سمجھ پارہی تھی کہ آخر وہ اتنی لمبی تمہید کیوں باندھ رہا ہے۔

"اس کے باوجود ایک کلب کا سیٹ اور ایک غریب ہیروئن کے گھر کا سیٹ ایسا ہے جو ہمیں ہر صورت میں لگانا ہی پڑے یعنی اس سے بچنا ممکن ہی نہیں ہے۔" احسان لکھنوی کی تمہید طویل سے طویل تر ہوتی جارہی تھی اور ساتھ ہی نوری کو بوریت کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی احسان لکھنوی کے سامنے رکھی تو اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"اس کے علاوہ بھی ان گنت اخراجات ہیں لیکن انہیں پورا کرنے کے لیے کچھ ابتدائی رقم میرے پاس ہے کچھ رقم فلم کے بکتے ہی ڈسٹری بیوٹرز سے آجائے گی لیکن اصل تعاون وہ دوست کررہے ہیں جنہیں میں اپنی فلم میں بریک تھرو دے رہا ہوں۔" احسان لکھنوی اپنی گفتگو کو یہاں تک پہنچا کر خاموش ہوگیا۔

''یعنی کیسا تعاون۔۔۔؟'' نوری کو اتنی دیر میں پہلی بار اپنی ماں کی آواز سنائی دی ورنہ اب تک تو وہ بڑی خاموشی اور توجہ کے ساتھ احسان لکھنوی کی گفتگو سنتی رہی تھی۔

''صرف اتنا سا تعاون کہ ہر کردار اپنے اخراجات خود برداشت کر رہا ہے۔'' احسان لکھنوی نے چائے کی پیالی کو ہونٹوں سے الگ کرنے کے بعد کہا۔

''ان اخراجات میں ان کی کاسٹیوم اور ابتدائی طور پر رہنے اور کھانے کے خرچ کے علاوہ ضائع ہو جانے والی فلم کی ریل کے اخراجات شامل ہیں۔'' احسان لکھنوی نے اپنا نظریہ پوری طرح بیان کرنے کے ساتھ کہا۔

''یہ آخری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' نوری کی سمجھ میں تو ابتدائی بات بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اس نے اس کے باوجود بھی ماں کی طرح سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

''دیکھیں نئے آرٹسٹ ہوں گے تو ری ٹیک بھی زیادہ ہوں گے۔'' احسان لکھنوی نے سمجھانے والے انداز میں دوبارہ سے کہنا شروع کیا۔

''اب ایک سین کو شوٹ کرتے ہوئے جتنے بھی ری ٹیک ہوں گے۔ اس کے اخراجات اس سین میں موجود سینئر افراد برداشت کریں گے۔'' احسان لکھنوی نے وضاحت کی تو نوری نے اپنی ماں کو کچھ دیر کے لیے گہری سوچ میں پایا۔

''مگر میری بھی ایک شرط ہے۔'' نوری اس وقت اپنی ماں ہی کی طرف دیکھ رہی تھی جب اس نے احسان لکھنوی سے یہ کہا تھا۔ ''میں یہ اخراجات والی رقم شروع میں نہیں دوں گی۔'' نوری کو اپنی ماں کا لہجہ اٹل محسوس ہوا تھا۔

''آپ کے لیے میں یہ رعایت رکھ سکتا ہوں کیونکہ میں اس بات سے اچھی طرح واقف ہوں کہ فلم کے مکمل ہونے اور تھیٹر پر لگنے میں آپ کا کتنا مفاد وابستہ ہے۔'' احسان لکھنوی نے مزید کھل کر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس کے ساتھ ہی ایک شرط آپ کو بھی میری ماننی پڑے گی۔'' احسان لکھنوی کا لہجہ مصالحانہ تھا۔

''فرمائیے۔'' نوری کو اپنی ماں کا لہجہ بھی دوستانہ محسوس ہوا۔

''اس بات کا ذکر آپ کاسٹ کے دوسرے افراد سے نہیں کریں گی۔'' احسان لکھنوی کی شرط کوئی ایسی شرط نہیں تھی کہ جسے ماننے میں کوئی اعتراض ہوتا۔

''ہمیں کیا ضرورت ہے کسی سے کوئی بات کرنے کی۔'' نوری کو اپنی ماں کی آواز میں بشاشت محسوس ہوئی۔

''ٹھیک ہے۔'' احسان لکھنوی نے اطمینان بھرے لہجے میں چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''آپ انہیں لے کر اگر کل وہاں آجائیں جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں تو باقی باتیں بھی ہو جائیں گی۔'' نوری کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے احسان لکھنوی جانے کی تیاری کر رہا ہو۔ جبکہ نوری کی خواہش تھی کہ وہ ابھی نہ جائے۔

''میں آپ کو پتا اور فون نمبر لکھ کر دے دیتا ہوں۔'' وہ رک رک کر گفتگو کر رہا تھا۔

پتا لکھنے کے لیے احسان لکھنوی نے قلم اپنے پاؤں سے ہی نکالا لیکن کاغذ کے لیے جب نظر دوڑانے کے باوجود اسے کچھ نظر نہیں آیا تو اس نے نوری سے کاغذ کے لیے کہا لیکن اس طرح کی چیزوں کا اس گھر میں استعمال تھا کب جو نوری کو بھی کاغذ مل جاتا۔

''آپ اس کے پیچھے لکھ دیں۔'' نوری کی ماں نے بیٹی سے زیادہ سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے ایک پرانا رسالہ اسے تھماتے ہوئے کہا۔

احسان لکھنوی نے ایک لمحے کے لیے رسالے کو پلٹ کر دیکھا اور پھر رسالے کی پشت پر خالی جگہ پر وہ ایڈریس لکھنے لگا۔ ساتھ ہی وہ نوری کی ماں کو پتا سمجھاتا بھی جا رہا تھا۔ جو ڈیفنس کا نام سن کر پہلے ہی مرعوب ہو چکی تھی۔

''رول تو ہیروئن کا ہی ہے نا؟'' وہ سوال جو نوری کے خیال میں پہلے کر لینا چاہیے تھا، اس کی ماں نے اب کیا تھا۔

"یہ پتا جو میں آپ کو سمجھا رہا ہوں ہیروئن کے گھر کا ہی ہے۔" احسان لکھنوی نے فون نمبر لکھنے کے بعد رسالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"دراصل کہانی میں ہیروئن کی عمر سولہ سترہ سال کی ہے۔" احسان لکھنوی نے بات سمجھانے والے انداز میں کہا لیکن نوری کی ماں درمیان میں کود پڑی۔

"ہماری نوری بھی ابھی اٹھارہ کی ہی ہوئی ہے۔"

نوری نے حیرت سے ماں کو دیکھا تھا۔ ایک ہی جھٹکے کے ساتھ ماں نے اس کی عمر میں چھ سال کا جھٹکا کر دیا تھا۔ باقی معاملات میں تو پھر بھی ٹھیک تھا لیکن سامنے بیٹھا ہوا شخص کسی بھی صورت میں اسے اٹھارہ کیا اکیس کا بھی ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا بلکہ اس کا احساس تو خود ماں کو بھی تھا تب ہی ماں نے پچھلے کوئی سال بھر سے اسے اکیس کا کہنا بھی ترک کر رکھا تھا۔

"ہوسکتا ہے آپ ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں لیکن ان کی اٹھان ایسی ہے کہ لگتی نہیں ہیں۔" احسان لکھنوی نے بڑی خوب صورتی سے درمیانی راستہ نکالا تھا۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ ہم اتنا خرچ بھی کریں اور رول بھی ہیروئن کا نہ مل سکے۔" نوری کو ماں کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی لیکن احسان لکھنوی نے اس معاملے کو بھی بڑی سمجھ داری سے ہینڈل کیا۔

"دیکھیں اگر فلم ہٹ ہوگئی تو ہم سب ہٹ ہوجائیں گے کیا ہیرو۔ کیا ڈائریکٹر یا کیا کوئی اور۔" احسان لکھنوی نے مستقبل کے سہانے خوابوں میں رنگ بھرنے والے انداز میں کہا۔ نوری کے ساتھ اس کی ماں نے بھی سوچا کہ وہ کچھ غلط بول گئی ہے۔

"لیکن اگر فلم ہی پٹ گئی تو باقی لوگوں کا تو نقصان اپنی جگہ لیکن ہیرو اور ہیروئن کو دوسری فلم نہیں ملنے کی۔" نوری نے سوچا کہ اگر احسان لکھنوی فلمی دنیا میں آنے کے بجائے ابتدا میں کسی کمپنی میں کمیشن پر سیلز مین بھرتی ہوجاتا تو بال سفید ہونے سے پہلے پہلے کروڑ پتی بن سکتا تھا۔

"چلیں آپ جیسا کہتے ہیں۔" نوری کو اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔ احسان لکھنوی اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ جب تمام معاملات طے ہو گئے تھے تو اس نے یہی سوچا تھا کہ اب یہاں رکنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے لیکن نوری کی ماں کے لیے یہ بات اچنبھے کی تھی کہ اس کی اتنی کھلی آفرز کے باوجود کوئی بھی شخص اس طرح دامن بچا کر جا رہا ہو۔

"وہ چھوٹو آتا ہی ہوگا۔" نوری کی ماں نے احسان لکھنوی کو کچھ یاد دلانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

"میں نے آپ سے عرض کی تھی کہ مجھے کہیں اور بھی جانا ہے۔" احسان لکھنوی نے بھی اپنا کہا ہوا یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"اتنی رات گئے کہاں جائیں گے آپ؟" نوری کی ماں نے آخری کوشش کے طور پر کہا لیکن احسان لکھنوی نہ رکنے کا فیصلہ کیے بیٹھا تھا۔

"یہاں سے لوگ رات گئے ہی جاتے ہیں۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"نہیں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سویرے بھی جاتے ہیں۔" نوری نے اس پوری گفتگو میں پہلی بار براہ راست حصہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ دل سے نہیں چاہتی تھی کہ احسان لکھنوی اس طرح چلا جائے لیکن احسان لکھنوی نے اسے مسکرا کر دیکھنے کے باوجود اس کی خواہش کو پوری کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

"بہت سے معاملات میں آپ مجھے کچھ نہیں، بہت سے لوگوں سے مختلف پائیں گی۔" احسان لکھنوی نے ایک بار پھر اجازت طلب کی۔

"کل صبح گیارہ بجے تک پہنچ جائیے گا۔" اس نے جانے سے پہلے ایک آخری بار یاددہانی کے طور پر کہا۔ نوری اور اس کی ماں دونوں نے ایک ساتھ "بالکل۔ بالکل" کہہ کر اسے رخصت کیا۔

احسان لکھنوی کے جانے کے بعد نوری کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ دوبارہ مجرے میں جا کر بیٹھے لیکن اس کی ماں نے کچھ اس انداز میں اسے جھڑکا تھا کہ وہ بغیر کچھ چوں وچرا کیے بڑے کمرے میں آگئی۔

"آگئی بھئی ہماری ہیروئن آگئی۔" ایک پرانے

اس بین نے اسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ جسے نوری مسکراتے ہوئے اپنے خاص انداز میں دیکھا تھا۔
''کیوں بناتے ہیں مرزا صاحب۔'' اس نے اپنے کرم فرما پر نوازشانہ انداز میں کہا۔
''ارے ہم تو پہلے ہی سے جانتے تھے کہ اس کوٹھے پر ایک بڑی فنکارہ رہتی ہے۔'' مرزا سجاد کے نام سے پہچانے والے ان صاحب نے اس کی بڑی بہن کے زمانے سے یہاں آنا شروع کیا اور جیسا کہ ان گلیوں کا دستور ہے کہ مستقل آنے والوں کا اگر کوئی مضبوط ذریعہ آمدنی نہ ہو تو اس کی معاشی حالت تباہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ سو یہی کچھ مرزا کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ ابتدا میں روزانہ کار میں آتا تھا لیکن اب ہفتے میں ایک دوبار رکشا یا ٹیکسی سے آتا تھا لیکن آتا ضرور تھا۔ البتہ پہلے اور اب میں یہ فرق ضرور تھا کہ پہلے محلے کے دیگر کوٹھوں پر بھی جھانک آتا تھا لیکن اب جب بھی آتا سیدھا ان ہی کے یہاں آتا اور پھر یہیں سے رخصت ہو جاتا تھا۔
''لیکن بائی جی آپ بھی خوب ہیں۔'' اس بار مرزا نے نوری کی ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''اتنا بڑا واقعہ ہو گیا اور آپ نے منہ تک میٹھا نہیں کروایا۔'' نوری کے وہاں پہلا قدم رکھتے ہی گانے بجانے کا عمل رک چکا تھا۔
''مٹھائی آپ سے بڑھ کر ہے کیا؟'' ماں نے بڑی صفائی سے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔
''بس صبح پہلے بڑے آستانے پر حاضری دے لوں۔'' نوری ماں کی اس بات پر دل ہی دل میں اس کی عقل مندی پر اش اش کر اٹھی۔
''آپ تو پرانے آنے والے ہیں اتنا تو جانتے ہی ہوں گے کہ ہمارے یہاں خوشی کی پہلی مٹھائی بڑے آستانے پر ہی جاتی ہے۔'' ماں نے ایک ایسی بات کہی جس کے بعد کسی کے لیے بھی کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی۔
''کل آیئے گا کل کے بعد آپ کے لیے یہاں مٹھائی ہی مٹھائی ہوگی۔'' ماں نے نوری کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ نوری کو ایک ساتھ کئی ان شاء اللہ کی آوازیں سنائی دی تھیں۔
''تو پھر کل تک کے لیے نوری سے کوئی میٹھی سی چیز ہی سنوا دیں۔'' مرزا سجاد نے ترنگ میں آتے ہوئے کہا اور ماں نے اس کے ساتھ ہی بیٹی کو اشارہ کیا۔
اس رات محفل زیادہ دیر تک جمی نہیں تھی کیونکہ ایک گھنٹے بعد ہی ماں نے اسے اشارہ کیا تھا۔ نوری طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر اٹھ آئی تھی۔ اس کے وہاں سے اٹھنے کے کچھ ہی دیر بعد محفل ویران ہو گئی تھی لیکن جتنی دیر بھی نوری گاتی رہی تھی اس نے محسوس کیا کہ لوگ آج کچھ زیادہ ہی مہربان ہو رہے تھے۔ اس نے اس بات کا ذکر ماں سے بھی کیا تو اور ماں نے مسکرا کر اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔
''یہ تو کچھ بھی نہیں اب تو اس گھر پر نوٹوں کی بارش ہوگی بارش۔'' ماں کے ساتھ نوری کی دونوں بہنیں بھی سہانے خوابوں میں ڈوب گئیں۔
اگلی صبح جب ماں نے نوری کو آٹھ بجے ہی اٹھوا دیا تو نوری کسی طرح بھی اٹھنے کے لیے تیار نہیں ہو رہی تھی۔
''اری کیا احسان صاحب کا کہا تو سنا نہیں تھا۔'' ماں نے سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔
''مگر اماں انہوں نے تو گیارہ بجے بلوایا تھا۔'' اس نے پھر آنکھیں موندنی چاہی تھیں لیکن ماں بھی کسی جلاد کی طرح اس کے سر پر مسلط ہی رہی۔
''تو کیا سیدھی وہیں منہ اٹھا کر چلی جائے گی۔'' ماں نے جھاڑ پلانے والے انداز میں کہا۔ تب نوری کو اندازہ ہوا کہ رات ماں نے بڑے آستانے پر حاضری دینے والی جو بات کی تھی وہ محض بہانہ نہیں تھا بلکہ اس میں حقیقت بھی تھی۔
''لیکن اماں کچھ دیر تو اور۔۔۔'' اس نے کسل مندی سے کروٹ لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا مگر وہ بھی اسی کی ماں تھی۔
''چل بیٹا اٹھ جا سستی نہ دکھا۔'' اب کی بار ماں نے پیار سے اس کے ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

''ایسا نہ ہو کہ تیری سستی کی وجہ سے ہماری بدلتی ہوئی تقدیر ہی ہم سے روٹھ جائے۔'' نوری اس وقت ایک گھنٹے کی مزید نیند کے لیے بہت سی باتیں برداشت کر سکتی تھی لیکن ماں کی یہ بات اس کے لیے ایک ایسا تازیانہ ثابت ہوئی تھی جس نے فوراً ہی اس کی دونوں آنکھیں کھول دیں۔

''تم بھی اماں۔'' اس نے اٹھنے کے بعد دیوار کی ٹیک سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''چل اب جلدی سے اٹھ بھی جا۔'' ماں نے اسے دیوار سے ٹیک لگانے پر بھی چین نہیں لیا تھا۔

''آج پہلا دن ہے اور آدھا ایک گھنٹا تو ہمیں مکان ڈھونڈنے میں بھی لگے گا۔'' ماں نے کمرے سے جانے سے قبل کہا۔

بچپن سے جوانی تک نوری نے یہی دیکھا تھا کہ ان کے محلے کا سورج ایک بجے کے بعد ہی نکلنا شروع ہوتا تھا لیکن اس روز ماں نے اتنے سویرے سورج نکال دیا تھا کہ نوری کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے لیکن ماں کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ اس کے کانوں میں تازہ ہوئے تو اسے بستر چھوڑتے ہی بنی۔

اس نے ایک نظر دونوں بہنوں کے بستر پر ڈالی تو وہ دونوں بھی اسے بستر پر نظر نہیں آئی تھیں۔

''رات تو یہ دونوں تھیں۔'' نوری نے سونے سے پہلے کے واقعات کو ذہن میں تازہ کیا۔ جب ماں نے زبردستی شور مچا کر سونے پر مجبور کر دیا تھا۔

''ارے بے شرموں اگر تمہیں جگانا ہی تھا تو میں ان رکنے کے لیے تیار لوگوں کو کیوں ٹالتی۔'' ماں نے بہنوں کو آپس میں باتیں کرنے سے روکتے ہوئے کہا تھا۔

''کہیں گئی ہیں یہ لوگ سویرے سویرے۔'' نوری یہ سوچتے ہوئے باہر نکلی تو اسے دونوں ہی بہنیں کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آئیں۔

بڑی اس کے کپڑوں پر استری کر رہی تھی تو دوسری باورچی خانے میں مصروف نظر آئی تھی۔ نوری کو اس طرح ان دونوں کے سویرے اٹھ جانے اللہ کام میں مشغول دیکھ کر حیرت تو ہوئی لیکن اس لیے زبان سے کچھ بھی نہیں کہا۔

''نوری پانی گرم ہو گیا ہے لے جا۔'' باورچی خانے سے دوسری بہن نے نوری کو کمرے سے باہر نکلتا دیکھ کر آواز لگائی لیکن نوری کے کچھ کہنے سے قبل ماں بول پڑی۔

''پاگل ہوئی ہے تو بھی۔'' ماں نے غصے سے اسے ڈانٹا۔ ''گرم پانی لے جاتے ہوئے اگر وہ کہیں ہاتھ پیروں پر گرا بیٹھی تو۔'' ماں نے کچھ ایسے کہا جیسے نوری یہ کام پہلی بار کر رہی ہو۔

''اماں آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔'' بہن کو شرمندہ ہوتا دیکھ کر نوری کو ہی دخل دینا پڑا۔ نوری دراصل یہ کہنا چاہتی تھی کہ ''میں بچپن سے باورچی خانے سے گرم پانی غسل خانے تک لے جاتی رہی ہوں لیکن ماں نے اسے یہ کہنے کی مہلت ہی نہیں دی۔

''باؤلی برا وقت کوئی پوچھ کر تھوڑی ہی آتا ہے۔'' نوری کو محسوس ہوا کہ بات اس کی ماں بھی غلط نہیں تھی۔ جن لوگوں کے ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر اناڑی بھی نہیں ہوتے ہیں لیکن برے وقت کی کرم فرمائی سے ان کی تمام مہارت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو نوری شاید اس بات پر ہمیشہ کی طرح کچھ ہچر مچر کرتی لیکن اس وقت ماں کی باتیں سن کر وہ کچھ ایسی کنفیوژ ہوئی کہ جیسا ماں کہتی رہی، وہ بالکل ویسا ہی کرتی چلی گئی۔ اچانک حاصل ہو جانے والی اس خوشی کو وہ کسی معمولی سی غلطی سے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ تب ہی وہ بالکل ویسا ہی کرتی چلی گئی جیسا کہ اس کی ماں نے کہا تھا۔

احسان لکھنوی کے دیے گئے پتے پر وہ وقت سے آدھا گھنٹا پہلے ہی پہنچ گئیں لیکن اس کے باوجود بھی احسان لکھنوی انہیں پوری طرح سے تیار بلکہ انتظار کرتا ہوا ملا تھا۔

''آپ تو اپنے دیے گئے وقت سے پہلے آ گئی

ہیں لیکن باقی لوگ لیٹ ہیں۔'' احسان لکھنوی کے لہجے میں ناراضگی صاف جھلک رہی تھی۔

''کسی فلم میں ذرا سا بھی رول مل جائے تو آج کل کے لڑکے لڑکیاں خود کو کسی سپر اسٹار سے کم نہیں سمجھنے لگتے ہیں۔'' اس نے اسی ناراض لہجے میں کہا۔

''سپر اسٹارز کی اور باتیں تو ان میں آ نہیں سکتیں۔ البتہ دیر سے آ کر یہ لوگ اپنے اس احساس کمتری کا اظہار ضرور کرتے ہیں۔'' احسان لکھنوی نے اپنے دل کا غبار نکالنا شروع کیا تو نوری کی ماں نے بھی اچھا چانس سمجھتے ہوئے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

''باقی لوگوں کی تو پھر خیر ہے لیکن اگر ہیرو ہیروئن ہی تنگ کرنے لگیں تو بڑی مشکل آتی ہوگی۔'' نوری نے ماں کی چالاکی سمجھتے ہوئے اسے داد دینے والی نظروں سے دیکھا تھا لیکن احسان لکھنوی نے فوراً ہی ماں بیٹی کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

''ہیروئن کے گھر میں تو آپ موجود ہیں اور ہیرو کو میں نے خود تین بجے بلوایا تھا۔'' احسان لکھنوی کا چھوٹا سا فقرہ ختم ہوا تو نوری نے پہلی بار اس کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا جہاں وہ لوگ اس وقت بیٹھے تھے۔

''آپ نے ناہید کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ کسی زمانے میں وہ نمبر ون ہیروئن کہلاتی تھیں۔'' احسان لکھنوی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ تو شادی کے بعد ملک چھوڑ کر ہی چلی گئی تھیں۔'' نوری کی ماں خود کو بولنے سے نہ روک سکی۔

''جی ہاں۔'' احسان لکھنوی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا ''ان کے جانے کی خبر تو سب کو ہے لیکن پانچ سال پہلے جب وہ لوٹ کر ملک واپس آئیں تو یہ خبر صرف چند افراد ہی تک محدود رہی تھی۔'' احسان لکھنوی نے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''فلم کی ہیروئن ناہید کی بیٹی ہے۔'' احسان لکھنوی نے ماں اور نوری کی نظروں میں ابھرنے والے سوالوں کے لبوں پر آنے سے پہلے ہی جواب دے دیا۔

''نوری کے لیے آپ نے کون سا رول سوچا ہے؟'' ماں نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''بظاہر تو یہ ایک منفی رول ہے لیکن اس میں ایکٹنگ کی بڑی گنجائش ہے'' احسان لکھنوی نے گولی پر چینی کی تہ چڑھاتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

''یہ ایک کلب ڈانسر کا کردار ہے جو ہیرو کی محبت میں گرفتار ہوتی ہے لیکن جب ہیرو اس کی جانب متوجہ نہیں ہوتا تو کلب کے مالک کے ساتھ مل کر مختلف سازشیں کرتی ہے لیکن فلم ختم ہوتے ہوئے اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی جان دے کر ہیرو اور ہیروئن کے ملنے کی راہ ہموار کر دیتی ہے۔''

احسان لکھنوی نے مختصراً کردار کے بارے میں بتایا لیکن نوری کی ماں نے اس پر کچھ ایسا منہ بنایا جیسے اسے احسان لکھنوی کی بات پسند نہیں آئی ہو۔

''ہم تو کچھ اور ہی سوچ کر آئے تھے۔'' نوری کی ماں نے قدرے توقف کے بعد کہا لیکن احسان لکھنوی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، یہاں تک کہ اس نے یہ پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا کہ وہ کیا سوچ کر آئی تھی بلکہ اس کے برعکس اس نے نوری کو مخاطب کیا۔

''تم اسی طرح خاموش رہتی ہو یا کچھ بات بھی کر لیتی ہو؟''

اس نے سوال نوری سے کیا لیکن جواب نوری کی ماں نے دیا تھا ''باتیں بھی کرتی ہے اور بہت باتیں کرتی ہے۔''

احسان لکھنوی نے اس کے ساتھ ہی اس کی ماں کو دیکھا اور پھر پہلی بار تنبیہہ کی ''بہتر ہے آپ اسے بولنے دیں تاکہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ سیٹ پر جانے سے قبل کتنی محنت درکار ہوگی۔''

نوری کی ماں منہ بنا کر خاموش ہوئی تو احسان لکھنوی نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا ''ڈائیلاگ وغیرہ تو یاد کر لو گی؟''

''جی!'' نوری نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

''پڑھا کہاں تک ہے؟'' احسان لکھنوی نے ایک اور سوال کیا اور نوری نے ماں کی جانب دیکھا۔

''ہم اپنی بچیوں کو اسکول کیسے بھیج سکتے ہیں۔''
ماں نے نوری کی مدد کرنے کی غرض سے زبان کھولنی چاہی لیکن احسان لکھنوی نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

''اردو پڑھ لیتی ہو؟'' احسان لکھنوی نے نوری سے سوال کیا اور نوری کی گردن نفی میں ہل گئی۔

احسان لکھنوی اس کے بعد کچھ سوچ میں ڈوب گئے اور نوری کا جی چاہا کہ وہ اس کے ساتھ ہی وہ داستان سنا دے جس کی وجہ سے وہ اسکول جانے سے رہ گئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بتا دے کہ اختری پانچویں جماعت میں تھی، جب اس کے اسکول میں یہ پتا چل گیا کہ اختری طوائف زادی ہے اور اس کے ساتھ ہی شریفوں نے اختری کا نام اسکول سے کٹوانے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ وہ اس وقت تک دباؤ ڈالتے رہے جب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو گئے۔

''یہ تو پرابلم ہو جائے گا'' احسان لکھنوی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں کہا۔

''میں اچھے سے ماسٹر کا بندوبست کروں گی''
نوری کی ماں نے ہاتھ سے نکلتی ہوئی ڈور کو قابو کیا۔

''ایسا ہو جائے تو اور بھی اچھا ہو جائے گا'' احسان لکھنوی نے اس بار اس کے بولنے پر اعتراض نہیں کیا۔

''کوئی ایسا ٹیوٹر مل جائے جو صحیح تلفظ کے ساتھ ڈائیلاگ بھی یاد کرا دے تو میرا کام بھی آدھا رہ جائے گا۔''

احسان لکھنوی کی بات ماں کی سمجھ میں پورے طور پر نہ آ سکی لیکن اس نے پورے خلوص سے سر ہلاتے ہوئے دو بار ''ہو جائے گا'' کی گردان کی۔

ان کی گفتگو ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ گھر کے اندر کی جانب سے گھر کی مالکن برآمد ہوئی۔ وہ گزرے ہوئے کل کی ہیروئن تھی لیکن پہلی نظر ڈالتے ہی نوری کو یوں محسوس ہوا جیسے اگر وہ چاہے تو آج بھی ہیروئن بن سکتی ہے لیکن ناہید کا صرف پہلا تاثر ہی نوری پر اچھا رہا تھا کیونکہ تعارف کے فوراً بعد ناہید نے جس انداز میں احسان لکھنوی سے اس کے بارے میں سوال کیا تھا، اس سے نوری کے دل میں گرہ پڑ گئی تھی۔

''میرے خیال میں اس بار آپ کو اپنے انتخاب پر شرمندگی ہی ہو گی۔'' ناہید نے احسان لکھنوی سے کہا۔ نوری کی توقعات کے خلاف احسان لکھنوی نے اس کے تبصرے پر وہ انداز نہیں اپنایا جو اس نے نوری کی ماں کے ساتھ رکھا تھا۔

''میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے'' احسان لکھنوی نے اس انداز میں کہا جیسے کوئی بچہ کلاس میں استاد کے سوال کا جواب دے۔

''ہو سکتا ہے آپ صحیح کہہ رہے ہوں لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ایک بار پھر اپنے انتخاب پر غور کر لیں کیونکہ مجھے تو اس لڑکی کی عمر بے بی کے مقابلے میں بہت زیادہ معلوم ہو رہی ہے۔''
ناہید گفتگو احسان لکھنوی سے کر رہی تھی لیکن جس انداز میں وہ بات کر رہی تھی، اس سے نوری کو اپنے لیے صرف ہتک محسوس ہو رہی تھی۔

''میں نے ہر چیز پر غور کرنے کے بعد ہی انتخاب کیا ہے'' احسان لکھنوی نے جواب میں کہا لیکن نوری کو اس کا انداز بھی کچھ مودبانہ سا محسوس ہوا تھا۔

''دیکھ لیں'' ناہید نے ایک بار اپنے صحیح ہونے پر اصرار کیا۔ ''اس فلم سے میری بیٹی کا مستقبل وابستہ ہے۔'' اب بات نوری کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی اور قریب تھا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ جاتی کہ احسان لکھنوی نے ناہید سے نظریں چرا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر خود ناہید سے مخاطب ہوا۔

''اس فلم سے خود میرا اپنا مستقبل بھی وابستہ ہے۔'' احسان لکھنوی نے گویا ناہید کو یاد دلانے کی کوشش کی تھی اور جواب میں ناہید کاندھے اچکاتے ہوئے اس طرح وہاں سے واپس بھی چلی گئی جس انداز میں آئی تھی اور پھر قبل اس کے کہ فوری کچھ کہہ پاتی، احسان لکھنوی نے اسے مخاطب کیا۔

''تم جس بھی شعبے کا انتخاب کرو گی، اس میں ابتدائی طور پر تمہیں نہ صرف محنت بہت زیادہ کرنی

گی بلکہ اپنا مزاج بھی سرد رکھنا ہوگا پھر ایک بار جب کامیابی تمہارے قدم چوم لے گی تو پھر دنیا کو اپنے آگے جھکا سکتی ہو۔"

احسان لکھنوی جس انداز میں بول رہا تھا، وہ نوری کو بہت بھلا معلوم ہوا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بولتا رہے اور وہ اسی طرح خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھی سنتی رہے۔ وہ احسان لکھنوی کی آواز کے سحر میں کچھ اس انداز میں کھوگئی تھی کہ اسے اس وقت ہوش آیا جب احسان لکھنوی نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد دوبارہ اسے مخاطب کیا "کیا خیال ہے، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں" نوری نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ وہ خود میں ہمت نہیں پاتی تھی کہ احسان لکھنوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی تصدیق کی تردید کر سکے۔

"یہ تو کہہ سکتی ہو کہ پوری طرح محنت کروں گی اور ذہن ٹھنڈا رکھوں گی۔"

اس بار نوری نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اس نے احسان لکھنوی کو اپنی جانب مسکراتا ہوا دیکھا تھا۔ اس کی نظریں ایک بار پھر جھک گئیں۔

"میں وعدہ کرتی ہوں" نوری نے جھکی نظروں کے ساتھ کہا۔ "آپ جیسا کہیں گے، میں ویسا ہی کروں گی۔"

فقرے کا دوسرا حصہ اس نے ایک لمحہ رک کر ادا کیا تھا اور خود اسے بھی یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ اس نے کس طرح ادا کیا تھا اور کیوں ادا کیا تھا۔ بس ایک بے اختیاری سی کیفیت تھی جس میں وہ کہتی چلی گئی تھی لیکن فقرہ مکمل کرتے ہی اسے یہ محسوس ہوا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام کرلیا ہو البتہ اتنی سکت خود اس میں نہیں رہی تھی کہ نظریں اٹھا کر ہی سہی اس فقرے کا ردعمل دیکھ لیتی۔

"اور یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر تم میری بات مانتی رہیں تو میں تمہیں وہاں پہنچادوں گا جہاں لوگ تمہاری کامیابی کی مثالیں دیا کریں گے۔" احسان لکھنوی نے یہ کہتے ہوئے پہلی بار اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور نوری کے بدن میں ایک جھرجھری سی آگئی۔

اپنی اس کیفیت پر نوری کو اگلے ہی لمحے حیرت بھی ہوئی تھی لیکن جب اس نے احسان لکھنوی کی جانب نگاہ اٹھائی تو اس کے چہرے پر کوئی ایسے تاثرات دکھائی نہیں دیے جو نوری سوچ رہی تھی۔

پہلے دن ہی احسان لکھنوی نے بقیہ افراد کے آنے پر واضح طور پر بتا دیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر ڈسپلن کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرے گا۔ اس نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ پہلے پندرہ دن وہ ہر ایک کو الگ الگ کیمرے کا سامنا کرنے اور ڈائیلاگ ڈلیوری کے بارے میں بتائے گا اور اس کے بعد ریہرسل کا سلسلہ شروع ہوجائے گا اور فلم کے مکمل ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ایک بات نوری نے پہلے دن بطور خاص نوٹ کی کہ اس کے علاوہ تمام افراد کا تعلق اس طبقے سے تھا جہاں گلیمر کے لیے کچھ بھی کرنے کا رواج عام تھا۔ یہ بات بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکی کہ تقریباً تمام ہی لڑکے لڑکیاں اداکاری کے بارے میں غیر سنجیدہ ہیں۔

نوری کے علاوہ یہ بات اس کی ماں نے بھی نوٹ کی تھی اس لیے باہر نکلتے ہی اس نے اپنی رائے کا اظہار بھی کردیا کہ "یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔" لیکن نوری نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

"میرا تو خیال ہے کہ احسان صاحب وقت سے پہلے ہی فلم بنالیں گے۔"

ماں نے چونک کر نوری کی جانب دیکھا کیونکہ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ نوری نے اس کی مخالفت میں زبان کھولی ہو۔

"دھیلا ایک نہیں ہے اس کے پاس اور چلا ہے فلم بنانے" ماں نے احسان لکھنوی پر تبصرہ کیا۔

نوری اس کے جواب میں بولی تو کچھ نہیں تھی لیکن اگر اس کی ماں اس وقت نوری کی جانب دیکھ لیتی تو اسے اور زیادہ حیرت ہوتی کیونکہ نوری نے کچھ

اس طرح سے ماں کو گھور کر دیکھا تھا جیسے اگر ماں نے مزید کچھ کہا تو وہ ماں سے لڑ پڑے گی۔

''لیکن ابھی یہ بات وہاں کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ماں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ نوری نے سکون کا سانس لیا ورنہ ماں نے جس انداز میں بات کا آغاز کیا تھا، اس سے تو نوری کو یہ محسوس ہوا تھا کہ کہیں ماں اسے کل ہی آنے سے نہ روک دے۔

محلے میں پہنچنے کے بعد نوری کو ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب انہیں آتا دیکھ کر تقریباً ہر گھر سے کوئی نہ کوئی ضرور آیا تھا پھر یہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک محفلیں سجنے کا وقت نہیں آ گیا۔ دوسری حیرت نوری کو اس وقت ہوئی جب اس نے ماں کو گھر میں داخل ہوتے ہی مٹھائی کا آرڈر دیتے ہوئے سنا۔ نوری کو آرام کے لیے اندر بھیج کر اس کی ماں نے ہر آنے والے کے سامنے فلم والوں کی تعریفوں میں ایسی باتیں کیں کہ ہر آنے والا متاثر نظر آنے لگا۔

نوری کا خیال تھا کہ ماں کے جھوٹ کا یہ سلسلہ محلے والوں کے جانے کے بعد ختم ہو جائے گا لیکن جیسے جیسے شام ڈھلتی گئی، جھوٹ کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ محفل سجنے کے بعد تو اس جھوٹ میں نئے اضافے ہوتے چلے گئے حالانکہ نوری کو ماں نے دیر سے آنے کی خصوصی ہدایت کی تھی پھر جب یاں کے بلانے پر نوری پہنچی تو محفل میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔

''اب چند دن تو رہ گئے ہیں تمہارے یہاں کم از کم اس میں تو ہمیں نہ تڑپاؤ'' مرزا صاحب نے اسے داخل ہوتا دیکھ کر تبصرہ کیا اور جواب میں نوری صرف مسکرا کر رہ گئی۔ اس روز جب تک نوری وہاں موجود رہی، لوگ اس کی جانب متوجہ رہے۔ اختری اور سروری نے اس روز بھی ہر روز کی طرح اپنی ڈیوٹی نبھانے کی کوشش کی لیکن نظریں نوری کا ہی طواف کرتی رہی تھیں۔

اس روز معمول سے زیادہ لوگ تھے لیکن نوری وہاں زیادہ دیر رکی نہیں اور ماں کا اشارہ ملتے ہی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ آئی۔ اس روز نوری کو اپنی طبیعت میں ایک عجیب سی بات یہ محسوس ہوتی رہی تھی کہ وہ اکیلے میں سوچتے رہنا چاہتی تھی۔ کیا سوچنا چاہتی تھی یہ وہ خود بھی نہیں جان رہی تھی، بس ایک عجیب سی سوچ تھی جو احسان لکھنوی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی تھی۔ وہ آنکھ بند کرتی تو وہ سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا پھر تو نوری اس سے کچھ کہتی نہ وہ نوری سے کچھ کہتا۔ یہاں تک کہ کوئی نوری کو مخاطب کر لیتا اور نوری آنکھ کھول دیتی اور سب کچھ ختم ہو جاتا۔

اس رات ماں نے اسے جلدی سونے کی ہدایت کی ''صبح تجھے وہاں جانا بھی ہے۔''

نوری ماں کی ہدایت پر آنکھ بند کر کے لیٹ تو گئی لیکن نیند اس سے دور رہی البتہ صبح کسی کے اٹھائے بغیر ہی اس کی آنکھ خود ہی کھل گئی تھی۔ اختری اور سروری کو موجود نہ پا کر نوری نے خود ہی اپنا کام شروع کر دیا کیونکہ ماں بھی سویرے سے غائب تھی۔ نوری کی تیاری ابھی آخری مرحلے میں تھی کہ ماں واپس آ گئی اور آتے ہی اس نے بتا دیا کہ صبح سویرے کہاں چلی گئی تھی۔

''رات رحمتے سے کہا تھا کہ کسی ٹیکسی والے کا بندوبست کر دے جو روز تمہیں لے جائے اور پھر لے بھی آئے'' ماں نے تفصیل بتائی۔

''اور اماں وہ ماسٹر!'' نوری کو اس کے ساتھ میں احسان لکھنوی کی بات بھی آ گئی۔

''اس کا بندوبست میں کل شام ہی کر چکی ہوں'' ماں نے جواب دیا۔

''شام کو آ جائے گا تیرا ماسٹر بھی۔''

ماں نے جس انداز میں بات کی تھی، اس سے نوری نے سمجھا تھا کہ ماں اس کی فلم میں جانے میں مدد کرنا چاہ رہی ہے لیکن نوری کی یہ غلط فہمی زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی۔

''کسی سے فلم کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ماں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"ہر شخص کو یہی معلوم ہونا چاہیے کہ فلم بن
ا ہے۔"

نوری نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں گردن ہلادی۔
ماں سے کسی قسم کی بحث کر کے وہ بات بڑھانا
ں چاہ رہی تھی۔

اس روز ماں نے خود ساتھ چلنے کے بجائے
زی کو نوری کے ساتھ بھیجا تھا لیکن اس روز ابتدا
ے چند منٹ بعد بھی احسان لکھنوی کی توجہ ہیروئن کی
نب ہوگئی تھی۔ ناہید کے آجانے کے بعد تو احسان
ھنوی جو تھوڑی بہت توجہ ادھر ادھر دے رہا تھا، وہ
ی ہیروئن نگار اور ہیرو علیم کی جانب ہوگئی لیکن نوری
ں توجہ اس دوران میں بھی جب کوئی بھی اس کی
نب متوجہ نہیں تھا، پوری توجہ احسان لکھنوی کی
انب تھی۔ اسے احسان لکھنوی کی زبان سے نکلا ہوا
یک ایک لفظ ازبر ہوتا چلا جارہا تھا پھر یہ سلسلہ اس
قت تک رہا جب تک ہیرو اور ہیروئن نے اپنے تھک
انے کا اعلان نہیں کر دیا۔

اس شام جب احسان لکھنوی نے اس سے جاتے
وئے یہ کہا کہ کل وہ اس پر پوری توجہ دے گا تو نوری
ی زبان سے ایک بار پھر ایک فقرہ غیر ارادی طور پر
پھسل گیا "میں تو اس میں بھی خوش ہوں کہ میں آپ
پر پوری توجہ دے رہی ہوں۔"

احسان لکھنوی نے اس کے جواب میں کہا تو
کچھ نہیں لیکن ایک بار غور سے رک کر نوری کو دیکھا
ضرور تھا۔ البتہ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اختری نے اس کے
چٹکی لی تھی۔

"تیرے پر اچانک نکل آئے ہیں۔"

نوری نے جب اس پر بہن کی جانب حیرت
سے دیکھا تو اختری نے ایک اور چٹکی لی "کیسے کہہ
رہی تھی اس بے چارے سے کہ میں تو اس میں بھی خوش
ہوں کہ میں آپ پر پوری توجہ دے رہی ہوں۔"

"وہ ایسے نہیں ہیں" نوری نے اختری کے تبصرے میں احسان لکھنوی کی سبکی محسوس کرتے ہی احتجاج کرنے والے انداز میں کہا۔

"تجھے کیا معلوم کہ وہ کیسا ہے؟" اختری نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے سوال کیا اور نوری کے پاس جواب میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"مرد سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔" اختری نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

نوری نے چاہا کہ وہ ایک بار پھر اس تبصرے پر احتجاج کرے لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو رہی کہ اس سے فائدہ کوئی نہیں ہے۔ بات کسی طرح بھی اختری کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

"دو چار اسی طرح کے ڈائیلاگ تو نے اور بول دیے تو وہ تیرے دوپٹے سے بندھ جائے گا" اختری نے سرگوشی کی لیکن نوری محض ایک سانس لے کر رہ گئی۔

اختری تو اس کے بعد خاموش ہوگئی لیکن نوری کے خوابوں نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا۔ اب تک تو وہ آنکھ بند کرتی تھی تو وہ سامنے آ کھڑا ہوتا تھا لیکن اب کی بار نوری نے آنکھ بند کی تو تصور میں نوری کو کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا۔

"وہ اور لوگوں کی طرح نہیں ہیں اس لیے اگر میں انہیں پسند آگئی تو وہ میرے ساتھ برتاؤ بھی مختلف کریں گے۔" آنکھ بند کرتے ہوئے اس نے تصور کی پہلی منزل طے کی تھی۔ اب کی بار نوری نے آنکھ بند کی تو وہاں ایک جنت آباد تھی۔ ایک چھوٹا سا گھر جس میں وہ تھی اور "وہ" تھے اور "وہ" خاموش بھی نہیں تھے۔ اب کی بار وہ نوری سے باتیں کر رہے تھے، اسے بتا رہے تھے کہ انہوں نے نوری کو کیوں اپنی شریک حیات بنانا پسند کیا تھا۔

"میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ محبت چاہے کسی سے کرو لیکن شادی اس سے کرو جو تم سے محبت کرتا ہو" انہوں نے نوری سے سرگوشی کی تھی اور نوری بند آنکھوں کے ساتھ شرما گئی تھی۔

"احسان آپ بھی۔"

یہ بھی پہلی بار تھا کہ اس نے بھی تصور میں بات کی تھی اور اس کے ساتھ ہی نوری نے انہیں مسکراتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

"مجھے تمہاری چاہت پر یقین تھا اس لیے میں نے تمہارے وعدے پر بھی بھروسا کیا ہے کہ تم اب ایک ہی کی ہو کر رہو گی۔"

نوری کی گفتگو ابھی جاری تھی کہ گھر آ گیا اور نوری کو آنکھ کھولنی پڑی۔ اس نے شاکی نظروں سے ٹیکسی اور ڈرائیور دونوں کو دیکھا لیکن جاندار اور بے جان دونوں تک اس کی شکایت نہیں پہنچ سکی تھی۔

اسی شام وہ ٹیوٹر بھی پہنچ گئے جنہیں نوری کو پڑھانا تھا۔ وہ آتے ہوئے کتابیں ساتھ لائے تھے۔ نوری اس طرح سے ان کے ساتھ مصروف ہوئی کہ ماں کو ٹوکنا پڑا "کیا رات تک بی اے کر لے گی۔۔۔؟"

نوری کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ماں کا حکم ماننا بھی کتنا ضروری ہے۔ وہ اس شام بھی دیر سے محفل میں گئی تھی لیکن وہاں موجود افراد کی وجہ سے اسے جلدی اٹھنا نصیب نہیں ہو سکا۔ ان میں کچھ ایسے افراد بھی شامل تھے جن کی اپنے ہاں آمد کی خواہش محلے کے ہر گھر میں ہوتی تھی۔ اس روز محفل کے رنگ دیکھ کر نوری کو تشویش ہوئی تھی کہ یہاں سے اٹھنے کے بعد بھی وہ اپنی تصور کی دنیا آباد نہیں کر سکے گی لیکن ماں کے اطوار دیکھ کر اسے اطمینان ہوا تھا کیونکہ ماں کو اس نے سرگوشیاں کرنے والوں کو انکار میں سر ہلاتے دیکھا تھا، یہ بات البتہ اسے بعد میں معلوم ہوئی کہ ماں ایسا کیوں کرتی رہی تھی کیونکہ تنہائی ملتے ہی ماں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

"اس حرام زادے کی فلم بنے نہ بنے میری بیٹی میرا گھر نوٹوں سے بھر دے گی" ماں نے خوشی میں جھومنے والے انداز میں کہا۔ نوری کو ماں کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی "کم از کم انہیں گالی تو نہ دیں" نوری نے احتجاج کیا اور ماں نے حیرت سے اسے دیکھا، تشویش اس کی آنکھوں میں اور فکر اس کے ماتھے پر اتر آئی تھی۔

"یہ ان کا ہی تو احسان ہے کہ ہم اس قابل ہوئے ہیں۔" نوری ایک لمحے میں ماں کی تشویش سمجھ گئی تھی۔

"تو میں کون سا غصے میں کہہ رہی ہوں" ماتھے کی سلوٹیں کم کرتے ہوئے ماں نے جواب دیا اور نوری ہنس دی۔

نوری کو ہنسی نہیں آ رہی تھی لیکن وہ جان بوجھ کر آواز سے ہنسی تھی کیونکہ وہ ماں کی تشویش کو پوری طرح دور کرنا چاہتی تھی اور بظاہر ماں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ مطمئن ہو بھی گئی ہے لیکن اگلے روز جب اختری کے بجائے ماں ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوئی تو نوری کو احساس ہو گیا کہ ماں کسی قسم کا رسک لینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس کی حیثیت اب سونے کی چڑیا کی ہو گئی ہے۔ ماں کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ کوئی اس کے خوش حال مستقبل کی جانب نگاہ اٹھائے یا اس کی سونے کی چڑیا خود اڑ کر کہیں اور جا بیٹھے۔

ماں کے ساتھ رہتے ہوئے نوری نے ضرورت سے زیادہ احتیاط برتی لیکن اس کے اگلے روز بھی جب ماں ہی ساتھ چلی تو نوری نے اس سے سمجھوتا کر لیا پھر یہ سلسلہ اس روز تک چلتا رہا جس روز احسان لکھنوی نے ہر ایک کے ہاتھ میں اس کا سکرپٹ پکڑا کر اسے اچھی طرح یاد کر لینے کے لیے کہا تھا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا تھا کہ اب وہ آٹھ روز بعد ملیں گے۔

اس روز واپسی میں ماں نے اسے بتایا کہ اقبال سیٹھ دو روز بعد لندن جا رہا ہے اور چاہتا ہے کہ نوری بھی اس کے ساتھ جائے۔

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟" نوری نے آئیڈیا ہی مسترد کر دیا۔

"مجھے یہ اتنا کچھ یاد کرنا ہے اور پھر ماسٹر صاحب بھی تو آتے ہیں" نوری کی سمجھ میں نہ جانے کی جو وجوہات بن سکتی تھیں، نوری نے ایک سانس میں ہی وہ بیان کر دیں لیکن ماں کو وہ دلائل پسند نہیں آئے تھے۔

"تو پاگل تو نہیں ہو گئی ہے؟" ماں نے غصے میں سوال کیا۔ "فلم ولم تو بنی نہیں ہے اس لیے جتنی جلدی مال سمیٹ سکتی ہو سمیٹ لو ورنہ بعد میں جب بھانڈا پھوٹ جائے گا تو ہماری پوزیشن بھی ویسی ہی ہو جائے گی جو پہلے تھی" غصے کے فوراً بعد سمجھانے والے

انداز میں کہا تو نوری نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ اصل بات چھپا جائے گی۔

''اس سے زیادہ بری بات یہ ہوگی کہ فلم شروع ہونے سے پہلے ہی مجھے اس سے الگ کر دیا جائے گا'' نوری نے ماں کے سامنے تصور کا دوسرا رخ رکھا۔

''آپ کو یاد نہیں کہ پہلے دن ہی احسان صاحب نے کیا کہا تھا؟'' ماں کے چہرے پر تشویش ابھرتے ہی نوری نے اسے یاد دلایا۔

''یہ بھی تو ٹھیک ہی کہہ رہی ہے'' ماں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں نے تو سوچا تھا کہ۔۔۔'' ماں ادھورا فقرہ چھوڑ کر پوری طرح سوچ میں ڈوب گئی تو نوری نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہاں سے کھسک لے۔

اس روز تنہائی میں نوری نے دیر تک اس مسئلے پر غور کیا اور اس کا حل بھی اس نے سوچ لیا تھا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ ماں کی سوچ کے آگے بند اسی صورت میں باندھا جا سکتا ہے جب اس پر نوٹوں کی برسات شروع ہو جائے۔

اس شام کو نوری نے خاص اہتمام کیا اور اس شام ایک خاص جذبے کے ساتھ وہ محفل میں شریک ہوئی تھی۔ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نوٹ جمع کرنے کی کوشش میں وہ ہر حربہ استعمال کرنے لگی صرف یہی نہیں، اس نے اگلے روز شام سے قبل مختلف لوگوں کو الگ الگ ملنے کا وقت بھی دیا اور ان سے ملی بھی پھر ایک سے اس نے فون لگوانے کی فرمائش کی تو دوسرے سے شوٹنگ کے دوران میں گاڑی کی فرمائش کر دی۔ تیسرے کے سامنے اپنے پاس زیور نہ ہونے کا رونا رویا تو چوتھے سے کسی دوسرے علاقے میں فلیٹ کی بات کر ڈالی لیکن ہر ایک کے سامنے اس نے فلم کی مجبوریوں کے حوالے سے ہی بات کی تھی۔

نوری کی ماں نوری کی اس تیز رفتاری پر خوش ہونے کے ساتھ حیرت زدہ بھی تھی لیکن خود نوری یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اپنے اصل مقصد سے غافل نہیں تھی۔ بہن کی مدد سے اس نے ڈائیلاگ یاد کرنے کے لیے زبردست محنت کی تھی، اتنی زیادہ کہ جس روز اسے دوبارہ جانا تھا، اس روز وہ پوری طرح مطمئن تھی کہ اسے احسان لکھنوی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا اور ہوا بھی یہی کہ نوری کے سوا کسی نے بھی اپنا کام مکمل نہیں کیا تھا۔ سب سے بری رپورٹ ہیرو اور ہیروئن کی تھی۔ دونوں نے آتے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ مری کی سیر کے لیے چلے گئے تھے اس لیے زیادہ توجہ نہیں دے سکے تھے۔

احسان لکھنوی اس پر جز بز ضرور ہوا تھا لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ہیرو ہیروئن کے عدم تعاون کے باوجود اس نے شوٹنگ کے شیڈول کا اعلان کر دیا۔ شوٹنگ شروع ہوئی اور جس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی، اس سے نوری کو یہی اندازہ تھا کہ ماں کی بات غلط ثابت ہو جائے گی لیکن پھر اچانک شوٹنگ کے ایک نئے دور کو ملتوی کر دیا گیا اور وہ دن پہلا دن تھا جب احسان لکھنوی نے اس سے کھل کر بات کی تھی۔

''ناہید اپنے وعدوں سے پیچھے ہٹ رہی ہے'' ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی کافی شاپ میں نوری کے ساتھ بیٹھے ہوئے احسان لکھنوی نے اپنا دکھڑا رونا شروع کیا۔

''وہ بیٹی کو ہیروئن بنا کر جو حاصل کرنا چاہتی تھی، بیٹی نے اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا ہے'' احسان لکھنوی نے اسے بتایا۔

''اب صورت حال یہ ہے کہ فلم کے ہیرو اور ہیروئن فلم ختم ہونے سے پہلے ہی ایک ہو چکے ہیں اور ناہید صرف دیکھتی رہ گئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ جتنا کچھ فلم میں لگا چکی ہے، اب اس سے زیادہ اس لیے نہیں لگائے گی کہ اب اس کی دلچسپی ختم ہو چکی ہے'' احسان لکھنوی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''یہ تو بہت برا ہوا'' نوری نے اتنا ہی تبصرہ کیا جتنی بات اس کی سمجھ میں آئی تھی۔

''بری بات یہ نہیں ہوئی کہ فلم مکمل نہیں ہو رہی ہے بلکہ بری بات یہ ہو رہی ہے کہ میرے سارے خواب ادھورے رہ گئے ہیں۔'' احسان لکھنوی نے اس

انداز میں کہا کہ نوری کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔

''جانتی ہو میں کیا خواب دیکھنے لگا تھا؟''

احسان لکھنوی نے اس کے قریب ہوتے ہوئے اس انداز میں سرگوشی کی تھی کہ نوری کو اپنی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''میں نے سوچا تھا کہ یہ تمہاری پہلی اور آخری فلم ہوگی'' احسان لکھنوی نے اپنی سرگوشی کا دوسرا حصہ اس کے کانوں میں انڈیلا۔

''تم میں ہر وہ بات موجود ہے جو ایک اچھی بیوی میں ہونی چاہیے بلکہ میرا خیال تھا کہ قدرت نے تمہیں غلط جگہ پیدا کیا ہے لیکن خیر۔۔۔'' احسان لکھنوی بولتے بولتے اچانک اس انداز میں خاموش ہوا جیسے اچانک ہی اس کی نیند ٹوٹ گئی ہو اور آنکھ کھلتے ہی ایک مختلف ماحول سے وہ حیران رہ گیا ہو۔

''احسان صاحب۔۔۔'' نوری اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکی۔ اس کی تمام پیشہ وارانہ صلاحیتیں یوں بھی احسان لکھنوی کے سامنے پہنچ کر سلب ہو جاتی تھیں۔

''وہ سب میرے خواب تھے نوری لیکن۔''

احسان لکھنوی ایک بار پھر کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''آپ مایوس کیوں ہوتے ہیں'' نوری نے اسے حوصلہ دینے کی غرض سے کہا لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ جو کچھ وہ کہنا چاہ رہی ہے، وہ لفظ اس کے ہونٹوں سے کیوں ادا نہیں ہو رہے ہیں۔

وہ کہنا چاہتی تھی کہ احسان صاحب، میں تو ان خوابوں کی اسیر ہو کر رہ چکی ہوں۔ ان خوابوں کی تعبیر اگر مل سکتی ہے تو میں کسی بھی حالت میں گزر کر سکتی ہوں۔'' لیکن یہ سب کچھ وہ چاہنے کے باوجود کہہ نہیں پا رہی تھی۔

''میں مایوس نہیں ہوں لیکن جو کچھ میں چاہتا تھا، وہ نہیں ہو رہا ہے'' احسان لکھنوی نے کہا اور نوری نے اپنی تمام ہمتیں مجتمع کرنی شروع کر دیں۔

''آپ جو چاہیں گے، ویسا ہی ہوگا'' نوری نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

''ہو سکتا ہے اگر ہمیں کوئی ڈسٹری بیوٹر مل جائے''

احسان لکھنوی نے نوری کے فقرے کو کسی اور انداز میں لیا۔

''ڈسٹری بیوٹر مل جائے گا تو فلم مکمل کرنے کے لیے سرمایہ مل جائے گا اور پھر سب سے پہلے میں اس بے ہودہ جوڑے کی شوٹنگ مکمل کروں گا'' احسان لکھنوی جوش میں بول رہا تھا۔ نوری کو احسان لکھنوی کی بات کسی حد تک سمجھ میں آ رہی تھی لیکن یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ وہ اس سلسلے میں احسان لکھنوی کی کیا مدد کر سکتی ہے۔

''نئی کاسٹ ہونے کی وجہ سے پرانے ڈسٹری بیوٹر فلم پر ہاتھ رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں'' احسان لکھنوی کے لہجے میں ایک بار پھر تشویش اتر آئی۔

''جو نئے ڈسٹری بیوٹر ہیں، وہ فلم کے ساتھ کچھ اور بھی مانگتے ہیں'' احسان لکھنوی نے جھکتے ہوئے کہا اور نوری ایک لمحے سے بھی کم وقفے میں اس کا مقصد سمجھ گئی۔

''میں وہی کچھ کروں گی جو آپ کہیں گے''

نوری نے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نوری اگر ایسا ہو جائے'' احسان لکھنوی نے احسان مندی والے انداز میں کہا۔ نوری صرف اس کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر رہ گئی حالانکہ وہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ پریشان نہ ہوں، ہم جیسوں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

''ہمارے مستقبل کے لیے یہ ضروری نہ ہوتا تو۔۔۔'' احسان لکھنوی اتنا کہہ کر چپ ہو رہا لیکن نوری کا دل اچھل کر حلق تک آ گیا۔

''میں ہر حالت میں آپ کے ساتھ ہوں''

بالآخر وہ فقرہ نوری کے ہونٹوں سے نکل ہی گیا جو وہ بہت دیر سے کہنا چاہ رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں لیکن سسکتی ہوئی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ تم ایک عذاب سے نکل کر دوسرے عذاب میں داخل ہو جاؤ'' احسان لکھنوی یہ کہہ کر خاموش ہو گیا لیکن نوری اس سے یہ

نہیں کہہ سکی کہ اس کا ساتھ ہو تو وہ ہر عذاب سے گزرنے کے لیے تیار ہے وہ تو یہ بھی نہیں کہہ سکی کہ وہ جسے عذاب کہہ رہا ہے وہ تو اس کا اپنا خواب ہے۔ ایسا خواب، جو اس نے ہمیشہ جاگتی آنکھوں کے ساتھ دیکھا تھا۔

''کل دو ڈسٹری بیوٹرز آرہے ہیں'' احسان لکھنوی نے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا۔

''میں شام میں گاڑی بھجوادوں گا۔۔۔ مگر۔۔۔''

نوری نے دیکھا کہ احسان لکھنوی امید بھری نظروں کے ساتھ اسے دیکھ رہا ہے اور اس کی نظر جھک گئیں۔

''آپ صرف فون کردیجیے گا، میں حاضر ہوجاؤں گی'' نوری نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ کہا۔

اگلے روز وعدے کے مطابق نوری فون سنتے ہی چل پڑی تھی لیکن نوری کی تمام کوششوں کے باوجود فلم نہیں بک سکی۔ تین روز بعد احسان لکھنوی نے اسے ایک اور فون کیا اور پھر یہ سلسلہ طول کھینچتا چلا گیا۔ نوری اسے حوصلہ دیتی۔ اسی دوران میں ایک جگہ نوری کی اعزاز الدین شاہ سے ملاقات ہوگئی۔

اس زمانے میں اعزاز الدین شاہ کی جماعت اپوزیشن میں تھی اور اپوزیشن کے لیڈروں کی طرح سے اعزاز الدین شاہ کے پاس وقت ہی وقت تھا، وہ اپنے اس دوست سے ملنے آیا تھا جو فلم ڈسٹری بیوشن کے کاروبار سے منسلک تھا۔ جس انداز میں وہ ڈسٹری بیوٹر ملا تھا، اس سے نوری کو امید نہ ہونے کے برابر تھی لیکن اگلے ہی روز احسان شاہ نے اسے خبر سنائی کہ ڈسٹری بیوٹر فلم خریدنے کے لیے تیار ہوگیا ہے۔

نوری کو اپنے خواب سچے ہوتے دکھائی دینے لگے تھے لیکن فلم مکمل ہوکر ریلیز ہوئی تو ایک فلاپ فلم ثابت ہوئی تھی۔ پوری فلم میں اگر کسی کا کام کھل کر سامنے آیا تھا تو وہ نوری تھی۔ فلاپ فلم میں کام کرنے کے باوجود نوری کے پاس فلموں کی آفر آنی شروع ہوگئیں لیکن احسان لکھنوی سے مشورے کے بغیر نوری کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ احسان لکھنوی اسے مزید فلموں میں کام کرنے سے روکے گا لیکن احسان لکھنوی نے اگلی فلم کی تیاری کی نوید دیتے ہوئے اسے اپنی فلم کی پیشکش بھی کردی تھی۔ ''احسان۔۔۔ آپ نے کہا تھا۔۔۔ کہ۔۔۔'' وہ کہتے کہتے جھجک رہی تھی۔

''میرے خواب اب بھی وہی ہیں لیکن میں ایک سسکتی ہوئی زندگی گزارنا نہیں چاہتا'' احسان لکھنوی نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

''تم تو جانتی ہی ہو کہ فلم کے فلاپ ہونے سے میرے پاس جو کچھ تھا وہ تو ختم ہوا ہی بلکہ میں قرض کے بوجھ تلے دب گیا ہوں'' احسان لکھنوی نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

نوری اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہیں سکی، یہ بھی نہیں کہ ''خواب کو تعبیر نہیں دے سکتے تھے تو سراب کا عذاب کیوں دیا؟''

اس ملاقات کے بعد نوری نے دھڑا دھڑ فلمیں سائن کرنی شروع کردیں۔ وہ خود کو کام میں گم کردینا چاہتی تھی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ نوٹ اس کے چاروں جانب سے برس رہے تھے اور وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہی تھی لیکن احسان لکھنوی کی اگلی فلم میں اس نے کام کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کے کانوں تک یہ افواہیں پہنچ رہی تھیں کہ احسان لکھنوی نے ناہید سے شادی کرلی ہے بلکہ وہ احسان لکھنوی کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

احسان لکھنوی کی دوسری فلم نے مکمل ہوتے ہوتے کافی وقت لیا لیکن جب ریلیز ہوئی تو اس فلم کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلی فلم کا ہوا تھا۔ اگرچہ کہ کچھ دن بعد ہی احسان لکھنوی نے تیسری فلم کا اعلان کردیا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن ایک بار پھر ناہید کی بیٹی تھی جو طلاق کے بعد ماں کے پاس واپس آچکی تھی۔ احسان لکھنوی کی یہ فلم ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی تھی۔ فلم والوں کی روایات کے مطابق اس کے ساتھ ہی احسان لکھنوی پر فلموں کی بارش شروع ہوگئی۔۔۔

ادھر نوری کا اپنا سفر کامیابی سے جاری تھا پھر اس دوران میں کچھ خبریں ناہید اور احسان لکھنوی میں علیحدگی کی بھی آئیں اور اس میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب ناہید نے اپنی اگلی فلم کا اعلان کیا جس کا ڈائریکٹر احسان لکھنوی کے علاوہ کوئی اور تھا۔ اس فلم کے سلسلے میں ناہید اس کے پاس بھی آئی تھی لیکن نوری نے مصروفیت کا بہانہ کر کے اس سے معذرت کر لی۔ البتہ ناہید نے تفصیل کے ساتھ وہ کچھ بتایا کہ پہلی فلم سے اس وقت تک احسان لکھنوی نے اسے کس کس انداز میں لوٹا تھا۔

"اس کا نام احسان ضرور ہے لیکن وہ ایک احسان فراموش شخص ہے" ناہید نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

اس ملاقات میں نوری نے صرف سننے والا کام کیا تھا۔ احسان لکھنوی کو وہ اپنی زندگی سے نکال چکی تھی لیکن یادوں سے نکالنا اس کی بساط سے باہر کی بات تھی۔ وہ ایک خواب جو احسان لکھنوی نے اس کی آنکھوں میں بسایا تھا، وہ اب بھی اس خواب کو دیکھتی تھی۔ اگرچہ کہ اس کی تعبیر اسے نظر نہیں آئی تھی لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ اسے اپنا خواب بھی پورا ہوتا نظر آیا۔

اعزاز الدین شاہ سے وہ پہلی ملاقات کے بعد بھی کئی بار مل چکی تھی لیکن یہ ملاقاتیں بس یوں ہی سرسری سی ہوتی تھیں اگرچہ کہ نوری کو اعزاز الدین کی نظروں میں اپنے لیے الگ سے جذبات دکھائی دیتے لیکن نوری اسے ہمیشہ اپنی غلط فہمی سمجھتی رہی تھی۔

وہ ایک ایوارڈ کی تقریب تھی اور اعزاز الدین شاہ اس میں مہمان خصوصی تھا لیکن تقریب کے دوران میں اعزاز الدین شاہ نے اس سے انتہائی رازدارانہ انداز میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو نوری دل میں مسکرا دی تھی۔

"ہم جیسیوں سے تو آپ جب چاہیں مل سکتے ہیں۔" اس نے تلخ لہجہ اپنائے بغیر کہا تھا۔

"اگر میں کہوں کہ میں آپ سے کچھ دیر صرف باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" اعزاز الدین شاہ نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہماری تربیت اس انداز میں ہوتی ہے شاہ صاحب کہ ہم وہی کچھ کرتے ہیں جو گاہک چاہتا ہے۔" نوری کا لہجہ بغیر کسی وجہ کے ہی تلخ تر ہوتا چلا گیا۔

"اور اگر میں یہ بات کرنا چاہوں کہ آپ اپنے ماضی کو حرف غلط کی طرح مٹا دیں تو آپ کا کیا جواب ہوگا؟" اعزاز الدین شاہ نے سوال کیا اور نوری اسے محض دیکھتی رہ گئی۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" نوری نے کچھ سمجھنے اور نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

"میں وہی کچھ کہہ رہا ہوں جو پہلے بھی کسی نے کہا تھا لیکن میں وہ نہیں ہوں اس لیے میں دھوکا نہیں دوں گا۔" اعزاز الدین شاہ نے پورے اعتماد سے کہا۔

اس رات فنکشن کے بعد وہ اعزاز الدین شاہ سے ملی تھی اور اسے حیرت ہوئی کہ اعزاز الدین شاہ اس کے بارے میں تمام تفصیل جانتا ہے لیکن اس کے باوجود اس سے فوری طور پر نکاح کرنا چاہتا ہے۔

"یہ شادی صرف اس وقت تک عام نہیں ہوگی جب تک آپ کی فلمیں ختم نہیں ہو جاتیں۔" تفصیلات طے کرتے ہوئے اعزاز الدین شاہ نے کہا۔

"لیکن شاید بعد میں بھی میں زیادہ تقریبوں میں آپ کے ساتھ شرکت نہ کر سکوں۔"

نوری اس کی مجبوری سمجھ رہی تھی لیکن اسے ان سب باتوں کی پروا کب تھی۔ وہ تو ایک چھوٹے سے گھر کی خواہش مند تھی اور جو کچھ اعزاز الدین شاہ اسے دے رہا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔

"مجھے صرف تحفظ چاہیے شاہ صاحب۔" نوری نے جھکی نظروں کے ساتھ کہا۔

اگلے روز وہ مسز اعزاز الدین شاہ بن گئی اور اس کے بعد اس نے ماضی سے صرف اس وقت تک رابطہ رکھا جب تک لائٹ، کیمرا آن اور کٹ کی آوازوں کے درمیان جانا اس کی مجبوری رہا۔

ایک بار ماں کے مرنے پر بھی اس نے ماضی سے رابطہ جوڑا تھا لیکن پھر وہ مستقل اپنی نئی دنیا میں زندگی بسر کرتی رہی۔ یہاں تک کہ احسان لکھنوی پناہ کی تلاش میں اس تک پہنچا تھا۔

"ایسا کون سا جرم ہے جس کی سزا سے بچنے کے لیے احسان میرا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔"

ماضی میں سفر کرتے ہوئے اچانک ہی یہ سوال اس کے ذہن میں گونجا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یاد آ گیا کہ وہ اس سلسلے میں کس سے بات کر سکتی ہے۔

ایس۔ پی عبداللہ خان کے نمبر گھماتے ہوئے نوری نے سوچا تھا کہ اگر تیسری گھنٹی پر بھی عبداللہ خان نے فون نہیں اٹھایا تو وہ لائن کاٹ دے گی لیکن دوسری ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا تو اس نے معذرت کرنی شروع کر دی۔

"آپ کے فون کی گھنٹی بجنے سے دو منٹ پہلے ہی میں واپس آیا ہوں۔ اس لیے معذرت بنتی نہیں ہے۔" عبداللہ خان نے خوش دلی سے کہا۔

"خیریت تھی؟" نوری نے ایک بار پھر گھڑی کی جانب نظر اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"فلموں کا ایک ڈائریکٹر ہوتا ہے احسان لکھنوی اس کے لیے ایک جگہ چھاپا مارا تھا لیکن وہ وہاں سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔" عبداللہ خان غیر متوقع طور پر اس کے سوال کا جواب دے رہا تھا۔

"وہ کس سلسلے میں مطلوب ہے؟" نوری نے عبداللہ خان کے خاموش ہوتے ہی سوال کیا۔

"کچھ کنفرم نہیں ہے لیکن بم دھماکوں کے بعد جو مجرم گرفتار ہوئے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ دھماکے کے لیے مواد انہیں احسان نے مہیا کیا تھا۔ اس سلسلے میں۔۔۔ تحقیقات کے ذریعے یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ احسان جو پچھلے دنوں ایک فلم کی شوٹنگ کرنے ملک سے باہر گیا تھا واپسی میں اس نے اپنے تمام قرضے ادا کر دیے تھے۔" عبداللہ خان نے تفصیل بتائی اور نوری کے ذہن میں ہر چیز واضح ہوتی چلی گئی۔

"فلموں کے رول میں وہ دھماکا خیز مواد لا سکتا تھا۔" نوری نے کہا لیکن عبداللہ خان محتاط رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے ایسا ہوا ہو۔"

عبداللہ خان محتاط تھا لیکن نوری کے اندر سے کوئی آواز ابھری تھی" اس نے یقیناً ایسا کیا ہوگا کیونکہ وہ ایک احسان ناشناس شخص ہے۔"

"آپ کا ملزم میرے گھر میں ہے۔" نوری لمحوں میں فیصلے تک پہنچ گئی۔

"آپ کے یہاں۔۔۔؟" عبداللہ خان نے حیرت سے سوال کیا۔

"مجھے فلموں میں وہی لائے تھے۔" نوری نے فقروں کو ترتیب دیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"میں نے انہیں گھر میں ٹھہرایا ضرور لیکن شاہ صاحب سے بات کی تو انہوں نے مجھے ہدایات دیں کہ میں فوراً پولیس کو اطلاع دوں کیونکہ ملزم کو پناہ دینا بھی قانوناً جرم ہے۔" نوری نے کریڈٹ اعزاز الدین شاہ کے کھاتے میں ڈال دیا۔

نوکروں کو ہدایات دینے کے بعد نوری کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ پولیس آئی اور سوتے ہوئے احسان لکھنوی کو گرفتار کر کے لے بھی گئی لیکن نوری کمرے میں ہی رہی۔ البتہ کھڑکی سے ذرا سا پردہ ہٹا کر اس نے رخصت ہوتے ہوئے احسان کو دیکھا ضرور تھا۔

"اپنا جرم تو میں معاف کر سکتی ہوں احسان لیکن دھرتی کے مجرم کو معاف کرتی تو میں اپنے ضمیر کے سامنے مجرم بن جاتی۔" اس نے پولیس کسٹڈی میں موجود احسان لکھنوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا لیکن یہ لفظ اس کے ہونٹ سے نہیں نکلے تھے لیکن دو آنسو اس کی آنکھوں سے ضرور نکلے تھے، نہ جانے کیوں؟

☆☆

آنکھ مچولی

محمود عالم

پیشہ ور لوگوں کے پیشے کے کچھ اپنے ہی تقاضے ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا ان کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ایک ایسے ہی جرائم پیشہ گروہ کی سرگرمیوں کا احوال وہ خود کو اپنے کام کا ماہر خیال کرتے تھے۔

ایک شخص کو قتل کرنے کی کوشش کا دلچسپ احوال

روشنی کے تیز جھماکے کے ساتھ کوئی چیز اس کے بائیں طرف پسلیوں سے ٹکرائی۔ اسی لمحے اس نے سڑک پر کسی گاڑی کے بیک فائر کی آواز سنی اور پھر ایک سست رفتار کار اچانک تیز ہو کر اس کی نظروں کے سامنے سے گزر گئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے حیران و پریشان فٹ پاتھ پر کھڑا رہ گیا۔لوگ اس کے قریب سے گزرتے رہے پھر آہستہ آہستہ اسے اپنی پسلیوں کے نیچے شدید درد اور پنڈلیوں پر کسی شے کے بہنے کا احساس ہوا۔

اس نے درد والی جگہ پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا دبایا اور جھک کر دیکھا۔جیکٹ کے نیچے قمیض پر خون کا بڑا سا دھبا صاف نظر آ رہا تھا۔

قریب سے گزرتے ہوئے ایک راہ گیر نے خون کے دھبے کو دیکھا' ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں حیرت اتری پھر وہ فوراً لاتعلقانہ انداز میں دوسری طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

اس نے اس صدمے سے سنبھلتے ہوئے اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور دھپ کی آواز کے ساتھ وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اس نے اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکائیں اور کسی زخمی جانور کی طرح سر جھٹکنے لگا۔اس کی سمجھ میں اب تک شدید درد اور بہتے خون کی وجہ سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔

اسی وقت اچانک اسے احساس ہوا کہ ایسے کسی نے اپنی گولی کا نشانہ بنایا تھا۔غالباً یہ وہی کار تھی جو اس کے سامنے سست رفتار سے چلتے چلتے اچانک ہوا ہو گئی تھی اسی کار میں سوار کسی نشانہ باز نے اسے دوسرے جہان پہنچانے کے لیے اس پر گولی چلائی تھی۔

اس طرح نشانہ بنائے جانے کے احساس کے بعد اس کی اذیت میں اور اضافہ ہو گیا۔ درد اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔گاڑھا خون اس کی بائیں ران کو تر بتر کرتا ہوا جوتوں تک پہنچ گیا تھا۔''یہ کس کا کام ہے؟'' یہ سوال کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے حواس پر برس رہا تھا۔''کسی نے کیوں اسے گولی مارنے کی ضرورت محسوس کی تھی؟'' دوسرا سوال پہلے سے زیادہ اہم تھا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اپنے زخم پر نگاہ ڈالی خون کا دھبا پھیلتا جا رہا تھا اس کے ساتھ اسے احساس ہوا کہ اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا



چھانے لگا تھا اور پورے جسم پر کچھ عجیب طرح کپکپی سی طاری ہوتی جارہی تھی۔

وہ جیسے تیسے کر کے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا اور اپنی بھرپور قوت ارادی کے بل پر کھڑا ہو گیا وہ سیدھا کھڑا تھا مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بری طرح ڈگمگا رہا ہے۔ کمزور پڑتے ہوئے حواس کے ساتھ اس نے اپنی کار کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچے سمجھے بغیر اس کی طرف دوڑنے لگا۔

سڑک پر سے گزرتی گاڑیوں کے بریک چرچرائے اور بے شمار ہارن ایک ساتھ بج اٹھے مگر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ بے تکے انداز میں سڑک پر دوڑتا چلا گیا۔ اپنی کار کے قریب پہنچ کر اس نے چابیوں کی تلاش میں کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ چابیاں اسی جیب سے برآمد ہوئیں۔

اس نے بدقت دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ سیٹ پر بیٹھ کے اس کے حواس ذرا بجا ہوئے اس نے چند گہرے سانس لیے' سر کو جھٹکا اور انجن اسٹارٹ کرنے کے لیے اگنیشن میں چابی گھمانے لگا۔

پہلی کوشش۔ دوسری کوشش۔ تیسری کوشش۔۔

انجن ذرا سا گھرگھراتا اور خاموش ہو جاتا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے جو ذرا سی حالت درست ہوئی تھی' وہ اب تیزی سے بدتر ہونے لگی۔ مایوسی اس پر غالب آنے لگی۔ اس نے پوری قوت لگا کر چابی گھمائی اور انجن پوری طرح اسٹارٹ ہو گیا۔

اسے کہاں جانا ہے؟ سوال اس کے ذہن میں چکرایا۔ پولیس اسٹیشن۔۔ یا گھر۔۔ دو جواب بیک

وقت ذہن کے کسی گوشے سے ابھرے۔

پولیس اسٹیشن۔۔گھر۔۔پولیس اسٹیشن۔۔گھر۔۔کشمکش بڑھنے لگی۔گھر۔۔گھر یہ آواز اس پر غالب آگئی۔ یہ ساری کشمکش اور فیصلہ چند لمحوں میں ہوا اس نے گیئر لگایا اور ایکسی لیٹر پر پورا دبا کر کلچ چھوڑ دیا۔کار اچھل کر آگے بڑھی اور سڑک پر نکل آئی۔اس کا رخ گھر کی طرف تھا گاڑی کے بریک چرچرائے اور ہارن کی آواز نے سارے ماحول کو بھیانک بنا دیا۔

اسے کسی کی پروا نہیں تھی" وہ کون اور کیوں" کے درمیان الجھا ہوا تھا۔ایک خیال اسے اسپتال جانے کا بھی آیا مگر اس نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔وہ گھر کی طرف چلتا رہا۔

مجھے کیوں نشانہ بنایا گیا اور کس نے بنایا ہے؟ وہ مسلسل انہی سوالوں کے جواب تلاش کرنے میں مصروف تھا۔

اسے یاد آیا کہ گزشتہ دنوں اس نے ٹی وی پر ایک ایسا ہی پروگرام دیکھا تھا جس میں مجرموں کا ایک گینگ یوں ہی سڑک پر اپنے دشمنوں کو نشانہ بناتا پھر رہا تھا مگر وہ نہ تو کوئی مجرم تھا نہ اس کا تعلق پولیس یا اس طرح کے کسی اور ادارے وغیرہ سے تھا۔وہ تو بس سیدھا سادہ ایک عام آدمی تھا۔

تو پھر آخر کیا بات تھی کہ اسے اس طرح سڑک پر گولی ماری گئی؟ درد کی ایک تیز ٹیس اٹھی اور بے اختیار اس کے حلق سے بلند آہنگ کراہ برآمد ہوئی۔ ایسی کراہ جو شاید چیخ کے مترادف تھی۔اسے خود کا اس طرح کراہنا کچھ اچھا نہیں لگا اس نے اپنے جبڑے کو سختی سے بھینچ لیا۔درد کے ساتھ ہی کمزوری اور لاغری کی کیفیت میں اور اضافہ ہوگیا۔

"اوہ میرے خدا! کیا میں گھر بھی پہنچ سکوں گا یا نہیں۔" اس نے بے بسی سے سوچا "میں اپنی بیوی پیاری بیوی جینی کو بھی دیکھ سکوں گا یا نہیں۔"

اسی وقت اسے یاد آیا کہ اس کی شادی کو صرف چار مہینے ہی تو ہوئے ہیں۔ شادی کے بعد کی زندگی ابھی شروع ہی ہوئی ہے تو کیا۔۔تو کیا وہ اس سے آگے نہیں سوچنا چاہتا تھا۔اسے زندگی کے لیے لڑنا تھا اپنی بیوی کی خاطر زندہ رہنا تھا۔

ونڈشیلڈ دھندلی ہوتی جا رہی تھی اسے دیکھنے میں مشکل پیش آرہی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ۔۔ونڈشیلڈ کو کچھ نہیں ہوا' اس کی بینائی اس کا ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے۔اس نے تیزی سے کار ایک ذیلی سڑک پر موڑی۔ تیز رفتاری اور حواس پر قابو نہ ہونے کے باعث وہ ایک ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔تاہم اس کی کار کا پچھلا حصہ سڑک کے کنارے پارک واکس ویگن سے ٹکرایا۔کار اس کے کنٹرول سے باہر ہوئی مگر اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو اور کار کو سنبھال لیا۔

وہ اپنی تمام تر قوت کو مجتمع کر کے ڈرائیونگ کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ وہ جینی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اسی وقت اس نے ایک سائرن کی آواز سنی۔ نیلی اور سرخ روشنیوں کے جھماکے اس کے عقبی آئینے میں بڑی تیزی سے قریب آتے محسوس ہو رہے تھے۔

"اسے ابھی ان کے ہاتھ نہیں لگنا ہے اس ان سے بچنا ہے وہ اسے روکیں گے اور گھسیٹتے ہوئے باہر نکال کر پولیس اسٹیشن لے جائیں گے یا شاید اسپتال لے جائیں گے" "مگر نہیں" وہ انہیں قریب نہیں آنے دے گا۔اسے جینی کے پاس پہنچنا ہے۔" خدا کرے وہ خیریت سے ہو" یہ سوچتے ہوئے اس نے کار کی رفتار اور بڑھا دی جو ویسے ہی غیر معمولی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

پولیس کار اس کے قریب آتی چلی گئی ان کی کوشش تھی کہ وہ اس کے برابر آجائیں پھر اچانک سائرن کی آواز موقوف ہوگئی اس کے ساتھ اس کار سے ایک پولیس آفیسر نے میگافون پر چلا کر کہا۔

"رکو۔۔گاڑی۔۔رکو۔۔"

وہ نہیں رکا بلکہ اپنی کار کو تیزی سے موڑ کر دوسری سڑک پر لے گیا۔ یہ سڑک اس کے گھر کی طرف جاتی تھی اس ڈھلوان روڈ پر وہ تیز رفتاری سے کار چلاتے

ہوئے تیزی سے گھر پہنچنا چاہ رہا تھا۔ پولیس کار ایک مرتبہ پھر اس کے عقب میں تھی۔

اس کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔ نیلے پیلے سبز دائرے اس کی آنکھوں کے آگے چکرا رہے تھے ایک لمحے کو اس کی آنکھیں بند ہوئیں' اس نے اسٹیئرنگ کو پورا گھمایا گاڑی ایک گیٹ سے گزری ایک بھرپور ہچکولے کی وجہ سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

وہ اس کا اپنا گھر تھا۔ گاڑی ڈرائیو وے میں دوڑتی ہوئی پورچ کی طرف جارہی تھی۔ اس نے کار روکنا چاہا مگر بریک پیڈل پر پاؤں پہنچانا اسے ممکن نہیں لگ رہا تھا ایکسی لریٹر پر دباؤ کم ہو چکا تھا پھر اسے بریک پیڈل مل گیا اس نے پوری قوت سے اسے دبایا کار بے قابو ہوگئی اور پورچ کی سیڑھیوں سے ٹکرائی۔ خوش قسمتی سے اسی وقت انجن بند ہو گیا اور کار وہیں رک گئی۔

پولیس سائرن دوبارہ بجنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ پولیس کار بھی اس کے ڈرائیو وے میں داخل ہوگئی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر گر گیا تھا۔ اس کا ایک پیر ابھی تک کار کے اندر تھا۔ وہ اسے نکالنے پر قادر نہیں تھا۔

''جینی۔۔'' اس نے پوری قوت سے درد بھرے لہجے میں پکارا۔

جینی دوڑتے ہوئے گھر سے نکلی تھی۔ اس کی پکار ختم ہونے سے پہلے وہ اس کے پاس پہنچ چکی تھی۔ وہ جھکی اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''رون۔۔ کیا ہوا رون؟'' اچانک صدمے سے اس کی آواز کانپ رہی تھی ''اوہ میرے خدا!''

اس نے پولیس کی نیلی یونیفارم دیکھی۔ وہ دوڑتے ہوئے وہاں تک پہنچے تھے۔

''یہ تمہارا شوہر ہے؟'' اس نے سنا۔

''ہاں۔۔ ہاں۔۔'' جینی کی گھبرائی ہوئی آواز سے وحشت عیاں تھی۔

مسکرائیے

ہالی ووڈ کے قریب ایک گلی کے کونے پر دو کتوں کی ملاقات ہوئی ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔''

''میں اپنی دوست کا انتظار کر رہا ہوں'' دوسرے کتے نے جواب دیا۔

''کیسی ہے وہ'' پہلے کتے نے تجسس سے پوچھا۔

''سفید رنگ کی ہے' دوفٹ لمبی ہے' دم چھوٹی ہے' لیڈی کہہ کے آواز دو تو متوجہ ہوجاتی ہے۔'' دوسرے نے کہا۔

''اچھا...... اچھا' اس کی پیشانی پہ سیاہ دھبا ہے' اور ذرا لنگڑا کر چلتی ہے۔'' پہلے کتے نے مزید نشانیاں بتائیں۔

''ہاں...... ہاں وہی'' دوسرے نے تائید کی۔

''میں تو خود اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔'' پہلا کتا بولا۔

دوسرے نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔

''کیا زمانہ آ گیا ہے...... ہماری مادائیں بھی ہالی ووڈ کی عورتیں ہوتی جارہی ہیں۔''

☆

شادی کے چھ ماہ بعد میاں بیوی میں پہلا جھگڑا ہوا۔ غصے سے بے قابو ہو کر شوہر نے بیوی کی پیٹھ پر ازدواجی زندگی کا پہلا گھونسا رسید کیا۔

اتفاق سے پادری صاحب وہاں سے گزر رہے تھے' انہوں نے کھڑکی سے گھونسا پڑتے دیکھا تو فوراً دوڑے بیچ بچاؤ کے لیے۔

شوہر نے دیکھا کہ پادری صاحب گھر میں آ گئے ہیں تو سنبھل کر اس نے بیوی کی پیٹھ پر ازدواجی زندگی کا گھونسا نمبر دو رسید کیا اور گرج دار آواز میں بولا۔

''اب بھی چرچ جانے سے انکار کرو گی۔''

☆☆

اس کے ساتھ ہی اس کے حواس اس کے ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال میں تھا۔ نرس اس کے برابر کھڑی تھی جینی اس کے بستر پر بیٹھی تھی۔ گردن کو قدرے خم دے کر اس نے دوسری طرف دیکھا تو ایک باوردی پولیس آفیسر کے ساتھ ایک دراز قامت سخت گیر آدمی کھڑا نظر آیا بڑی بڑی آنکھیں جن میں ذہانت کی چمک تھی اور مضبوط جبڑا اس کی قوت ارادی کو ظاہر کر رہا تھا۔

اسے آنکھیں کھولتا دیکھ کر وہی سادہ لباس والا درشت صورت آدمی ایک قدم آگے بڑھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس سے قبل وہاں کھڑی نرس بول اٹھی۔

”ایک منٹ ٹھہریے۔“ یہ کہہ کر وہ اس پر جھک گئی ”اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“ اس نے ملائمت سے پوچھا۔

اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر الفاظ اس کے منہ میں آ کر خلط ملط ہو گئے۔ وہ کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر جینی نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے پورے بدن میں حرارت کی لہر سی دوڑنے لگی۔ جینی نے اس کے ہاتھوں کو نرمی سے سہلایا اور پیار بھرے لہجے میں بولی۔

”سب ٹھیک ہے۔ تم بہت جلد بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“ جینی کے الفاظ ٹھنڈ بن کر اس کی سماعتوں میں اتر رہے تھے۔ آسودگی اور سکون اس کے رگ و پے میں آہستہ آہستہ سرایت کر رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے جسم میں بے چین و بے تاب کر دینے والا درد اب ختم ہو چکا ہے شاید اسے نشہ آور دوا دی گئی تھی یا جینی کا وجود اسے اپنی تکلیف سے بے گانہ کر رہا تھا۔

”جینی!“ آہستہ آہستہ اس نے خود کو بولنے کے قابل محسوس کیا تو پہلا لفظ اس نے بیوی کو پکار کر ادا کیا۔

”رون“ جینی نے وارفتگی سے اس کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ صرف ایک لفظ ادا کر کے اس کی قوتوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

”مسٹر اسٹیورٹ۔“ ایک اجنبی اور کرخت آواز اس نے سنی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سادہ لباس والا شخص اس سے مخاطب تھا۔ ”تم ہمیں صرف یہ بتاؤ کہ آخر ہوا کیا تھا؟“

اس موقع پر نرس نے ایک مرتبہ پھر مداخلت کی ”آپ کو انتظار کرنا پڑے گا میرے خیال میں مسٹر اسٹیورٹ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ یہ آپ کے سوالون کے جواب دے سکیں۔“

کیا ہوا تھا۔ اس سوال کے ساتھ ہی وہ پورا منظر ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں میں گھوم گیا ”کیوں اور کس نے؟“ یہ دونوں سوالات پھر اسے ستانے لگے۔

اس نے اپنی پوری قوت مجتمع کی اور اس واقعے کی تفصیل بیان کرنے لگا۔ ”مگر کیوں؟“ اس سوال کے ساتھ اس نے اپنی داستان ختم کی ”اس سوال نے مجھے پاگل کر دیا تھا کہ آخر کسی نے میرے ساتھ یہ کیوں کیا۔“ اس نے آخر میں کہا اور گہرے سانس لینے لگا۔

یونیفارم میں ملبوس پولیس افسر نے کھنکار کر گلا صاف کیا مگر کچھ بولا نہیں سابقہ سادہ لباس والے نے پوچھا ”یہ ہنگامہ پسند مہم جو نوجوانوں کی تو حرکت نہیں تھی؟“

”نہیں“ اسٹیورٹ نے نفی میں سر ہلایا ”وہ بچے نہیں تھے۔ میں نے ان کی کار دیکھی تھی وہ۔۔“ اس کا سانس کھڑنے لگا تھا۔

نرس تیزی سے اس کی طرف لپکی ”بہتر ہو گا کہ آپ لوگ یہاں سے رخصت ہو جائیں۔“ اس بار اس کی آواز سے ناپسندیدگی واضح طور پر عیاں تھی۔

”تم ہماری کچھ مدد کر سکتے ہو؟“ سادہ لباس والے نے نرس کی پروا کیے بغیر پوچھا۔

اسٹیورٹ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس دوران

میں اسے محسوس ہوا کہ وہ دوبارہ بول سکتا ہے۔

''وہ۔۔'' اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اسی وقت نرس نے آکسیجن ماسک اس کے چہرے پر چڑھا دیا۔

اس نے بے چینی سے گردن کو ادھر ادھر حرکت دینا چاہی۔ وہ پولیس والوں سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ اسے خیال آ گیا تھا کہ اسے یقیناً کسی کے دھوکے میں نشانہ بنایا گیا ہے وہ کسی سے مشابہت رکھتا ہوگا اور اپنی بد قسمتی سے اس جگہ پہنچ گیا ہوگا جہاں اصل شخص کو آنا ہوگا۔ ہاں یہی صورت ہو سکتی ہے۔ یہ خیالات لمحہ بھر میں اس کے ذہن میں چکرا کر رہ گئے۔

شاید پولیس والوں کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ وہ انہیں اس طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا اس طرح کسی دوسرے شخص کی جان بچ سکتی تھی اور مجرموں کی نشاندہی بھی ہو سکتی تھی مگر کچھ نہ ہوا۔

نرس نے اس کی بے چینی کو درد کی شدت پر محمول کیا اور ایک انجکشن لے کر اس کی طرف بڑھی۔ اس نے کوشش کی کہ وہ نرس کو ہی مخاطب کر سکے کیونکہ اتنی دیر میں پولیس والے اور جینی کمرے سے باہر جا چکے تھے۔

انجکشن کی سوئی اس کے بازو میں اتری اور اس کے حواس پر گہری سفید دھند چھانے لگی۔

☆☆☆

اس کی دوبارہ آنکھ کھلی تو ایک ڈاکٹر اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کا اسٹیتھس اسکوپ اس کے گلے میں حمائل تھا۔ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہو گیا۔ آکسیجن ماسک اسٹیورٹ کے چہرے پر نہیں تھا وہ اب بول سکتا تھا۔

''سنو ڈاکٹر'' اس نے ڈاکٹر نظر آنے والے شخص سے ملتجیانہ لہجے میں کہا ''کیا تم پولیس کو بلا سکتے ہو؟ وہ لوگ باہر ہوں گے۔''

ڈاکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ ایسی سفاک مسکراہٹ جو کسی شکار کو سامنے دیکھ کر درندے کی آنکھوں میں اتر آتی ہے۔

''اب اس کی ضرورت نہیں رہی مسٹر ویسٹ بروک۔'' اس نے سرگوشی میں کہا ''تمہاری مشکل آسان ہونے والی ہے۔ اگر اس احمق کا نشانہ چوک نہ گیا ہوتا تو وہ گولی تمہارے دل میں پیوست ہوتی تھی مگر خیر میں اس ادھورے کام کو مکمل کرنے آ گیا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس شخص نے اپنے اوورآل کی جیب سے سائلنسر لگا ریوالور باہر نکال لیا۔

''ویسٹ بروک۔۔ ویسٹ۔ بروک۔۔''

اسٹیورٹ کا ذہن اسی لفظ پر اٹک کر رہ گیا تھا تو اس کا خیال سچ تھا۔ وہ کسی کے دھوکے میں مارا گیا تھا۔

وہ اس شخص کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا تھا مگر اس نے اطمینان سے ریوالور کی نال سیدھی کی اور گولی سیدھی اس کے دل میں پیوست ہو گئی۔

آخری وہ خیال جو اس کے ذہن میں تھا' وہ یہی تھا کہ کاش وہ نرس اتنی فرض شناس اور مریض کا اتنا خیال کرنے والی نہ ہوتی تو اسے موقع مل جاتا کہ وہ پولیس والوں کو کچھ بتا سکتا۔

☆☆

ہنسیئے

عقلمندی

حمید نے ایک مرتبہ بتایا کہ اس نے ایک محفل میں انچاس اُبلے ہوئے انڈے کھا کر ایک ریکارڈ قائم کر دیا تھا

''تو ایک انڈا اور کھا لیتے تاکہ پورے پچاس ہی ہو جاتے۔'' سلیم نے مشورہ دیا۔

''کیوں کھا لیتا ایک اور انڈا؟'' حمید ذرا خفگی سے بولا۔ ''تم چاہتے ہو کہ میں ایک انڈے کی خاطر اپنے آپ کو یہاں پیٹو مشہور کر لیتا۔؟''

☆

اخبار پڑھ کر

ناشتے کی میز پر اخبار دیکھتے ہوئے رمضان نے بیگم کو بتایا۔

''پرسوں رات والی محفل موسیقی کی رپورٹ اخبار میں پڑھ کر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ کتنی کامیاب محفل تھی۔''

''جی ہاں۔ مجھے بھی اخبار پڑھ کر ہی پتا چلا ہے کہ ہم لوگ اس سے کتنے لطف اندوز ہوئے تھے۔'' رمضان کی بیگم نے جواب دیا۔

مقدس راز

نشور ہادی

بری صحبت کا شکار عموماً وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے سر میں کوئی سودائے ہوس سما گیا ہو وہ بھی دولت کے لالچ میں ایک بد قماش شخص کی باتوں میں آگیا تھا جب اسے ہوش آیا تو بازی پلٹ چکی تھی وہ قاتل بن چکا تھا۔

دو دوستوں کے درمیان دوری اور نزدیکی کے خفیہ معاملات پر ایک سبق آموز تحریر

وہ ایک فلیٹ کا نشست کا کمرا تھا جہاں دو پرانے دوستوں عارفین اور شہزاد کی تکرار اتنی بڑھی کہ شہزاد غصے سے کھڑا ہو گیا۔ "تم نے اپنی ان باتوں سے آج میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ میرے معاملات میں اس حد تک دخل اندازی کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔"

"حق تو مجھے اس سے زیادہ ہے۔" عارفین نے تیکھے لہجے میں کہا "میں تمہیں تباہی کے اس راستے پر نہیں جانے دوں گا۔"

"میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں کہ یہ تباہی کا راستہ نہیں ہے۔" شہزاد پیر پٹخ کر بولا "میں نے اب تک کچھ پایا ہی ہے گنوایا نہیں ہے۔"

"لیکن کسی دن اتنا گنوا دو گے کہ ساری زندگی ہاتھ ملنا پڑے گا۔"

"مگر ایسا ہوتا بھی ہے تو تمہاری بلا سے! زندگی میری تباہ ہوگی تمہاری نہیں۔"

"تمہارے ساتھ فرزانہ کی زندگی بھی تباہ ہوگی۔"

"وہ میری بیوی ہے لہٰذا تمہیں اس کے لیے بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"تمہاری طرح وہ بھی میری دوست ہے۔ ہم تینوں نے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کی ہے۔ تم دونوں ہی میرے دوست ہو لہٰذا میں تم دونوں ہی کے لیے فکر مند ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر تم میرے سمجھانے کے باوجود باز نہیں آئے تو میں فرزانہ کو سب کچھ بتا دوں گا۔"



"کیوں بتاؤ گے اسے!" شہزاد دانت پیستا ہوا عارفین کی طرف بڑھا۔

عارفین کھڑا ہو گیا "یہ میرا فرض ہو گا۔" وہ بولا "اسے بعد میں مجھ سے یہ شکایت نہیں ہو گی کہ میں نے اسے بے خبر رکھا۔"

"تم میرے گھر میں فساد کھڑا کر کے آخر حاصل کیا کرنا چاہتے ہو؟" شہزاد نے عارفین کا گریبان پکڑ کر اسے اپنی طرف اتنے جھٹکے سے کھینچا کہ دونوں کے سر ٹکرا گئے۔

"گریبان چھوڑو!" عارفین چیخا۔



"نہیں چھوڑوں گا" شہزاد نے بھی حلق پھاڑا "تم میری بات کا جواب دو۔"

اس جھگڑے میں شاید وہ دونوں ہی یہ بھول گئے کہ گھر میں ایک تیسرا فرد بھی موجود تھا۔ فرزانہ شور سن کر ہی بڑی تیزی سے اس کمرے میں آئی تھی اور اس کمرے کا منظر دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ!" وہ چیختی ہوئی ان دونوں کی طرف جھپٹی۔

شہزاد نے جس طرح جھٹکے سے عارفین کو اپنی طرف گھسیٹا تھا' اسی طرح گریبان چھوڑتے ہوئے اسے زور سے دھکا بھی دیا۔

عارفین جس صوفے سے اٹھا تھا' اسی پر گر پڑا۔ پھر فوراً ہی سنبھلا اور اپنی قمیص درست کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے' لیکن بھینچے ہوئے ہونٹوں میں بھی ایسی لرزش تھی جیسے وہ اپنے برانگیختہ جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کیا ہو رہا تھا یہ آخر؟" فرزانہ نے شہزاد کا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ہانپنے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس کمرے تک دوڑتی ہوئی آئی تھی۔

شہزاد نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سر آگے جھکاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔

فرزانہ حیرت سے کبھی شہزاد کی طرف اور کبھی عارفین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"شہزاد!" عارفین افسردگی سے بولا "مجھے واقعی یہ خوش فہمی تھی کہ تم پر میرا بہت حق ہے' لیکن آج تم نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال کر میری ساری خوش فہمی ختم کردی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بات کبھی اس سے آگے بھی بڑھ جائے اس لیے آج کے بعد میں تمہارے اس گھر میں نہیں آؤں گا جسے میں اپنا گھر بھی سمجھتا رہا ہوں۔" وہ کھڑا ہو گیا "فرزانہ! اماں بیگم آئیں تو ان سے میرا اسلام کہہ دینا۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"ٹھہرو عارفین!" فرزانہ نے اس کی طرف قدم بڑھایا۔

"تم کیوں بے قرار ہو رہی ہو اس کے اس طرح جانے سے؟" شہزاد نے سر اٹھا کر تیکھی نظروں سے فرزانہ کی طرف دیکھا "تمہارا شوہر میں ہوں یا۔۔۔" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

فرزانہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آکر گزر گیا تھا۔

دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے عارفین کے قدم بھی ٹھٹکے تھے۔ شہزاد کی ادھوری بات نے شاید اس کے دل پر بھی کچوکا لگایا تھا' لیکن ٹھٹکنے کے بعد وہ مڑا نہیں۔ دوبارہ اس کے قدم زیادہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے تھے۔

فرزانہ کھڑے کھڑے اپنا ہونٹ کاٹتی ہوئی شہزاد کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

عارفین دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ فرزانہ واپس جانے کے لیے اندرونی دروازے کی طرف مڑی۔

"کیا دروازہ بند نہیں کرو گی؟" شہزاد بہت روکھے لہجے میں بولا۔

فرزانہ رکی' پھر مڑی۔ اس نے بیرونی دروازے کے پاس جا کر اسے بولٹ کیا اور شہزاد کی طرف دیکھے بغیر پھر اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"ٹھہرو!" اس مرتبہ شہزاد کا لہجہ نرم تھا۔

"مجھے کچن میں کام ہے۔" فرزانہ نے رک کر' مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔

"کام تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ادھر آؤ' میری بات سنو!"

فرزانہ مڑی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شہزاد کے قریب پہنچی۔

"بیٹھو!" شہزاد نے کہا اور پھر خود ہی فرزانہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ فرزانہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"ناراض ہو گئیں کیا؟" شہزاد محبت آمیز لہجے میں بولا۔ وہ اپنے رویے میں بہت تیزی سے تبدیلی لایا تھا۔

"تم سے ناراض ہو کر کہاں جاؤں گی؟" فرزانہ نے

تھکے ہوئے سے لہجے میں جواب دیا۔
"اس جواب میں بھی ناراضی ہے۔" شہزاد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے تھپکتا ہوا بولا "اس سے میرا جھگڑا ہوتا ہی رہتا ہے۔ تمہیں اس کا اتنا اثر نہیں لینا چاہیے۔"
"میرا خیال ہے کہ جھگڑا کبھی اتنا نہیں بڑھا ہوگا کہ نوبت گریبان تک پہنچ جائے؟" فرزانہ کی نظریں جھکی رہیں "لیکن تم خواہ مخواہ بات دوسری طرف لے جارہے ہو! تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگا کہ مجھے کس بات سے دکھ ہوا ہے۔"
"غصے میں میرے منہ سے ایک بات نکلنے تو لگی تھی، لیکن میں نے خود کو روک لیا تھا۔ بات مکمل نہیں کی تھی۔"
"ایسی نامکمل باتیں سننے والے کو مکمل سنائی دیتی ہیں۔"
"اچھا چھوڑو، اب غصہ تھوک دو۔ عارفین نے ایک چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا دیا تھا۔"
"کیا وہ چھوٹی سی بات ہوگی جس پر کوئی کسی کا گریبان پکڑ لے؟"
"بات چھوٹی سی ہی ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ہمارے ساتھ ایک لڑکا احتشام پڑھا کرتا تھا، تم شاید اسے نہیں جانتی ہوگی۔ پچھلے دنوں وہ بہت عرصے بعد مجھے اچانک مل گیا۔ اس کی تو دنیا ہی بدل گئی ہے۔ اس کے والد کوئی مناسب سا کاروبار کرتے تھے، لیکن اب تو ان کا کاروبار کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔ اٹھارہ لاکھ کی کار تو احتشام کے پاس ہے، لیکن اس میں غرور نام کو نہیں آیا ہے۔ مجھ سے بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملا تھا۔ دوسرے دن وہ خود میرے دفتر بھی آیا۔ اس طرح اس سے ملاقاتیں زیادہ ہونے لگی ہیں۔ عارفین کو اس سے بس میرا بڑھتا ہوا میل جول پسند نہیں ہے۔"
"اس کی کوئی وجہ تو ہوگی؟"
"اس کے دماغ میں بس یہ بات سما گئی ہے کہ مالی طور پر اتنی جلدی ترقی کرنے والوں کے کام ٹھیک نہیں

مسکرائیے!

منیر صاحب کے گھر کا دروازہ زور سے بجا۔ وہ غصے سے دروازے پر گئے اور بولے۔ "کون گدھے کا بچہ ہے؟"
باہر سے ان صاحب کے بیٹے کی آواز آئی۔
"ابو! میں ہوں۔"

☆☆

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔
"کیوں بھئی، تم نے گانے کی مشق کیوں چھوڑ دی؟"
"اپنے گلے کی وجہ سے۔" دوست نے آہ بھر کر کہا۔
"تمہارے گلے کو کیا ہو گیا؟" اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔
دوست نے افسردہ ہو کر جواب دیا۔
"کچھ نہیں، بس پڑوسیوں نے دبانے کی دھمکی دی تھی۔"

☆☆

اسپتال میں ایک دل کے مریض سے مزاج پرسی کے لیے آنے والے دوست نے پوچھا۔
"یہاں دل کی دھڑکن کو کم کرنے کے لیے بھی تمہیں کچھ مل رہا ہے؟"
مریض نے جواب دیا۔ "ہاں ایک بوڑھی نرس۔"

☆☆

کھانے کی ایک دعوت میں شریک خاتون نے دوسری سے پوچھا۔ "تمہیں کون سی ڈش پسند آئی؟"
"اسٹیل کی۔" دوسری نے جواب دیا۔

☆☆

"عاصم! تم اپنے مکان میں کیوں نہیں رہتے۔ دن رات ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہتے ہو۔"
کاشی۔ "کیا کروں بھائی۔ میرے مکان کا کرایہ بہت زیادہ ہے۔"

☆☆

ہوتے۔"

"سناتو میں نے بھی ایسا ہی ہے۔"

"نہیں فرزانہ! یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ بعض لوگوں کی قسمت راتوں رات چمک جاتی ہے۔"

"خیر، میں اس معاملے کو زیادہ کریدنا نہیں چاہتی، لیکن یہ تو کوئی مناسب بات نہیں ہے نا کہ تم ایک نئے دوست کی وجہ سے ایک پرانے دوست سے جھگڑا کر کے بیٹھ جاؤ۔"

"ارے وہ کوئی خاص بات نہیں۔ تم دیکھنا، وہ دو ایک دن میں ہی ملنے آجائے گا۔ وہ دماغ کا گرم، لیکن دل کا نرم ہے۔"

"وہ تو اچھا ہوا کہ اس وقت اماں بیگم گھر پر نہیں ہیں۔"

"کافی دیر ہوگئی انہیں گئے ہوئے۔"

"خرید و فروخت میں وہ دیکھ بھال اور مول تول بہت کرتی ہیں۔ اس طرح کچھ دیر تو لگ ہی جاتی ہے۔"

اسی وقت کال بیل کی آواز ہوئی۔

"لو وہ آ ہی گئیں۔" فرزانہ اٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگی۔

آنے والی خاتون شہزاد کی والدہ ہی تھیں جنہیں عارفین بھی اماں بیگم کہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

شہزاد نے فرزانہ کو پوری بات نہیں بتائی تھی۔ یہ تو سچ تھا کہ احتشام سے اس کی ملاقات اتفاقیہ تھی اور احتشام نے خود ہی اس سے اپنے تعلقات بڑھائے تھے لیکن عارفین کو ان تعلقات پر نہیں بلکہ اس بات پر اعتراض تھا کہ اس نے شہزاد اور احتشام کو جمال خان کے گھر سے نکلتا دیکھ لیا تھا اور یہ بات عارفین کے علم میں پہلے سے تھی کہ جمال خان نے اپنے گھر کو ایک چھوٹا سا قمار خانہ بنا رکھا تھا۔ لوگ وہاں جوا کھیلنے جاتے تھے۔

"وہاں زیادہ بڑا جوا نہیں ہوتا۔" احتشام نے شہزاد سے کہا تھا "تین چار گروپ ہوتے ہیں جو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کھیلتے ہیں۔ کوئی گروپ پچیس پچاس ہزار کی ہار جیت میں رہتا ہے اور کوئی گروپ چار پانچ لاکھ کی حد تک چلا جاتا ہے۔ میں کبھی کبھی تفریحاً ہی ادھر کا رخ کرتا ہوں۔ کبھی ایک ڈیڑھ لاکھ ہار جاتا ہوں، کبھی ایک ڈیڑھ لاکھ جیت جاتا ہوں۔ اندھا دھند میں نے کبھی نہیں کھیلا اور نہ کبھی کھیلوں گا۔ کسی دن تم بھی چلنا میرے ساتھ۔"

"میں کیا کروں گا جاکر! تیس ہزار تو میری تنخواہ ہے۔ میں اس قسم کی تفریح نہیں کر سکتا یار!"

"ضروری تو نہیں کہ تم بھی کھیلو۔ بس میرے ساتھ بیٹھے رہنا۔ کیا تم نے کبھی نہیں کھیلا؟"

"کھیلا تو ہے۔ کبھی کبھی بعض دوستوں کے ساتھ لیکن ہار جیت پانچ سات سو سے زیادہ کی نہیں ہوتی تھی۔"

"کھیل تو جانتے ہی ہو نا، میرے ساتھ بیٹھ کر بور تو نہیں ہو گے!"

"ہاں بور تو نہیں ہوں گا۔"

"بس تو پھر کل چلیں گے۔ آج تو سائرہ خان کا گانا سننے چلتے ہیں۔" احتشام نے شہزاد کو بتایا تھا کہ سائرہ خان کوئی طوائف نہیں تھی۔ اسے گانے کا شوق تھا۔ وہ ایک فور اسٹار ہوٹل کے سبزہ زار پر شام کے وقت دو گھنٹے غزلیں گایا کرتی تھی۔ اس کی آواز بہت زیادہ اچھی نہیں تھی، لیکن اس کے نقش و نگار بہت دلفریب تھے۔ احتشام کے بیان کے مطابق وہ خاصے آسودہ گھرانے کی فرد تھی۔ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد لندن میں رہتے تھے، ان کا کاروبار بھی وہیں تھا۔ وہیں انہوں نے دوسری شادی کرلی تھی۔ سائرہ خان کو اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ رہنا پسند نہیں تھا اس لیے وہ یہیں رہتی تھی۔ اس کے والد نے اسے یہاں ایک چھوٹا سا خوب صورت اپارٹمنٹ اور کار دلا دی تھی۔ ماہانہ اخراجات کے لیے معقول رقم بھی بھیجتے رہتے تھے۔ گانا اس کا محض شوق تھا جو وہ اس فور اسٹار ہوٹل میں گا کر پورا کیا کرتی تھی۔

شہزاد ایک مرتبہ احتشام کے ساتھ وہاں جا چکا تھا۔

اس دن بھی وہ شہزاد کے ساتھ وہاں گیا اور دوسرے دن شہزاد اسے جمال خان کے گھر لے گیا۔ دو دو' ایک ایک دن کے وقفے سے شہزاد تین مرتبہ وہاں گیا اور محض تماشائی بنا رہا۔ تین بار میں احتشام مجموعی طور پر ایک لاکھ کے فائدے میں رہا تو شہزاد کو بھی اکساہٹ ہونے لگی۔ اس کا اضطرار محسوس کر کے احتشام بولا "جی چاہ رہا ہے تو کھیل لو۔"

"نہیں یار! اگر زیادہ رقم ہار گیا تو مصیبت ہو جائے گی۔"

"مجھ سے لے لو ایک لاکھ روپیا۔"

"ہار گیا تو واپس کہاں سے کروں گا؟"

"میں تمہیں قرض تھوڑی دوں گا۔ یوں سمجھ لو کہ تم میری طرف سے کھیلو گے۔ اگر تم ہار گئے تو میں سمجھوں گا کہ میں ہار گیا اور اگر تم جیت گئے تو وہ جیتی ہوئی رقم میری ہوگی۔"

شہزاد اس کے لیے تیار ہو گیا۔

پھر یہ شاید اتفاق ہی تھا کہ چار نشستوں میں شہزاد ایک مرتبہ ہارا اور تین مرتبہ جیتا۔ مجموعی طور پر اس نے ڈھائی لاکھ روپے جیتے جو احتشام نے اس سے لے لیے۔

شہزاد کے دل میں کسک سی ہو گئی۔ اگر وہ اپنے پیسے سے کھیلتا تو جیت کا فائدہ اسے ہی ہوتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگلی مرتبہ وہ اپنے پیسے سے کھیلے گا۔ گزشتہ ایک سال میں اس نے ساٹھ ہزار روپے پس انداز کیے تھے' وہ اس نے بینک سے نکال لیے۔ احتشام نے اس کا ارادہ بھانپ کر کہا۔

"بہتر ہوتا کہ تم میرے پیسوں سے کھیلتے رہتے۔"

لیکن شہزاد نے اس کی بات نہیں مانی۔ اسے یہ گمان ہو گیا تھا کہ جوئے کے معاملے میں وہ خوش نصیب اور "باصلاحیت" ہے۔

"میرے پاس ساٹھ ہزار روپے ہیں۔ میں بس یہی لگاؤں گا داؤ پر لیکن تمہارے گروپ کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ مجھے اس گروپ سے ملوا دینا جہاں ہار جیت پچیس پچاس ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی۔"

"تمہیں اتنی خواہش ہے تو میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ نیا جواری عموماً جیت میں رہتا ہے۔"

پھر اس دن شہزاد نے اپنے جسم میں بڑی سنسنی محسوس کی جس دن اپنے پیسوں سے کھیلنے بیٹھا۔

جو لوگ وہاں جوا کھیلنے آئے تھے' ان میں سے اکثریت وہاں شراب بھی پیتی تھی۔ اس کا بندوبست بھی جمال خان کیا کرتا تھا۔ شہزاد نے احتشام کو بھی پیتے دیکھا تھا لیکن اسے کبھی پینے کی خواہش نہیں ہوئی تھی۔

اس دن جوئے کی میز پر بیٹھنے سے پہلے احتشام نے اس سے کہا "ایک آدھ پیگ لگا کر بیٹھو۔"

"نہیں یار! میں شراب نہیں پیوں گا۔"

احتشام نے اصرار نہیں کیا۔ اس دن وہ بھی شہزاد کے ساتھ چھوٹے گروپ میں بیٹھ گیا۔

"تمہیں تو اتنے چھوٹے کھیل میں مزا نہیں آئے گا۔" شہزاد نے اس سے کہا۔

"مجھے ہر طرح مزا آتا ہے یار!"

شہزاد نے مزید کچھ نہیں کہا۔

جمال خان کے اس قمار خانے کا ایک اصول تھا کہ ہر گروپ وقت کا تعین کر کے بیٹھتا تھا۔

مقررہ وقت پر جب شہزاد اور احتشام اٹھے تو شہزاد بہت بجھا ہوا تھا۔ وہ اس نشست میں چھبیس ہزار روپے ہار گیا تھا۔

واپسی پر احتشام نے اس سے کہا "تمہاری آج کی ہار کا ایک سبب تو میں بھانپ گیا ہوں۔"

"شاید مجھے بھی اندازہ ہے۔" شہزاد نے کہا "میں ڈر کر کھیل رہا تھا کہ کہیں ہار نہ جاؤں۔"

"ہاں۔" احتشام نے اس کی تائید کی "اور یہ بات طے ہے کہ ڈر کر کھیلا جائے تو ہارنے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ایک آدھ پیگ پی لو۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اعصابی مضبوطی آجاتی ہے' ہمت بڑھ جاتی ہے

اور آدمی چھوٹے پتے جلدی نہیں پھینکتا۔ آج تم نے کئی مرتبہ ایسے پتے پھینکے جو چھوٹے تو تھے مگر جیت رہے تھے۔"

"ٹھیک ہے" شہزاد نے فیصلہ کیا "کل میں پی کر کھیلوں گا۔"

"کل میرا پروگرام تو نہیں تھا یہاں آنے کا لیکن تمہاری خواہش ہے تو آجائیں گے۔ پچیس ہزار روپے تم مجھ سے لے لینا۔"

"کیوں؟"

"اس گروپ میں کھیلنے کے لیے بھی جیب میں پچاس ہزار تو ہونا ہی چاہئیں اور تمہارے پاس اب چوبیس ہزار روپے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ کل مجھے تنخواہ ملے گی۔ میں اب کھیلوں گا تو اپنے ہی پیسے سے کھیلوں گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

پھر دوسرے دن شام کو شہزاد کھیلنے بیٹھا تو اس کے پاس چونسٹھ ہزار روپے تھے۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے اس نے ایک پیگ کے بجائے دو پیگ پینا چاہے لیکن احتشام نے اسے روک دیا۔

"پہلی بار پی رہے ہو اس لیے بس ایک پیگ ہی پیو۔"

شہزاد نے اس کی بات مان لی۔ پھر جب کھیل شروع ہوا تو ایک گھنٹے کے اندر شہزاد نے بیس ہزار جیت لیے۔

"یار' ایک پیگ اور پلواؤ۔" شہزاد نے احتشام سے فرمائش کی۔

"چلو ایک گھنٹا گزر گیا ہے اور پی لو ایک پیگ۔"

احتشام نے اس کے لیے ایک پیگ منگوایا۔

اس دن کھیل ختم ہونے پر شہزاد بہت خوش تھا۔ اس نے چالیس ہزار روپے جیتے تھے۔ گزشتہ روز کی ہار اپنے ساتھ چودہ ہزار روپے لے کر آئی تھی۔

احتشام نے اسے مبارک باد دی۔

"میں پی کر ہی کھیلا کروں گا۔" شہزاد بہت مسرور تھا۔ "لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ بعد میں بھی دو ڈھائی گھنٹے تمہارے ساتھ ہی گزریں۔"

"کیوں؟"

"میں ایسی حالت میں گھر جانا چاہتا ہوں کہ میری بیوی یا میری والدہ کو میرے شراب پینے کا شبہ بھی نہ ہو!"

"لیکن دیر سے گھر پہنچنے کا کیا سبب بتاؤ گے؟"

"کہہ دوں گا کہ اب دفتر میں میری ذمے داریاں کچھ بڑھ گئی ہیں اور اس کی وجہ سے مستقبل میں تنخواہ بڑھنے کا امکان بھی ہے۔"

احتشام ہنس کر چپ ہو گیا۔

اس سے اگلے مہینے میں شہزاد اور احتشام چھ مرتبہ جمال خان کے گھر گئے۔ اس میں سے صرف ایک نشست ایسی رہی جس میں شہزاد بچپن ہزار روپے ہارا لیکن باقی نشستوں میں اتنا جیتا کہ اس کی مجموعی جیت ایک لاکھ دس ہزار روپے ہو گئی۔ احتشام وہ سب پیسے جمع کرتا رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اب وہ بڑے گروپ میں بیٹھ کر کھیلے۔ وہ سوچتا تھا کہ زیادہ پیسوں ہی سے زیادہ جیتا جا سکتا ہے۔

عارفین کا مزاج شہزاد سے بہت مختلف تھا اس لیے شہزاد نے اس سے اپنے اس نئے "مشغلے" کا ذکر نہیں کیا لیکن ایک بار اتفاق سے عارفین نے اسے احتشام کے ساتھ جمال خان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔

"میں جانتا ہوں کہ وہاں جوا ہوتا ہے۔" عارفین نے اس سے کہا تھا "وہاں قریب ہی میرے ایک شناسا بزرگ رہتے ہیں۔ میں کبھی کبھی ان کے پاس جاتا ہوں' انہوں نے ہی مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔ علاقے کے ایس ایچ او کو بھی یہ بات معلوم ہے لیکن اسے ہر ماہ جمال خان سے معقول رقم ملتی ہے۔"

شہزاد جانتا تھا کہ عارفین کی کوئی بات بھی غلط نہیں تھی۔ جمال خان اپنے گھر میں آنے والے جواریوں سے اپنا حصہ بھی لیتا تھا۔

"میں احتشام کے ساتھ تفریحاً" کبھی کبھی چلا جاتا ہوں۔" شہزاد نے اعتراف کر لیا تھا۔

"یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسی جگہ جا کر خود نہ کھیلے اور لوگوں کا منہ تکتا رہے۔"

"ہاں یار' میں بھی کبھی کبھی کھیل لیتا ہوں لیکن میں نے کبھی زیادہ رقم نہیں لگائی۔" شہزاد نے یہ اعتراف بھی کرلیا اور یہ جواز بھی دیا کہ اسے احتشام کی دوستی کی لاج رکھنا پڑتی ہے۔

"وہ تمہیں جوا کھلانے لے گیا ہے اس لیے میں اسے تمہارا دوست ماننے کے لیے تیار نہیں۔"

عارفین کی اس بات پر شہزاد کچھ تلخ ہو گیا تھا اور تکرار اتنی بڑھی تھی کہ شہزاد نے عارفین کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔

✲ ✲ ✲

فرزانہ سے اصل بات چھپالینے کے باوجود اس جھگڑے سے شہزاد کی طبیعت خاصی مکدر ہو گئی تھی۔ اس روز ہفتہ ہونے کے باوجود اس کا گھر سے کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا لیکن تکدر کے باعث اس نے احتشام سے اس کے موبائل فون پر رابطہ کیا۔

"خیریت؟" احتشام نے اس سے کہا۔

"کہاں ہو؟" شہزاد نے پوچھا۔

"کچھ دوستوں کے ساتھ تھا۔ اب یہاں سے روانگی کے لیے کار میں بیٹھا ہی تھا کہ تمہاری کال آگئی۔ ابھی میں نے انجن بھی اسٹارٹ نہیں کیا ہے۔"

"میں بہت بور ہو رہا تھا اس لیے تمہیں فون کر بیٹھا۔"

"تم نے تو کہا تھا کہ آج گھر میں ہی رہو گے!"

"کہا تو تھا لیکن اچانک ایک واقعے سے طبیعت بور ہو گئی ہے۔ اگر تم فارغ ہو تو کہیں چلا جائے۔"

"کیا سائرہ خان کا گانا یاد آ رہا ہے؟" احتشام ہنسا۔

"نہیں یار! میں بس گھر سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا تو پھر وہیں چلتے ہیں۔ میں تمہیں کہاں سے لے لوں؟"

"جب تم نے وہاں چلنے کی بات کی ہے تو میں سیدھا وہیں پہنچ جاتا لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے ضروری ہے کہ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزاروں۔ تم کار میں بھی رکھتے ہو نا؟"

"کیا چیز؟"

"اب یہ بھی بتانا پڑے گا؟"

"اوہو!" احتشام پھر ہنسا۔ "اس حد تک موڈ خراب ہے؟"

"ہاں یار! میں رینگل چوک پہنچ جاتا ہوں۔ تم مجھے وہیں سے لے لو۔"

"نہیں ایسی جگہ ہوں کہ تمہارا گھر راستے میں پڑے گا۔ میں تمہیں وہیں سے لے لیتا ہوں۔ تم بیس منٹ بعد نیچے آجانا۔"

"ٹھیک ہے۔ اس وقت میرا موڈ بھی نہیں تھا موٹر سائیکل چلانے کا۔"

"بس بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

شہزاد ٹیلی فون بند کر کے کمرے سے نکلا۔ اس کی والدہ لاؤنج میں بیٹھی ٹیلی وژن پر ہونے والی عشا کی اذان سن رہی تھیں۔

شہزاد وہاں جا کے بیٹھ گیا۔ اس کی والدہ اذان سننے کے بعد اٹھیں۔

"آپ نماز پڑھنے جا رہی ہیں؟" شہزاد بولا۔

"ہاں۔"

"آپ اور فرزانہ کھانا کھا لیجئے گا۔ ابھی ایک دوست کا فون آیا تھا۔ وہ مجھے لینے آ رہا ہے۔ میں پندرہ منٹ بعد نیچے اتر جاؤں گا۔ آپ کو اس لیے بتا دیا کہ اس وقت آپ نماز پڑھ رہی ہوں گی۔"

"کھانا واپس آ کر کھاؤ گے تو تمہیں اکیلے ہی کھانا پڑے گا۔ فرزانہ تو تمہارا انتظار کرتی ہے' تمہارے ساتھ ہی کھاتی ہے۔"

"نہیں۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "کھانا مجھے اس دوست کے ساتھ ہی کھانا ہے۔"

"تو پھر فرزانہ کو بتا جاؤ۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"کچن میں۔"

شہزاد اٹھ کر کچن میں پہنچا۔

"ارے!" فرزانہ اسے دیکھ کر بولی "کیا ابھی سے بھوک لگ رہی ہے؟"

"نہیں۔" شہزاد نے کہا "میں اختشام کے ساتھ کھالوں گا۔ ابھی اس کا فون آیا تھا۔ وہ مجھے لینے آرہا ہے۔"

"اوہ!" فرزانہ کا چہرہ بہت سنجیدہ ہوگیا۔

شہزاد کو خدشہ ہوا کہ فرزانہ کی کوئی بات اس کا موڈ زیادہ خراب نہ کردے اس لیے وہ فرزانہ کے بولنے سے پہلے ہی کچن سے نکل آیا۔ نہ صرف کچن سے بلکہ فلیٹ سے بھی نکل پڑا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پندرہ منٹ لاؤنج میں گزارے اور فرزانہ وہاں آکر کوئی بات چھیڑ دے۔ اس سے بہتر اس نے یہی سمجھا تھا کہ نیچے فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے اختشام کا انتظار کرلے۔

عارفین کے چلے جانے کے بعد شہزاد نے فرزانہ سے بات کرتے ہوئے اپنی جذباتی کیفیت کی گرمی چھپائے رکھی تھی لیکن اس کے دل میں وہ گرمی موجود رہی تھی اسے یہ خدشہ رہا تھا کہ عارفین نے فرزانہ کو اس کے جوا کھیلنے کے بارے میں بتانے کی جو دھمکی دی تھی' اس پر وہ بعد میں کسی وقت عمل کر بھی سکتا تھا۔ اسی خیال سے اس پر جھنجلاہٹ طاری رہی تھی جو غیرارادی طور پر کسی وقت ظاہر ہو بھی سکتی تھی اس لیے اس نے اس وقت گھر سے نکل جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔

اختشام کی کار اس کے پاس آکر رکی تو وہ دروازہ کھول کر اختشام کے برابر میں بیٹھ گیا۔

اختشام نے کار حرکت میں لاتے ہوئے سافٹ ڈرنک کا ایک ٹن اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس سے دو تین بڑے گھونٹ لے لو۔"

ایک مرتبہ پہلے بھی ایسا ہوچکا تھا۔ جمال خان کے گھر کی طرف جاتے ہوئی انہوں نے کار میں بیٹھے بیٹھے اسی طرح پی تھی کہ سافٹ ڈرنک کے ٹن میں وہسکی ملائی تھی۔ اختشام اپنی کار میں بوتل نہیں رکھتا تھا لیکن چھ سات منی ایچر پڑے رہتے تھے۔

کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے اختشام نے ایک منی ایچر شہزاد کو دیا جو اس نے سافٹ ڈرنک کے ٹن میں ڈال لیا "کیا تم نہیں لوگے؟"

"نہیں۔" اختشام نے جواب دیا "میں دوستوں کے ساتھ تین پیگ لے چکا ہوں۔ اس وقت اور زیادہ نہیں لوں گا۔"

"میں تو ایک اور پیوں گا۔"

"سافٹ ڈرنک کا ایک ٹن اور ہے۔ میں نے راستے سے دو لے لیے تھے۔"

"دوسرے ٹن کی ضرورت نہیں۔ ایک منی ایچر اور دو۔ میں اسی ٹن میں ملالوں گا۔"

"زیادہ تلخ ہوجائے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ آج زیادہ تلخ سہی۔"

"اتنے تلخ کیوں ہورہے ہو؟" اختشام نے پوچھا لیکن ساتھ ہی ایک اور منی ایچر بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔

"گھر میں کبھی کبھی کوئی خلاف مزاج بات ہو ہی جاتی ہے' اس وقت اس کا ذکر چھوڑو۔ میں اسے بھلانے ہی کے لیے تو تمہارے ساتھ آیا ہوں۔ کوئی دوسری بات کرو۔"

"کرنے کے لیے ایک بات ہے تو!" اختشام نے کہا "کل شام تم میرے ساتھ زیادہ دیر نہیں رہے تھے۔ بعد میں میرا موڈ ہوا تو میں کھانا کھانے ہوٹل چلا گیا۔ کھانا میں نے خاصی دیر سے کھایا تھا۔ سائرہ خان کا پروگرام ختم ہوا تو وہ میری میز پر آگئی۔"

"اچھا!" شہزاد نے اختشام کی طرف دیکھا "تم نے کبھی بتایا نہیں کہ اس سے تمہاری واقفیت ہے۔"

"معمولی سی واقفیت ہے۔ کوئی ایسا ذکر آتا تو میں بتا بھی دیتا۔ اگر اس سے میرے زیادہ مراسم ہوتے تو ذکر کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تمہیں معلوم ہی ہوجاتا۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ کل وہ میری میز پر کیوں آئی تھی؟"

شہزاد سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھی۔" اختشام نے کہا۔

"میرے بارے میں؟" شہزاد کو حیرت ہونا ہی چاہیے تھی۔

"ہاں۔" اختشام نے جواب دیا "جب سے تم نے میرے ساتھ وہاں جانا شروع کیا ہے، وہ الجھن کا شکار رہی ہے۔ تمہیں دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوتا رہا تھا کہ وہ تمہیں جانتی ہے۔ پھر پرسوں اسے یاد بھی آگیا۔ اس نے اپنے بیڈ روم کی شیلف میں وہ رسالہ ڈھونڈ بھی لیا جس میں اس نے تمہاری تصویر دیکھی تھی۔ کبھی کبھی پرچوں میں تمہاری غزلیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی کسی غزل کے ساتھ تمہاری تصویر بھی چھپی ہے۔"

"ہاں، ایک مرتبہ ایسا ہوا تو ہے۔"

"اسی لیے اسے الجھن رہی تھی کہ وہ تمہیں کہیں دیکھ چکی ہے۔"

"الجھن میں کیوں رہی؟ پہلے ہی تم سے پوچھ لیتی!"

"میں نے بتایا نا کہ اس سے میری کچھ زیادہ واقفیت یا مراسم نہیں رہے۔ کل تو وہ مجھ سے یہ پوچھنے کے لیے میری میز پر آگئی تھی کہ تم میرے ساتھ کیوں نہیں ہو۔ وہ تمہاری شاعری کی بہت مداح ہے یار! مجھے علم نہیں تھا کہ تم اتنے اچھے شعر کہتے ہو!"

"ارے نہیں یار! میں نے شاعر ہونے کا کبھی دعوا نہیں کیا۔ یوں ہی بس شعر موزوں کر لیتا ہوں۔" شہزاد نے انکساری کا مظاہرہ کیا لیکن اس کے جسم میں ہلکی سی سنسناہٹ پھیل گئی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا جب اسے معلوم ہوا تھا کہ ایک خوب صورت لڑکی اس کی مداح تھی۔

اختشام بولا "وہ تو تم سے ملاقات کرنے کے لیے بے چین ہو گئی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اب تم جب بھی میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں اس سے ضرور ملواؤں۔ آج وہ تمہیں دیکھے گی تو ہماری میز پر ضرور آئے گی۔"

"عجیب بات ہے۔ مجھے تو کبھی خیال نہیں آیا کہ کسی کو میری شاعری اتنی زیادہ پسند آسکتی ہے۔"

"میں تو شاعری کے معاملے میں بدذوق ہی ہوں لیکن تم دیکھنا، وہ تم سے بڑی گرم جوشی سے ملے گی۔"

شہزاد نے ٹن منہ سے لگا کر ایک بڑا گھونٹ لیا۔

اختشام نے کار کی رفتار خاصی کم رکھی تھی۔ غالباً وہ چاہتا تھا کہ شہزاد ہوٹل پہنچنے تک ٹن خالی کر دے۔

"وہ لڑکی پڑھی لکھی بھی ہے اور مزاج کی بھی بہت اچھی ہے۔" اختشام نے کہا "میں نے تمہیں بتایا ہی تھا کہ وہ ایک اچھے اور متمول گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس سے مل کر تمہیں بھی خوشی ہو گی۔"

شہزاد نے ٹن منہ سے لگا کر پھر ایک بڑا گھونٹ لیا۔

☆ ☆ ☆

کار جب ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں جا کر رکی تو اختشام نے وہاں کھڑی ہوئی ایک کار کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ سائرہ خان کی تھی۔

"یہ تو خاصی قیمتی کار ہے۔" شہزاد زیر لب بڑبڑایا۔

"میں تمہیں بتا تو چکا ہوں کہ وہ ایک مالدار باپ کی بیٹی ہے۔ بس اس لیے باپ سے الگ ہو گئی ہے کہ سوتیلی ماں کو برداشت نہیں کر سکتی لیکن باپ اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ ہر ماہ لندن سے ایک خاصی بڑی رقم یہاں سائرہ خان کے اکاؤنٹ میں آجاتی ہے۔"

"تمہیں یہ کیسے معلوم؟ اس سے تمہارے تو زیادہ مراسم نہیں ہیں نا!"

"ہوٹل کے منیجر سے میرے اچھے خاصے تعلقات ہیں۔ ایک مرتبہ اسی سے سائرہ خان کا کچھ ذکر ہوا تھا تو اس نے مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا۔"

وہ دونوں کار سے اتر کر باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

اس ہوٹل کے تین لان تھے۔ دو لان لوگوں کی مختلف تقریبات کے لیے وقف تھے۔ تیسرا لان ہوٹل کے ان گاہکوں کے لیے تھا جو رات کا کھانا کھلے آسمان کے نیچے کھانا پسند کرتے تھے۔ ان ہی لوگوں کی دل بستگی کے لیے اس لان کے ایک کنارے پر وہ چھوٹا سا ڈائس تھا جہاں سازندے شام کے بعد سے رات گئے تک دھنیں بجایا کرتے تھے۔ سائرہ خان وہاں نو بجے سے بس گیارہ بجے تک نغمہ سرا ہوا کرتی تھی۔

شہزاد اور اختشام وہاں سوا دس بجے کے قریب پہنچے۔ کھانے سے فارغ ہونے میں انہیں گیارہ بج گئے۔ اسی

وقت سائرہ خان نے اپنا پروگرام ختم کیا اور احتشام کے کہنے کے مطابق صرف پانچ منٹ بعد وہ ان دونوں کی میز کے قریب تھی۔

"آیئے۔" احتشام نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ شہزاد بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

اس ملاقات میں سائرہ خان نے شہزاد کی اتنی تعریف کی کہ وہ خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ اس کی اس کیفیت کا کچھ سبب شراب کے اثرات بھی تھے اور سائرہ خان کے قرب کی بھینی بھینی خوشبو بھی۔ شہزاد کے دماغ میں اس وقت پہلی مرتبہ یہ خیال بھی آیا کہ اس کی اور فرزانہ کی شادی محبت کی شادی تھی لیکن فرزانہ نے اس کی شاعری کو کبھی نہیں سراہا تھا۔

"آپ کا دیوان شائع ہونا چاہیے۔" سائرہ خان نے کہا۔

"کبھی کسی پبلشر کی خواہش ہوگی تو یہ بھی ہو جائے گا۔" شہزاد نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"آپ خود شائع کروایئے۔"

"کیا احتشام نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں ایک ملازمت پیشہ شخص ہوں!"

"اگر آپ کا اشارہ کتاب کی اشاعت کے اخراجات کی طرف ہے تو اس کے لیے میں حاضر ہوں۔"

"ارے نہیں! یہ تو کچھ مناسب نہیں ہوگا۔ ویسے بھی میں نے ابھی اتنا نہیں لکھا کہ دیوان بن جائے۔ مشکل سے ستر اسی غزلیں ہیں میری۔"

"تو اب تیزی سے لکھنا شروع کر دیجئے۔ مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ ہفتے میں کم از کم دو غزلیں ضرور کہیں اور لوگ وہ غزلیں سب سے پہلے مجھ سے سنیں! اکثر دھنیں میں خود ہی بناتی ہوں۔ آپ کی غزلوں کی دھنیں بنا کر تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

"اگر آپ گانا چاہتی ہیں تو میں ضرور لکھوں گا۔" شہزاد بہت مسرور ہو گیا۔

"آپ کی غزلیں لوگ پہلے مجھ سے سنیں تو یہ میرے لیے باعث فخر ہوگا۔"

"میں آپ کے لیے بہت خوشی سے لکھوں گا۔"

"کسی دن غریب خانے پر آ کر میرے ساتھ کھانا کھایئے۔"

"اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟"

"اگر آپ تشریف لائیں گے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

فوراً" احتشام نے لقمہ دیا "دوسروں کی خوشی کے لیے تو انسان کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

"جمعے کو آجایئے۔" سائرہ خان کے لہجے میں بڑا اشتیاق تھا "جمعے کو یہاں میرا پروگرام نہیں ہوتا۔ آپ دونوں آٹھ بجے تک آجائیں، میں بے چینی سے انتظار کروں گی۔"

"مجھے بلانے کا تکلف کیوں کر رہی ہیں!" احتشام دھیرے سے ہنسا۔

"آپ کیوں نہیں احتشام صاحب! آپ کی وجہ سے تو مجھے شہزاد صاحب سے ملنے کا فخر حاصل ہوا ہے۔"

اس طرح یہ بات طے ہو گئی کہ جمعے کو وہ دونوں رات کا کھانا سائرہ خان کے گھر پر کھائیں گے۔

جانے کی اجازت لینے کے ساتھ ہی سائرہ خان نے شہزاد کو اپنا کارڈ دیا پھر بولی "ویسے کل یہاں تو آیئے گا نا؟"

"کل تو شاید نہ آسکیں۔ کیوں شہزاد؟ کل تو جمال خان کی طرف جانے کا پروگرام ہے۔"

"وہاں ذرا جلدی چلیں گے اور جلدی اٹھ جائیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔"

سائرہ خان چلی گئی۔

"یہ تو تمہاری شاعری پر بری طرح مر مٹی ہے۔" احتشام مسکرا کر بولا۔

"مجھے بھی یہی احساس ہو رہا ہے۔"

"یہ حقیقت ہے میرے دوست! یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ وہ ہماری میز پر آدھا گھنٹا گزار گئی۔ یہاں مستقل آنے والے چند افراد ایسے ہیں جو اس کی نظر

التفات کے شدت سے خواہاں ہیں لیکن اس نے ان میں سے کسی کو بھی لفٹ نہیں دی' ہمیشہ ریزرو رہتی ہے۔ آج کئی افراد ہمیں بڑی حاسدانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔"

شہزاد ہنس دیا۔ اس کی ہنسی میں تفاخر تھا۔ وہ بولا "چلو اب اٹھا جائے۔"

"آج اتنی جلدی کیوں ہے۔ پینے کے بعد تم میرے ساتھ خاصا وقت گزارتے ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ اب میں ٹھیک ہوں۔ میری چال ڈھال یا لب و لہجے میں میری والدہ کو ہرگز شبہ نہیں ہو سکے گا۔"

"والدہ کو تو نہیں ہوگا لیکن بیوی کی بات دوسری ہوتی ہے۔"

"دوسری بات کو جہنم میں ڈالو۔" شہزاد نے منہ بنایا۔

"کیا مطلب؟" احتشام نے اسے حیرت سے دیکھا "یہ بات آج تم پہلی بار کہہ رہے ہو۔"

"اب کہتا ہی رہوں گا۔"

"کیا آج بیوی ہی سے کچھ جھگڑا ہوا تھا؟"

"اس کا ذکر چھوڑو۔"

"اچھا!" احتشام نے ایک طویل سانس لی "جیسی تمہاری مرضی۔"

بل کی ادائیگی کے بعد وہ دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔

"تمہیں یاد ہے نا!" کار میں بیٹھنے کے بعد شہزاد بولا "کل میں اسی گروپ میں کھیلوں گا جس میں تم کھیلا کرتے تھے۔"

"مجھے یاد ہے۔ تم نے ایک لاکھ دس ہزار روپے جمع کر لیے ہیں۔"

"اور ساٹھ ہزار میرے اپنے بھی ہیں۔"

"میرا مشورہ مانو تو چھوٹے گروپ میں ہی کھیلتے رہو۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ تم ایک لاکھ سے زیادہ جیت گئے ہو۔ اب دو ایک مرتبہ ہار بھی گئے تو تیسری نشست میں جیت لوگے۔ دو مرتبہ ہارنے کے بعد تمہیں یہ فکر نہیں ہوگی کہ اگلی نشست کے لیے روپے کہاں سے لاؤ گے لیکن بڑے گروپ میں اگر تم ایک نشست میں ڈیڑھ لاکھ ہار گئے تو پھر کیا ہوگا۔"

"میرا دل کہتا ہے کہ میں نہیں ہاروں گا۔ بڑے کھیل میں یقیناً" بڑا ہیجان خیز لطف آئے گا۔ نہ جانے تم میرے ساتھ چھوٹے گروپ میں کیسے کھیلنے لگے۔ تمہیں ہرگز لطف نہیں آتا ہوگا۔"

"تم جس ہیجان خیز لطف کی بات کر رہے ہو' وہ مجھے پہلے گروپ کے ساتھ کھیلنے میں بھی نہیں آتا تھا۔ وہ لطف مجھے اس جگہ آسکتا ہے جہاں بات کروڑوں تک جاتی ہو۔ وہ ہیجان خیز لطف اسی وقت آتا ہے جب آدمی اپنی بساط سے بڑھ کر کھیلے اور وہ لطف میں حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ پہلی ہی نشست میں ایک آدھ کروڑ کی ہار میرے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔ میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ اس ہیجان خیز لطف کے بارے میں نہ سوچو۔"

"تم کئی بار کہہ چکے ہو کہ نیا جواری عموماً" جیت میں رہتا ہے۔"

"لیکن اب تم نئے نہیں رہے ہو!"

"زیادہ پرانا بھی نہیں ہوا ہوں۔" شہزاد ہنس پڑا۔ "میرا دل کہتا ہے کہ میں اب بھی جیتوں گا۔"

"تمہاری مرضی۔" احتشام نے زیادہ بحث سے گریز کیا۔

"کل کس وقت چلنا ہے؟"

"معمول تو یہ رہا ہے کہ ہم نو بجے سے گیارہ بجے تک کھیلتے ہیں لیکن کل آٹھ بجے سے پہلے پہنچ جائیں گے۔ کل کے لیے تم نے سائرہ خان سے بھی تو وعدہ کر لیا ہے۔" احتشام معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"وہ اچھی لڑکی ہے یار!" شہزاد نے بس اتنا ہی کہا۔

✲ ✲ ✲

دوسرے دن وہ دونوں آٹھ بجنے میں دس منٹ پر جمال خان کے گھر پہنچ گئے۔ اس دن تک شہزاد کا معمول رہا تھا کہ وہ ایک پیگ کھیل شروع کرنے سے پہلے اور ایک پیگ کھیل کے دوران میں پیتا تھا لیکن

اس شام اس نے ایک پیگ احتشام کی کار میں ہی پی لیا تھا۔ دوسرا پیگ کھیل کے ساتھ ہی شروع کیا۔

پرانے گروپ نے احتشام کی "واپسی" پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

دوسرا پیگ ختم کرتے کرتے شہزاد تیس ہزار جیت چکا تھا۔ موج میں آکر اس نے تیسرا پیگ منگوالیا۔

احتشام کے لیے وہ پینتیس منٹ بہت برے ثابت ہوئے تھے۔ تین بہت بڑے بڑے پتے مسلسل پٹ جانے کے باعث وہ دولاکھ روپے ہار گیا تھا۔

"میرے پاس تو پیسے ہی ختم ہوگئے۔" وہ ہنس کر بولا "میرا خیال ہے کہ مجھے اب نہیں کھیلنا چاہیے۔"

"کیا بالکل ختم ہوگئے؟" شہزاد نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی پچاس ہزار تو ہیں لیکن ان سے بات نہیں بنے گی۔"

"پچاس ہزار مجھ سے لے لو" شہزاد نے فراخ دلی سے کہا "تمہارے بغیر کھیلنے میں تو مجھے مزا نہیں آئے گا۔"

"اچھا ٹھہرو! میں جمال خان سے لیتا ہوں۔"

وہاں کھیل میں ہار جانے والے لوگ اکثر جمال خان سے قرض لیا کرتے تھے۔ جمال خان کے پاس ٹائپ کی ہوئی ایک مخصوص عبارت کی کئی کاپیاں ہر وقت رہتی تھیں۔ ان میں ہاتھ سے بس قرض خواہ کا نام اور رقم لکھ کر قرض خواہ سے دستخط کروا لیے جاتے تھے۔

اسی طریقہ کار کے مطابق احتشام نے جمال خان سے ڈیڑھ لاکھ روپے لیے اور کھیل میں شامل رہا۔

پھر پندرہ منٹ بعد ہی شہزاد کے پاس اتنے بڑے پتے آئے کہ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے یقین ہوگیا کہ وہ اس ہینڈ میں خاصی رقم جیت جائے گا۔ چال پچاس ہزار کی ہوئی تو ایک کے علاوہ باقی سب کھلاڑیوں نے پتے پھینک دیے۔ شہزاد کی باری آئی تو اس نے بے دھڑک چال ڈبل کردی۔ حالانکہ ایک لاکھ کی چال چلنے کے بعد اس کے پاس دس ہزار روپے رہ گئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ مخالف کھلاڑی پتے پھینکنے کے بجائے "شو" ضرور لے لیکن

اس وقت اس کا دل دھک سے رہ گیا جب مخالف کھلاڑی نے چال دولاکھ کی کردی۔

شہزاد نے اعصابی تناؤ کے عالم میں احتشام کی طرف دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "تمہارے پاس کچھ رقم ہے؟"

"نہیں۔" احتشام نے سنجیدگی سے کہا "تم دیکھ چکے ہو کہ ابھی ابھی میرا ایک بہت بڑا پتا پٹا ہے۔ جمال خان سے جو کچھ لیا تھا، وہ میں ہار چکا ہوں۔"

شہزاد کو پسینہ آگیا۔ اتنے دن تک وہاں کھیلتے رہنے کے باعث وہ وہاں کے قواعد سے اچھی طرح واقف ہوچکا تھا۔ "شو" لینے کے لیے ضروری تھا کہ کھلاڑی کے پاس چال کے مطابق رقم ہو، ورنہ اسے اپنے پتے پھینکنا پڑتے تھے۔

چھ کھلاڑیوں کی اس میز پر ذرا دیر کے لیے سکوت طاری ہوگیا تھا۔ سب ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ دولاکھ کی چال چلنے والا کھلاڑی سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"بیا تو میرا جیتا ہوا ہے۔" شہزاد نے احتشام کی طرف دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو پھر ایک ہی صورت ہے۔" احتشام نے جواب دیا۔ "جمال خان سے دولاکھ روپے قرض لے لو لیکن تم یہاں میرے ذریعے متعارف ہوئے ہو اس لیے مجھے ہی تمہاری ضمانت دینا ہوگی۔"

"تو پھر؟" شہزاد نے اسے پرامید نظروں سے دیکھا۔

"پریشان کیوں ہوتے ہو یار!" احتشام مسکرایا "کیا تم سمجھ رہے ہو کہ میں تمہاری ضمانت نہیں دوں گا؟ میں خود تو جمال خان سے قرض لے نہیں سکتا۔ یہاں کا قاعدہ ہے کہ کسی بھی کھلاڑی کو صرف ایک مرتبہ قرض ملتا ہے لیکن اسے یہ رعایت ضرور حاصل رہتی ہے کہ وہ کسی ایک اور کھلاڑی کی ضمانت دے دے۔ اگر تمہیں اپنی جیت کا یقین ہے تو میں جمال خان کو بلواتا ہوں۔"

"بلواؤ!" شہزاد نے کچھ سکون محسوس کیا۔ اسے اپنی جیت کا یقین تھا۔

احتشام خان نے جمال خان کو بلوا کر اس سے بات کی۔ جمال خان نے ٹائپ کیے ہوئے کاغذ پر شہزاد کے دستخط لیے۔ ضمانتی کی حیثیت سے احتشام نے دستخط کیے اور شہزاد کو دو لاکھ مل گئے۔

شہزاد نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے مدمقابل کی طرف دیکھا "آپ خوش قسمت ہیں۔ اگر اس وقت میرے پاس زیادہ رقم ہوتی تو آپ لٹ جاتے۔ چلیے، شو کیجیے!" شہزاد نے ایک ایک لاکھ کی دو گڈیاں میز پر ڈال دیں۔

"خوش قسمت تو آپ ہیں کہ آپ کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی۔" مدقابل نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اپنے پتے میز پر کھول دیے۔

وہ تین اکے تھے!

شہزاد کو ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا ہو۔

"کیا ہے تمہارے پاس؟" احتشام کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"بادشاہ!" شہزاد کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

"بادشاہ؟ یعنی بادشاہوں کی ٹریل!"

شہزاد نے کوئی جواب دیے بغیر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس کا نشہ تو خاصی حد تک ہرن ہو گیا تھا۔

احتشام نے ہاتھ بڑھا کر اس کے پتے کھول دیے۔ وہ تین بادشاہ تھے۔

اکے والا میز پر پڑی ہوئی رقم سمیٹنے لگا۔

"اچھا دوستو!" احتشام نے ایک طویل سانس لے کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا "ہم دونوں تو اب چلتے ہیں۔ آج میں بھی بہت جلدی ہار چکا ہوں۔" اس نے شہزاد کا بازو پکڑا "چلو یار! یہ سب کچھ تو اس کھیل کا ایک لازمی حصہ ہے۔ آج میرے بھی بہت بڑے بڑے پتے پٹے ہیں۔"

شہزاد اٹھا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی پنڈلیاں بے جان سی ہو رہی تھیں۔ جب وہ احتشام کے ساتھ چلا تو اس کے قدموں میں ڈگمگاہٹ تھی جس کا سبب شراب کا اثر ہرگز نہیں تھا۔

کار میں بیٹھنے کے بعد احتشام بولا "اب خود کو سنبھالو یار۔ ابھی سائرہ خان کی طرف بھی چلنا ہے۔"

"میں دو لاکھ کا قرض کیسے ادا کروں گا؟" شہزاد اپنا ہونٹ کاٹنے لگا۔

"اتنی پریشانی کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنا قرض تو اتارنا ہی ہے۔ اس کے ساتھ تمہارا قرض بھی اتار دوں گا لیکن اب تمہیں قسم کھا لینا چاہیے کہ آج کے بعد اتنا بڑا جوا نہیں کھیلو گے؟"

"میں اب جوا کھیلوں گا ہی نہیں۔" شہزاد کی آواز اس کے حلق میں پھنسنے لگی۔ "اگر تم جیت کی توقع رکھے بغیر جوا نہیں کھیل سکتے تو بہتر یہی ہے کہ اب کبھی نہ کھیلنا۔ جوے میں وہی لوگ برباد ہو جاتے ہیں جو ہار کا پہلو سامنے نہیں رکھتے۔ خیر چھوڑو۔ اس وقت تمہیں میری یہ باتیں اچھی نہیں لگیں گی۔ اب اپنا موڈ ٹھیک کرلو۔ ہم سائرہ خان کی طرف چل رہے ہیں۔"

"ایک منی ایچر تو دو۔"

"تم پہلے ہی تین پیگ پی چکے ہو۔"

"میرا نشہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے اس ہار کا بہت اثر لیا ہے۔"

"وہ کوئی چھوٹی ہار تو نہیں تھی۔"

احتشام نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر کسی خیال سے خاموش ہو گیا۔

شہزاد نے اس سے ایک منی ایچر اور سافٹ ڈرنک کا ایک ٹن لیا۔

"دوپہر کو تم سے فون پر بات ہوئی تھی تو تم نے بتایا تھا کہ غزل کہہ رہے ہو جو آج سائرہ خان کو سناؤ گے۔" احتشام بولا۔

"ہاں، پانچ چھ شعر کہے تو ہیں لیکن موڈ خوش گوار نہیں رہا۔"

"یہ ایک پی لو گے تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

لیکن احتشام کا یہ اندازہ درست نہیں تھا۔ وہ تھوڑی سی شراب شہزاد کے ذہنی دباؤ کو بالکل ختم نہیں

کر سکی۔ وہ جیتی ہوئی ساری رقم تو ہارا ہی تھا' اپنے پچاس ہزار بھی ہار گیا تھا اور دو لاکھ کا قرض الگ!

احتشام اس کا قرض ادا کر دیتا اور شاید کبھی اس سے تقاضا بھی نہ کرتا لیکن شہزاد اس کا دباؤ تو محسوس کرتا رہتا۔ پھر یہ پریشانی بھی تھی کہ وہ اپنا جمع جتھا بھی ہار گیا تھا۔ اب اس کے پاس صرف دس ہزار روپے تھے جو زندگی کی کسی بھی غیر معمولی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی ہوتے۔

احتشام نے ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں کار روکی تو شہزاد بولا "یار! یہاں بھی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پی تو جا سکتی ہے۔"

"تو کیا اور؟"

"پلیز احتشام! میں چاہتا ہوں کہ سائرہ خان کے سامنے زیادہ پریشان نہ رہوں۔ ایک اور پی لوں گا تو مزید سنبھل جاؤں گا۔"

احتشام ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

کار میں سافٹ ڈرنک کا ایک ٹن اور تھا۔ شہزاد نے اسے ٹن میں انڈیلا اور بڑے بڑے گھونٹ لینے لگا۔

"بس پندرہ منٹ!" اس نے کہا "میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ ابھی ویسے بھی پونے دس بجے ہیں۔ سائرہ خان کا پروگرام گیارہ بجے تک رہتا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اطمینان سے پی لو۔"

لیکن شہزاد نے پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگائے۔

پھر وہ دونوں کار سے اترے۔ جب وہ لان میں پہنچے تو سائرہ خان نے ایک گیت ختم کیا ہی تھا۔ اس کی نظریں شہزاد سے ملیں تو اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

احتشام ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ زیر لب بڑبڑایا۔ "تم یہاں اپنے خاصے رقیب پیدا کر لو گے۔"

شہزاد نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ایک میز پر جا بیٹھے۔

کھانے سے فارغ ہونے میں انہیں پون گھنٹا لگا۔ پھر وہ بیٹھے سائرہ خان کا گانا سنتے رہے۔

گیارہ بج کر پانچ منٹ پر سائرہ خان ان کی میز پر تھی۔

"میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ یہاں آنے کا وعدہ نہیں بھولے!" وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ وہ شہزاد ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"آج ہی انہوں نے ایک غزل بھی کہی ہے۔" احتشام نے اسے بتایا۔

"واہ!" سائرہ خان نے اس طرح کہا جیسے بہت خوش ہو گئی ہو۔ پھر اس نے پر اشتیاق لہجے میں غزل سنانے کی فرمائش کی۔

شہزاد نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ اس نے چھ شعر کہے تھے۔ سائرہ خان نے ہر شعر پر کھل کر داد دی۔ غزل ختم کرنے کے بعد شہزاد نے کاغذ سائرہ خان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ آپ کی نذر ہے۔"

"شکریہ!" سائرہ خان بولی "میں زیادہ سے زیادہ پرسوں تک اس کی دھن بنا لوں گی لیکن ہوٹل میں گانے سے پہلے آپ کو سناؤں گی۔ جمعے کو آپ غریب خانے پر جلدی آئیے گا۔"

"آٹھ بجے کی بات طے تو ہو چکی ہے۔" احتشام بولا۔

"میں نے یوں ہی بس یاد دہانی کرا دی۔"

"کیا بات ہے؟" احتشام نے پوچھا "آپ دو تین مرتبہ اردگرد کا جائزہ لے چکی ہیں۔"

"ہاں" سائرہ خان نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "یہاں کچھ لوگ ہیں۔ جنہیں آپ لوگوں کے ساتھ میرا بیٹھنا بہت گراں گزر رہا ہے۔"

"یہ تو ہے کہ میں نے آپ کو کبھی کسی کی میز پر بیٹھتے نہیں دیکھا۔"

"میں بہت ریزرو رہتی ہوں۔ یہ تو شہزاد صاحب کی شاعری کی کشش بھی تھی کہ میں کھنچی چلی آئی۔ جی چاہتا ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ زیادہ وقت گزاروں' شہزاد صاحب سے ان کا کلام سنوں لیکن یہ مناسب نہیں ہے کہ میں زیادہ دیر بیٹھوں۔ لوگوں میں خواہ مخواہ چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں گی۔ کل بھی میں اسی لیے جلدی اٹھ گئی تھی۔"

"چلیں' جمعے کو طویل نشست ہو جائے گی۔" احتشام نے ہنس کر کہا۔

"مجھے بڑی بے چینی سے جمعے کا انتظار رہے گا۔" سائرہ خان نے کہا پھر شہزاد کی طرف دیکھ کر بولی۔ "آج آپ کچھ چپ چپ سے ہیں۔"

"نہیں تو۔" شہزاد نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن حقیقت یہی تھی۔ وہ دو منی ایچر پی کر بھی ذہنی دباؤ سے پوری طرح نہیں نکل سکا تھا۔

"تو کوئی پرانی غزل سنائیے!" سائرہ خان نے فرمائش کی، پھر اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھ کر بولی "میں بس دس منٹ اور بیٹھوں گی۔"

شہزاد نے اسے اپنی ایک پرانی غزل سنائی۔

دس منٹ بعد سائرہ خان چلی گئی۔ اس کے پانچ منٹ بعد شہزاد اور احتشام بھی وہاں سے اٹھ گئے۔

کار تیز رفتاری سے فراٹے بھر رہی تھی اور شہزاد اپنے خیالوں میں گم تھا۔

"تمہارا موڈ کس طرح ٹھیک ہو گا یار!" احتشام بولا "یہ میری غلطی تھی کہ تمہیں جمال خان کے گھر لے گیا اور تمہیں اس چکر میں پھنسا دیا۔"

"میں بچہ تو نہیں ہوں کہ مجھے کوئی کسی چکر میں پھنسا دے۔ تم تو مجھے سمجھاتے رہے تھے، میں ہی پاگل ہو گیا تھا۔" شہزاد نے کہا "آج شاید مجھے نیند بھی نہ آسکے۔ اگر تم مجھے دو منی ایچر دے دو تو اچھا ہے۔ گھر جا کے پیوں گا۔"

"گھر جا کے۔"

"ہاں۔"

"لیکن تمہاری بیوی.....؟"

"اسے چھوڑو یار! میں بھگت لوں گا۔"

"تم مجھے پھر حیران کر رہے ہو۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ فرزانہ سے تمہاری شادی محبت کا نتیجہ تھی۔"

"پہلے میرا یہی خیال تھا۔" شہزاد نے سنجیدگی سے کہا "لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ اس عمر میں کسی لڑکی سے زیادہ دوستی ہو جائے تو آدمی جذباتی ہو جاتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ اسے اس لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔"

"تو اب تمہیں اس سے محبت نہیں؟"

"محبت تو ہے لیکن بس اتنی ہی جتنی کسی شوہر کو اپنی بیوی سے ہونا چاہیے۔"

احتشام چپ ہو گیا۔ شہزاد بھی خاموشی اختیار کیے رہا۔ کار جب اس کی بلڈنگ کے نیچے جا کر رکی تو احتشام نے دو منی ایچر نکال کر شہزاد کی طرف بڑھا دیے۔

"شکریہ!" شہزاد نے اتنا ہی کہا اور کار سے اتر گیا۔

"اپنا بریف کیس تو لے جاؤ۔" احتشام بولا۔

"اوہ!" شہزاد بھول ہی گیا تھا۔

احتشام نے پچھلی نشست سے بریف کیس اٹھا کر اسے دیا۔

بریف کیس میں دس ہزار روپے بھی تھے جو شہزاد کی آخری جمع پونجی تھی۔

اوپر پہنچ کر شہزاد نے اپنے فلیٹ کی کال بیل کا بٹن دبایا تو فرزانہ ہی دروازہ کھولنے آئی۔ اماں بیگم تو اس وقت تک سو جایا کرتی تھیں لیکن فرزانہ اس کے انتظار میں جاگی رہتی تھی۔

دروازہ کھول کر اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شہزاد کا استقبال کیا۔ شہزاد بھی جبراً اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لایا اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کی یہ حرکت خلاف معمول تھی۔ اسے یہ معلوم تو تھا کہ اماں بیگم اس وقت سو جاتی تھیں لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی وہ اماں بیگم کے بارے میں کوئی سوال ضرور کرتا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر فرزانہ بولی "آج تم کچھ الجھے ہوئے سے نظر آ رہے ہو؟"

"ہے کچھ بات" شہزاد نے ٹالنے والے انداز میں کہا "مجھے ایک گلاس پانی دے دو۔" وہ جوتے اتارنے کے بعد ٹائی ڈھیلی کر رہا تھا۔

فرزانہ خاموشی سے لوٹ گئی۔ فریج لاؤنج میں تھا۔ وہاں سے وہ گلاس میں پانی لے کر لوٹی۔ شہزاد نے دو گھونٹ لے کر گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھا اور منی ایچر کھول کر گلاس میں انڈیل دیا۔ فرزانہ نے دوسرا منی ایچر سائڈ ٹیبل پر رکھا دیکھا۔

"یہ کیا!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"وہسکی ہے" شہزاد نے جواب دیا۔ "شراب!"

فرزانہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہ آہستگی سے بستر پر بیٹھ گئی۔

شہزاد نے ٹائی گلے سے اتار دی تھی۔ کوٹ اتار کر اس نے وہ بھی بستر پر ڈالا اور گلاس منہ سے لگالیا۔

فرزانہ بستر سے اٹھی۔ کوٹ اور ٹائی اٹھا کر وہ وارڈ روب کی طرف گئی۔ جب وہ پلٹی تو شہزاد گلاس رکھ کر اپنی قمیص' پتلون سے باہر نکالنے لگا تھا۔ پھر بستر پر نیم دراز ہو کر اس نے گلاس دوبارہ اٹھایا۔

"کپڑے تو تبدیل کرلیتے!" فرزانہ آہستہ سے بولی۔

"کرلوں گا" شہزاد نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔

فرزانہ بستر پر بیٹھی اور پھر تکیے کا سہارا لے کر اس طرح بیٹھی کہ دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کو حصار میں لے لیا۔

شہزاد خاموشی سے ایک ایک گھونٹ لیتا رہا۔

دس منٹ کی خاموشی کے بعد فرزانہ آہستہ سے بولی "کل بھی تم پی کر ہی گھر آئے تھے۔ میں نے بو محسوس کرلی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ تم سے کیا کہوں لیکن آج تم گھر آکر پینے بیٹھ گئے ہو تو میں کہہ رہی ہوں کہ اماں بیگم کو پتا چل گیا تو انہیں بہت صدمہ ہوگا!"

"کیسے پتا چل جائے گا!" شہزاد نے اسے گھور کر دیکھا۔ "تم بتاؤ گی' تبھی پتا چلے گا نا!" "میں تو نہیں بتاؤں گی لیکن اب تم نے گھر میں بھی پینا شروع کیا ہے تو بات بڑھتی ہی رہے گی اور ایسی باتیں کسی سے زیادہ عرصے تک پوشیدہ نہیں رہتیں۔"

"تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"میری فکر مندی کی ایک وجہ اور بھی ہے۔"

فرزانہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کررہی تھی "میں ان لڑکیوں میں سے تو بہرحال نہیں ہوں جو شراب نوشی کو سخت ناپسند کرتی ہیں لیکن میرا یہ خیال ضرور ہے کہ اس قسم کے شوق انہی لوگوں کے لیے ٹھیک رہتے ہیں جو دولت مند ہوں۔"

"بور نہ کرو فرزانہ! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔"

"آخر ایسی کیا پریشانی ہے کہ...."

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا" شہزاد نے اس کی بات کاٹی "باہر کی پریشانیاں گھر میں لانا مجھے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔"

"میں تمہاری بیوی ہوں شہزاد! مجھے تمہاری ہر پریشانی سے باخبر رہنا چاہیے تاکہ آنے والی کسی بھی ناپسندیدہ صورت حال کے لیے میں ذہنی طور پر آمادہ رہوں۔"

"ایسی کوئی ناپسندیدہ صورت حال نہیں آئے گی" شہزاد نے منہ بنایا۔

"کیا تم آج کے بعد نہیں پیو گے؟"

"میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔"

"تب تو ہمارے گھر کا ماحول خراب ہوکر ہی رہے گا۔ تم یہ اخراجات برداشت نہیں کرسکتے۔"

"میں نے کبھی اپنی جیب سے نہیں پی۔"

"یہ اندازہ تو میں نے لگالیا ہے کہ یہ شوق تمہیں اپنے نئے دوست کی وجہ سے ہوا ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ اس قسم کے دوست ساری زندگی شراب نہیں پلاسکتے۔ جب تم عادی ہوجاؤ گے تو تمہیں اپنے پیسے سے بھی پینا پڑے گی۔"

"اگر میں اپنے پیسے سے بھی پیوں گا تو تم سے مطلب؟" شہزاد کا لہجہ بہت تیز تھا۔

"مجھ سے مطلب کیوں نہیں ہوگا؟ میں تمہاری بیوی ہوں شہزاد!"

"بیوی کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ شوہر کا دماغ کھائے!" شہزاد نے جھنجلا کر کہا اور گلاس کی باقی ماندہ شراب ایک ہی سانس میں پی گیا۔

"شہزاد!" فرزانہ کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو بھی تیرنے لگے "کبھی تم کہا کرتے تھے کہ شادی کے بعد ہم ایک مثالی جوڑا ہوں گے جن کی زندگی میں کبھی کوئی جھگڑا تو کیا' تلخ کلامی بھی نہیں ہوگی!"

"شادی سے پہلے اس قسم کی جذباتی باتیں ہوا ہی

جاتی ہیں جن کی بنیاد ٹھوس نہیں ہوتی، عملی زندگی میں یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔"

"تو پھر شاید اب یہ تلخ کلامی بڑھتی رہے گی!"

"اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں تمہیں کسی معاملے میں نہ ٹوکوں!"

"ہاں۔ میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔" جھٹکے کے ساتھ بستر سے اٹھا۔ سائڈ ٹیبل سے اس نے خالی گلاس اٹھایا۔ فرزانہ سے پانی کے لیے کہنے کے بجائے وہ خود لاؤنج میں گیا اور گلاس میں پانی لے آیا۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے منی ایچر کھول کر گلاس میں انڈیل لیا۔

☆ ☆ ☆

شہزاد پیتا رہا۔

فرزانہ نے گھٹنے موڑے موڑے دوسری طرف کروٹ لے لی تھی۔ اس کی آنکھوں سے گرنے والے آنسو تکیے میں جذب ہوتے رہے۔ اسے شہزاد کی شراب نوشی سے زیادہ اس کے رویے سے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرنے کے دوران میں بھی اسے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ شہزاد کبھی اس کے ساتھ اس طرح بھی پیش آسکتا ہے۔

فرزانہ کو نہ جانے کیوں یقین تھا کہ شہزاد کو کسی قسم کی پریشانی لاحق نہیں تھی اور اسے شراب کی طرف احتشام نے مائل کیا تھا۔

احتشام سے شہزاد کی دوستی عارفین کو بھی پسند نہیں آئی تھی اور وہ اس معاملے میں شہزاد سے جھگڑا تک کر بیٹھا تھا لیکن اس وقت فرزانہ نے شہزاد سے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے یہ حوالہ دینا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ عارفین کو بھی احتشام سے شہزاد کی قربت نے اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

فرزانہ کو خوف تھا کہ اگر وہ عارفین کا حوالہ دیتی تو شہزاد اسے کچھ اور ہی معنی پہنانے لگتا۔ وہ بھولی نہیں تھی کہ شہزاد سے جھگڑے کے بعد جب عارفین گھر سے جانے لگا تھا اور اس نے عارفین کو روکنے کی کوشش کی تھی تو شہزاد نے بڑا خوف ناک جملہ کہا تھا۔

فرزانہ کے لیے یہ جملہ خوف ناک ہی تھا کہ وہ شہزاد کی بیوی تھی یا عارفین کی! اس کے خیال کے مطابق عارفین کے بارے میں اس کی کوئی بھی بات شہزاد کے دل میں شکوک و شبہات کا بیج بو سکتی تھی۔

اس خیال کے علاوہ فرزانہ کے دل میں ایک چور بھی تھا۔ وہ عارفین سے اس قسم کی محبت نہیں کرتی تھی جیسی محبت اسے شہزاد سے تھی لیکن یہ علم اسے ضرور تھا کہ عارفین اسے بڑی شدت سے چاہتا تھا۔ اتنی شدت سے کہ اس نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ باتوں کے دوران میں اس نے کئی مرتبہ اس کا اظہار بڑے سرسری سے انداز میں کیا تھا اور اس کی وجہ بھی نہیں بتائی تھی لیکن فرزانہ کو اس وجہ کا علم تھا۔

عارفین کی محبت کا علم اسے اپنی اور شہزاد کی شادی سے پہلے ہی ہو گیا تھا جو ایک اتفاقی بات تھی۔

عارفین اس وقت بھی ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا رہا کرتا تھا۔ کچھ عرصے پہلے اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے والد ایک ریٹائرڈ افسر تھے۔ ترکے میں انہوں نے عارفین کے لیے ایک خاصا بڑا بنگلا اور بینک میں ایک مناسب سی رقم چھوڑی تھی۔ عارفین کو اپنے والد کے انتقال کے بعد ملازمت نہیں کرنا پڑی تھی۔ اس نے بینک میں موجود رقم سے ایک چھوٹا سا فلیٹ خرید کر وہاں رہائش اختیار کر لی تھی اور بنگلا کرائے پر دے دیا تھا۔ کرائے کی رقم اتنی معقول تھی کہ عارفین کوئی ملازمت یا کوئی کام کیے بغیر متوسط درجے کی اچھی خاصی زندگی گزار سکتا تھا۔ یہ طریقہ اختیار کرنے کے باعث اس کے تعلیمی معمولات بھی متاثر نہیں ہوئے تھے۔

عارفین اور شہزاد کی دوستی بہت پرانی تھی۔ اسی لیے جب فرزانہ سے شہزاد کا معاشقہ چلا تو اس نے عارفین کو اپنا ہم راز بنا لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ فرزانہ سے ادھر ادھر ملاقاتیں کرنے کے بجائے اس کے لیے عارفین کے

فلیٹ کو ترجیح دے۔

دوستی عارفین اور فرزانہ کی بھی تھی اس لیے اس نے ابتدائی جھجک کے بعد اس کے فلیٹ میں شہزاد سے ملاقاتیں کرنا گوارا کرلیا تھا۔ ملاقات کے وقت سے عارفین کو قبل ازوقت آگاہ کردیا جاتا تھا اس لیے وہ اس وقت اپنے فلیٹ پر ہی ہوتا تھا۔ وہ چند منٹ تک ان دونوں سے ہنس بول کر باتیں کرتا رہتا اور پھر انہیں تنہا چھوڑ کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ وہاں وہ مصوری کا شوق پورا کیا کرتا تھا جس کی اس نے باقاعدہ تربیت حاصل ہیں کی تھی۔ خود ہی مشق کرتے کرتے وہ اچھی خاصی تصویریں بنانے لگا تھا۔

کچھ دن اسی طرح گزرے تھے، پھر ایک دن عارفین نے اپنے فلیٹ کی ایک چابی شہزاد کو دیتے ہوئے کہا تھا "کسی وقت ایسا ہوسکتا ہے کہ مجھے اچانک کسی ضروری کام سے جانا پڑ جائے لہٰذا ایک چابی تمہارے پاس رہے تو اچھا ہے۔ اس طرح مجھے یہ پریشانی نہیں رہے گی کہ تم دونوں کو آنا ہے۔"

شہزاد نے چابی رکھ لی۔ پھر جب اگلی ہی بار وہ اور فرزانہ عارفین کے فلیٹ پہنچے تو وہ موجود نہیں تھا۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ جب وہ دونوں وہاں پہنچتے تو عارفین غائب رہا۔

ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ اس دوران میں فرزانہ نے شہزاد پر اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ ان کی ملاقات کے وقت عارفین جان بوجھ کر اپنے فلیٹ سے غائب ہوجاتا ہے۔ شہزاد نے اس خیال کی تائید کی تھی اور مسکرا کر کہا تھا "وہ ہمارا بہت اچھا دوست ہے فرزانہ! وہ ہمیں تنہا تو چھوڑ دیتا تھا لیکن کیا ہمیں یہ احساس نہیں رہتا تھا کہ ہم تنہا نہیں ہیں.... یہی خیال عارفین کو آیا ہوگا لہٰذا اس نے ہمیں تھوڑے سے ذہنی دباؤ سے نجات دلا دی ہے۔ میں دوبارہ کہوں گا فرزانہ کہ وہ ہمارا بہت ہی اچھا دوست ہے۔"

لیکن فرزانہ کو اس کا اصل سبب کچھ دن بعد معلوم ہوا۔ وہ اتفاق تھا کہ ایک دن شہزاد کو یہ اندیشہ ہوا کہ وہ "طے شدہ" وقت پر فلیٹ نہیں پہنچ سکے گا۔ اس نے فلیٹ کی چابی فرزانہ کو دیتے ہوئے کہا تھا۔ "ممکن ہے کہ مجھے پندرہ بیس منٹ یا آدھے گھنٹے کی تاخیر ہوجائے۔ دراصل اماں بیگم نے مجھے ایک کام سونپ دیا ہے۔ اس کام کے لیے ایک سرکاری دفتر کا چکر لگانا پڑے گا۔ کام تو پانچ منٹ کا ہے لیکن سرکاری دفتروں کے کام نرالے ہی ہوتے ہیں۔ خواہ مخواہ دیر لگانے کی شاید عادت ہوتی ہے ان لوگوں کو۔"

"تو میں آدھے گھنٹے کی تاخیر سے پہنچ جاؤں گی۔" فرزانہ نے کہا تھا۔

"لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مجھے دیر نہ ہو، میں وقت پر ہی پہنچ جاؤں۔"

فرزانہ نے چاہا تھا کہ اس دن کی ملاقات منسوخ ہی کردی جائے لیکن شہزاد نہیں مانا اور تھوڑی سی ردوقدح کے بعد فرزانہ کو فلیٹ کی چابی لینا ہی پڑی۔

مقررہ وقت پر جب وہ عارفین کے فلیٹ پہنچی تو معمول کے مطابق عارفین موجود نہیں تھا۔

فلیٹ میں دو ہی کمرے تھے۔ نشست کے کمرے کو عارفین اپنا مصوری کا شوق پورا کرنے کے لیے بھی استعمال کیا کرتا تھا۔ جو کمرا اس کی شب بسری کے لیے تھا، عارفین اور شہزاد اسی کمرے میں بیٹھا کرتے تھے۔

اس دن پہلا موقع تھا جب فرزانہ کو وہاں بیٹھ کر شہزاد کا انتظار کرنا پڑا۔ دس منٹ گزر گئے اور اسے اکتاہٹ ہونے لگی تو اس نے سوچا کہ کوئی کتاب پڑھ کر وقت گزارا جائے۔

عارفین کے سرہانے ایک شیلف میں مختلف موضوعات کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ فرزانہ شیلف کے سامنے بیٹھ کر کتابوں کے عنوانات دیکھنے لگی۔ اتفاق سے کوئی عنوان بھی اسے پسند نہیں آیا لیکن وقت گزاری کے خیال سے اس نے ایک کتاب نکال ہی لی۔

کتاب نکالی تو اس نے دیکھا کہ کتابوں کی سامنے کی رو کے پیچھے بھی کتابوں کی رو لگی ہوئی تھی۔

فرزانہ نے سوچا کہ شاید پیچھے کی رو میں اسے اپنی

پسند کی کوئی کتاب مل جائے۔ یہ سوچ کر اس نے سامنے کی رو کی ساری کتابیں نکال کر ایک طرف رکھ دیں۔

پچھلی رو کی کتابوں کے بیچ میں گتے کا ایک ڈبا بھی پھنسا ہوا تھا۔ فرزانہ کو جس کتاب کا عنوان پسند آیا وہ ڈبے کے برابر میں رکھی تھی۔ فرزانہ نے وہ کتاب نکالنے کی کوشش کی تو وہ ڈبا بھی پھسل کر نہ صرف باہر آیا بلکہ کھل کر گر پڑا۔

ڈبے میں کچھ کاغذات تھے جو کلپ کر کے رکھے گئے تھے۔

فرزانہ نے وہ کاغذات ڈبے میں رکھنا چاہے تو چونک پڑی۔ کلپ کسے ہوئے کاغذات میں سب سے اوپر ایک خط تھا۔

چوری چھپے کسی کے خط پڑھنا فرزانہ غیر اخلاقی حرکت سمجھتی تھی لیکن یہ دیکھ کر اس کا جسم سنسنا گیا تھا کہ وہ خط اسی کے نام تھے۔ وہ اسے پڑھنے پر مجبور ہو گئی۔ اس میں لکھا تھا۔

"فرزانہ! اپنے دل کی بات بہت عرصے تک اپنے دل میں رہنے کے بعد آج میں تمہیں یہ خط لکھنے بیٹھ ہی گیا ہوں لیکن جس طرح میں بہت عرصے تک تم سے کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا' اسی طرح آج لکھنے بیٹھا تو بہت دیر تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ ابتدا کیسے کروں۔ میری سمجھ میں اب بھی نہیں آرہا ہے کہ اپنے دل کی حالت کا اظہار کیسے کروں؟ شاید یہ میرے لیے بہت مشکل کام ہے جو مجھ سے نہیں ہو سکے گا لیکن میرا خیال ہے کہ ان چند سطروں سے بھی تم نے سمجھ لیا ہو گا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ یقین کرو کہ یہ آخری جملہ لکھنے کے بعد میں آدھے گھنٹے تک کچھ اور نہیں لکھ سکا۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میرے دل میں تمہارے لیے کس قسم کے جذبات کب اور کیسے پیدا ہوئے لیکن اب لکھنے بیٹھا ہوں تو مجھے احساس ہو رہا ہے کہ یہ سب تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ کب' کیا ہو گیا۔ بس اچانک ہی یہ احساس ہوا ہے کہ دنیا میں صرف تم ہی میرے لیے سب کچھ ہو۔ تمہارے بغیر میں ادھورا ہوں۔ تم میری تکمیل کا سبب بن سکتی ہو لیکن مجھے یہ خوف بھی ہے کہ میرے دل میں تمہارے لیے جو جذبات ہیں' وہی جذبات تمہارے دل میں شاید کسی اور کے لیے ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو میں اسے اپنی بدقسمتی ہی سمجھوں گا۔ تم سے میری التجا ہے کہ میری ان باتوں کا برا نہ ماننا۔ ہم بہت اچھے دوست تھے اور آئندہ بھی رہیں گے۔ تم کسی اور کو اپنی زندگی کا شریک بناؤ گی تو وہ بھی مجھے اتنا ہی عزیز رہے گا جتنی عزیز مجھے تم ہو۔ میں اصرار نہیں کروں گا کہ میرے اس خط کا جواب ہر صورت میں دو۔ جب تم جواب نہیں دو گی تو میں سمجھ لوں گا کہ تمہارے دل میں کوئی اور بسا ہوا ہے یا یہ کہ تمہارے دل میں میرے لیے اس قسم کے جذبات پیدا ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوا تو میری ان باتوں کو میری دیوانگی سمجھ کر نظرانداز کر دینا' یہ خط پھاڑ کر پھینک دینا۔ مجھے کوئی جواب بھی نہ دینا لیکن مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ میں دوبارہ کہوں گا کہ ہم ایک دوسرے کے دوست تو ہمیشہ رہ سکتے ہیں نا۔ بس' اب میں کچھ اور نہیں لکھوں گا۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ میں کیا لکھوں۔ میں واضح طور پر وہ سب کچھ نہیں لکھ سکا جو میرے دل میں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم نے سب کچھ سمجھ لیا ہو گا۔ اب میں قلم رکھتا ہوں' فقط ایک پاگل' عارفین۔"

وہ خط پڑھ کر فرزانہ ذرا دیر تک مجسمے کی طرح ساکت بیٹھی رہی تھی۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ خط پر جو تاریخ پڑی ہوئی تھی' وہ اس دن سے ایک ہفتے پہلے کی تھی جب اس نے شہزاد سے عارفین کے فلیٹ پر ملنا شروع کیا تھا۔

گم صم کیفیت میں فرزانہ نے وہ خط پلٹا تو اسے عارفین کی ایک اور تحریر دکھائی دی۔ فرزانہ وہ بھی پڑھنے لگی۔ اس تحریر میں عارفین کا ہیجان صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"میرے گھر کی دیوارو...! میرے کئی دن بڑی وحشت میں گزرے ہیں۔ میرا جی چاہنے لگا ہے کہ تم سے باتیں کروں۔ کسی اور سے میں یہ باتیں کر بھی

نہیں سکتا۔ میں اپنی جذبات کو ارزاں کیوں کروں۔ تو پھر میں اپنے گھر کی دیواروں ہی سے تو بات کر سکتا ہوں لیکن اگر میں تنہائی میں تم سے باتیں کروں گا تو مجھے اپنی دیوانگی کا احساس ہونے لگے گا۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ اپنے جذبات کا اظہار لکھ کر کیا جائے لیکن دیواروں کو خط لکھنا بھی تو دیوانگی ہی ہے' ہے نا؟ لیکن میں کیا کروں' میں اپنے جذبات کا اظہار کیسے کروں۔ اگر میں اپنے جذبات دباتا رہا تو مجھے ڈر ہے کہ میری دیوانگی بہت بڑھ جائے گی۔ شاید اتنی بڑھ جائے گی کہ لوگ مجھے پاگل خانے ہی پہنچادیں گے اس لیے بہتر ہوگا کہ میں اپنے جذبات کا اظہار لکھ کر ہی کرتا رہوں۔

اے دیوارو۔۔۔۔! تم تو ازل سے ناقابل شمار رازوں کا مدفن ہو۔ تم نے کبھی کسی کا راز افشاں نہیں کیا۔ اسی لیے تمہیں اپنا ہم راز بنانے میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ میں ایک راندہ محبت ہوں۔ مجھے محبت ہوئی بھی تو ایک ایسی لڑکی سے جس نے پہلے ہی اپنے دل میں کسی کو بسا رکھا تھا۔ میرے دل میں اس کی محبت خاصے عرصے تک پرورش پاتی رہی۔ اس سے اظہار محبت کرتے ہوئے میں ہمیشہ ہچکچاتا رہا لیکن مجھے اپنے دل کی بات اس تک پہنچانا تو تھی۔ میں نے اسے خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔ خط لکھنے بیٹھا تو میرے دماغ نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں الفاظ کی دھار سے اپنا دل چیر کر اس کے سامنے رکھ دینا چاہتا تھا لیکن میرے دماغ نے مجھے وہ الفاظ نہیں دیے۔ میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح نہ کر سکا جس طرح کرنا چاہتا تھا۔ تاہم میں نے اتنا کچھ لکھ دیا تھا کہ وہ میرے دل کی بات سمجھ جائے۔

دوسرے دن میں کسی طرح اسے وہ خط دینا چاہتا تھا لیکن اسی دن قدرت ستم ظریفی پر اتر آئی۔ میرے دوست شہزاد نے مجھے اپنا ہم راز بنالیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اور فرزانہ ایک دوسرے کو شدت سے چاہتے ہیں۔

اے دیوارو۔۔۔! مجھ پر اس وقت ایک قیامت گزر گئی۔ ہاں! فرزانہ ہی تو وہ لڑکی ہے جس سے مجھے محبت ہے۔ کوئی میری اس وقت کی حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتا جب مجھے معلوم ہوا کہ فرزانہ تو میرے دوست شہزاد سے محبت کرتی ہے۔ میں نے اسے خط لکھتے ہوئے اس اندیشے کا اظہار تو کیا تھا کہ شاید اس نے اپنے دل میں کسی اور کو بسا رکھا ہو لیکن جب یہ اندیشہ ایک سفاک حقیقت کی صورت میں میرے سامنے آیا تو میرا دل تڑپتا رہ گیا۔ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں اپنا خط فرزانہ کو دیتا۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ میرے دل کی بات فرزانہ تک نہیں پہنچ سکی۔ اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں وہ خط پھاڑ کر پھینک دیتا لیکن میں ایسا کر نہیں سکا۔ وہ خط میرے پاس محفوظ ہے۔ نہ جانے کیوں میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے پاس ہمیشہ محفوظ رہے۔

میرا دوست شہزاد چاہتا ہے کہ وہ اور فرزانہ ادھر ادھر جا کر کہیں ملنے کے بجائے میرے فلیٹ میں آکر ملاقات کر لیا کریں۔

یہ میرے لیے ایک بہت ہی کڑا امتحان ہے۔ فرزانہ' جس سے مجھے محبت ہے' وہ میرے ہی فلیٹ میں آکر شہزاد سے محبت کی باتیں کیا کرے گی لیکن مجھے اس امتحان میں پورا تو اترنا ہے۔ آخر شہزاد میرا دوست ہے اور میں نے خط میں فرزانہ سے بھی تو کہا تھا کہ اگر وہ کسی اور کو اپنا شریک زندگی بنائے گی تو وہ بھی مجھے اتنا ہی عزیز رہے گا جتنی عزیز مجھے فرزانہ ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہوئی کہ شہزاد تو مجھے ہمیشہ ہی سے عزیز ہے۔ ہاں البتہ اب وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔ آخر وہ میری فرزانہ کا محبوب ہے۔ میرے دل میں اس کے لیے رقابت کی آگ نہیں بھڑکی۔ میری دلی خواہش تو اب یہ ہے کہ وہ اور فرزانہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کی محبت میں سرشار رہیں' ہمیشہ مسکراتے رہیں' ہمیشہ خوش رہیں۔ میں اپنے دل کے ویرانے ہی میں فرزانہ کی پرستش کرتے ہوئے زندگی گزار دوں گا۔ میں اب شادی نہیں کروں گا۔ میں کسی لڑکی سے بے وفائی نہیں کرنا چاہتا۔ کسی بھی لڑکی سے شادی کر کے میں بے وفائی ہی کا ارتکاب کروں گا کیونکہ میرے دل میں تو ہمیشہ فرزانہ ہی کی محبت رہے

گی۔"

یہ سب کچھ پڑھتے ہوئے فرزانہ کی سانسیں بہت تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ وہ صفحات الٹتی رہی' تیزی سے پڑھتی رہی۔ وہ تحریریں مختلف تاریخوں میں لکھی گئی تھیں۔ یہ عارفین کی دیوانگی ہی تھی کہ ان تحریروں میں دیواروں کو مخاطب کیا گیا تھا۔

ایک جگہ عارفین نے لکھا تھا "ان دونوں کو میرے گھر میں آتے ہوئے خاصے دن گزر چکے ہیں۔ میں چند منٹ ان سے ہنس بول کر انہیں تنہا چھوڑ دیتا ہوں۔ ان سے میں یہ بہانہ کرتا ہوں کہ اپنا کچھ وقت مصوری کرنے میں گزاروں گا لیکن اے دیوارو.....! تم گواہ ہو کہ میں ایسا نہیں کرتا۔ میں تو دوسرے کمرے میں جا کر بس ٹہلتا رہتا ہوں' ایک کرب میں گرفتار رہتا ہوں اور خود کو ملامت بھی کرتا رہتا ہوں کہ آخر میں اس کرب میں کیوں گرفتار ہوں۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کیونکہ وہ خوش ہے جس سے مجھے محبت ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ فرزانہ سے میری محبت جھوٹی ہے یا یہ جھوٹ ہے کہ میں کرب میں گرفتار رہتا ہوں۔ دونوں میں سے کوئی ایک بات جھوٹ ہونا چاہیے۔ میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ ان میں سے کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ یا شاید دونوں ہی سچ ہیں۔ ایسے سچ جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں یا شاید میں انہیں متضاد سمجھنے کی غلطی کر رہا ہوں۔"

ایک اور جگہ عارفین نے لکھا تھا "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل اپنے فلیٹ کی ایک چابی شہزاد کو دے دوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب وہ دونوں آئیں تو میں یہاں موجود نہ رہوں۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو وہ کرب شاید مجھے پاگل کر دے جو ان دونوں کی موجودگی میں مجھے اپنے شکنجے میں لیتا ہے۔"

فرزانہ بہت تیزی سے وہ تحریریں پڑھتی رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ شہزاد آجاتا' وہ عارفین کی سب تحریریں پڑھ لینا چاہتی تھی لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ کال بیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے جلدی سے وہ تحریریں ڈبے میں رکھیں اور اسے کتابوں کے بیچ میں پھنسا کر وہ کتابیں بھی شیلف میں رکھ دیں جو اس نے شیلف سے نکال لی تھیں۔

جب اس نے فلیٹ کا دروازہ کھولا تو اس کے دل کی دھڑکنیں بہت تیز تھیں لیکن وہ چاہتی تھی کہ اس کی اندرونی کیفیت کا اظہار اس کے چہرے سے نہ ہو جائے۔ نہ جانے کیوں وہ شہزاد کو عارفین کی محبت سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ دونوں دوستوں میں جھگڑا نہ ہو جائے۔ اس نے تحریروں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ عارفین ضبط و تحمل کی ایک مضبوط چٹان تھا اور یہ قطعی ضروری نہیں تھا کہ شہزاد بھی ایسا ہی ہوتا۔ لوگوں کے مزاج یکساں نہیں ہوتے۔

اس دن کے بعد شہزاد سے ملنے کے لیے عارفین کے فلیٹ کا رخ کرنا فرزانہ کے لیے ایک امتحان بن گیا تھا۔ وہ اب شہزاد سے کہیں اور ملنا چاہتی تھی لیکن شہزاد کو یہ بتانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اب وہ اس سے عارفین کے فلیٹ پر کیوں نہیں ملنا چاہتی تھی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا رہا۔ عارفین سے ملتے ہوئے فرزانہ کو کبھی یہ احساس نہیں ہو سکا کہ اس کا وہ گرفتار محبت کتنے کرب میں مبتلا تھا۔ وہ فرزانہ سے ہمیشہ اسی طرح ہنستا بولتا رہا جیسا کہ اس کا معمول رہا تھا۔

فرزانہ اس کی تحریروں سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ ان تحریروں میں اسے عارفین بہت مضبوط کردار کا مالک اور مضبوط قوت ارادی کا مالک نظر آیا تھا لیکن اس تاثر کی وجہ سے یہ بات بہر حال ممکن نہیں تھی کہ اس کے دل سے شہزاد کی محبت ختم ہو جاتی اور شہزاد کی جگہ عارفین لے لیتا۔

پھر وہ دن بھی آیا جب شہزاد اور فرزانہ کی شادی ہوئی۔ فرزانہ نے اس دن بھی عارفین کو خوش و خرم اور مسکراتا ہوا دیکھا لیکن اسے اندازہ تھا کہ خوشی کے اس اظہار اور اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کے لیے عارفین کرب کے کتنے طوفانوں سے سر ٹکراتا ہو گا۔

شہزاد کی شادی سے پہلے بھی عارفین اس کے گھر آیا کرتا تھا اور شادی کے بعد بھی اس کے معمول میں تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن اس دن وہ شہزاد سے جھگڑا کر بیٹھا جب اسے اپنے دوست کی بربادی نظر آئی یا اس لڑکی کی بربادی دکھائی دی جس کی محبت اب بھی اس کے جسم و جاں کا حصہ تھی۔

عارفین اور شہزاد کی محبت کا تقابل کرتی ہوئی فرزانہ بہت دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ شہزاد ان آنسوؤں سے بے خبر، شراب پینے کے بعد آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا تھا۔

فرزانہ کو اس رات، بہت دیر سے نیند آئی۔

✡ ✡ ✡

دوسرے دن شہزاد خاصا پریشان ہو گیا جب دفتر میں احتشام کا فون آیا۔ اس نے اصرار کیا تھا کہ شہزاد کسی طرح بھی دفتر سے چھٹی لے کر اس سے ملنے ایک ریسٹورنٹ میں پہنچے۔

شہزاد نے اچانک طبیعت خراب ہو جانے کا بہانہ کر کے دفتر سے چھٹی لی اور گیارہ بجے اسی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں احتشام نے اسے بلایا تھا۔

"تمہارے سان و گمان میں بھی نہیں آسکتا کہ آج مجھ پر کیا بیت گئی ہے۔" احتشام نے چھوٹتے ہی کہا۔

شہزاد کی پریشانی بڑھ گئی۔ وہ دیکھ بھی رہا تھا کہ احتشام کی حرکات و سکنات مضطربانہ تھیں۔ وہ سگریٹ کے کش پر کش لگا رہا تھا۔

"کچھ بتاؤ تو؟" شہزاد بولا۔

"کل جب میں نے جمال خان سے قرض لیا تھا تو مجھے معلوم تھا کہ میرے اکاؤنٹ میں پونے دو لاکھ روپے پڑے ہوئے ہیں اور جب میں نے تمہیں قرض دلوایا تھا تو سوچا تھا کہ جمال خان کو دو لاکھ روپے کی ادائیگی کرنے کے لیے مجھے ڈیڈی سے پیسے لینا ہوں گے، یہ میرے لیے ایک معمول کی بات ہوتی۔ جب بھی مجھے دو چار لاکھ کی ضرورت پڑی، میں ڈیڈی سے مانگتا رہا ہوں۔ آج صبح میں دفتر جانے سے پہلے ہی ان سے رقم مانگنا چاہتا تھا۔ ناشتے کی میز پر میں نے ان کا موڈ خراب دیکھا۔ اس کا سبب میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ بس ایک یوں ہی سا خیال یہ آیا کہ ممی سے کوئی بات ہو گئی ہوگی۔ میں نے سوچا کہ اس وقت ان سے بات کرنے کے بجائے دفتر پہنچ کر بات کرلوں گا لیکن ناشتا ختم کرنے کے بعد ڈیڈی مجھ پر برس پڑے۔ میں اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ انہیں میرے جوا کھیلنے اور شراب نوشی کا علم کیسے ہوا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں فوری طور پر ان کے گھر سے نکل جاؤں۔ ان کے خیال کے مطابق میں سال چھ مہینے ٹھوکریں کھانے کے بعد ہی اپنے طور طریق بدل سکوں گا۔ میں نے معافی مانگ کر اور ہر طرح سے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ ممی نے میری حمایت میں کچھ بولنا چاہا تو ڈیڈی نے انہیں بھی ڈانٹ دیا۔ مختصر یہ کہ مجھے اسی وقت گھر چھوڑنا پڑا۔ ڈیڈی نے کار کی چابی بھی مجھ سے لے لی تھی۔ مجھے گھر سے نکل کر اپنے ایک دوست کے پاس جانے کے لیے ٹیکسی کرنا پڑی تھی۔"

شہزاد یہ سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا تھا اور اس کی پریشانی بڑھتی رہی تھی کہ اب وہ جمال خان کا قرض کس طرح ادا کرے گا۔

احتشام نے اپنی بات جاری رکھی۔ "دوست سے میں نے اس کی کار مانگی اور پھر سیدھا بینک پہنچا۔ مجھے یہ فکر نہیں تھی اور نہ ہے کہ اب میرے مستقبل کا کیا ہو گا۔ مجھے اندازہ ہے کہ ڈیڈی کا غصہ جلد ہی ٹھنڈا ہو جائے گا، ممی بھی انہیں منالیں گی۔ میں کچھ دن بعد گھر لوٹ ہی جاؤں گا لیکن فوری طور پر مجھے جمال خان کی فکر تھی۔ وہ قرض کے معاملے میں بہت سخت آدمی ہے۔ وہ قرض دیتا بھی انہی لوگوں کو ہے جن کے بارے میں اسے یقین ہوتا ہے کہ ان کے پاس بینک میں اتنی رقم یا اس سے زیادہ رقم موجود ہوگی۔ اس کا قرض دوسرے دن بینک آورز ختم ہونے سے پہلے ہی واپس کرنا پڑتا ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں وہ دو ایک شہدے قسم کے آدمیوں کو پیچھے لگا دیتا ہے جو آدمی کی

سرعام بے عزتی کردیتے ہیں۔ پولیس سے اپنے تعلقات کی وجہ سے اسے کسی بات کا ڈر نہیں ہوتا۔ اسی لیے میں نے سب سے پہلے بینک جاکر ڈیڑھ لاکھ روپے نکلوائے تھے اور جمال خان کے گھر جاکر اسے دیے تھے۔"

"اس نے میرے بارے میں تو ضرور پوچھا ہوگا!" شہزاد کے لہجے میں تشویش تھی۔

"قدرتی بات ہے۔" احتشام نے کہا "میں نے اس سے بہانہ بنا دیا ہے کہ آج اچانک تمہاری طبیعت خراب ہوگئی ہے اس لیے آج تم بینک نہیں جاسکے ہو۔ میرے اس جواب سے اس کا موڈ کچھ خراب ہوگیا تھا لیکن چونکہ میں اس سے لین دین کے معاملے میں ہمیشہ صاف رہا ہوں اس لیے اس نے مجھ سے بہت زیادہ سخت بات تو نہیں کی لیکن اتنا ضرور کہا کہ وہ مزید چوبیس گھنٹے سے زیادہ انتظار بہرحال نہیں کرے گا۔"

"اگر وہ غنڈا گردی پر اتر آیا تو میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا احتشام!" شہزاد کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

احتشام ختم ہوتی ہوئی سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگانے لگا۔ اس نے فوری طور پر جواب نہیں دیا تھا کیونکہ ویٹر چائے لے کر آگیا تھا۔

"میں بھی بہت پریشان ہوگیا ہوں شہزاد!" احتشام نے ویٹر کے جانے کے بعد کہا "اور میں اپنے لیے نہیں، تمہارے لیے ہی پریشان ہوں۔ کچھ دن میں ڈیڈی کا غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا اور میں گھر لوٹ جاؤں گا لیکن جمال خان کا معاملہ ایسا ہے کہ اسے فوری طور پر نمٹانے کی ضرورت ہے۔ وہ تمہارے پیچھے تو پڑے گا ہی لیکن میں تمہارا ضمانتی ہوں۔ وہ میرے پیچھے بھی لگے گا۔ یہ بات ڈیڈی تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ اس سے ان کا غصہ اور بڑھے گا۔ جمال خان کے غنڈے گھر تک پہنچ جاتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہا۔" شہزاد بڑبڑایا "میرا تو کوئی ایسا دوست بھی نہیں ہے جس سے میں قرض لے سکوں۔"

"اور میرے ساتھ یہ مشکل ہے کہ میں کسی سے قرض مانگ نہیں سکتا۔ سبھی جانتے ہیں کہ میں ایک ایسے باپ کا بیٹا ہوں جس کے لیے دو چار لاکھ کی کوئی اہمیت نہیں ہونا چاہیے اور یہ مناسب نہیں کہ میں کسی کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرسکوں۔ آج میں نے جس دوست سے کار لی ہے، اس سے یہ بہانہ کیا ہے کہ میری کار میں اچانک کوئی خرابی ہوگئی ہے جو دو ایک دن میں ٹھیک ہوجائے گی ابھی مجھے یہ بھی سوچنا ہے کہ دو ایک دن بعد کیا کروں گا؟ اپنے دوست کی کار تو مجھے واپس کرنا پڑے گی نا!"

شہزاد کا دماغ چکراتا رہا۔ اس کا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ احتشام کن مشکلات سے دوچار ہوگا۔ اسے صرف یہ فکر تھی کہ جمال خان کے غنڈے اگر اس کے گھر یا دفتر پہنچے تو وہ اس صورت حال کا سامنا کس طرح کرسکے گا!

احتشام چائے بناتا ہوا کچھ سوچنے لگا تھا۔ چائے بنا کر ایک پیالی شہزاد کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا "اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

شہزاد استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

احتشام بولا "میرا خیال ہے کہ اس پریشان کن صورت حال سے نکلنے کے لیے تمہارے سامنے ایک راستہ ہے۔"

شہزاد اب بھی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"سائرہ خان" احتشام نے زور دے کر کہا۔

"کیا مطلب؟" شہزاد چونکا۔

"وہ تم پر بہت بری طرح مرمٹی ہے۔ تمہیں شاید اندازہ نہ ہو لیکن میرا خیال ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے لیے کچھ بھی کرسکتی ہے۔ تمہارا دیوان چھپوانے کے لیے تو وہ تیار ہے ہی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس سے بہت آگے تک جاسکتی ہے۔ تم اس سے بات کرکے تو دیکھو۔"

شہزاد نے پہلو بدلا "تمہارا مطلب ہے کہ میں اس سے دو لاکھ روپے مانگوں؟"

"ہاں" احتشام نے کہا "قدرت نے تمہیں اس

مشکل میں پھنسانے سے پہلے اس مشکل سے نکلنے کا راستہ بھی بتادیا ہے۔"

"اس سے کچھ کہنا میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہیں اس سے کچھ کہنا نہیں پڑے گا۔" احتشام نے جواب دیا "رات کا کھانا ہم ہوٹل ہی میں کھائیں گے۔ پروگرام ختم کرکے وہ ہماری میز پر ضرور آئے گی۔"

"تم اس سے کیا کہو گے؟" شہزاد نے بے چینی سے پوچھا۔

"کم از کم یہ نہیں کہوں گا کہ وہ تمہاری مدد کرے۔"

"پھر کیا کہو گے!"

"میں نے کہا نا کہ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" احتشام نے کہا "بات سے بات نکلتی رہے گی اور میں اسی مناسبت سے کچھ کہوں گا۔"

"مجھے ایسا نہیں لگتا کہ وہ جھٹ سے دو لاکھ روپے دینے کے لیے تیار ہوجائے۔"

"وہ بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے شہزاد! دو لاکھ روپے اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔"

"معنی نہ رکھتے ہوں لیکن اسے یہ خیال آسکتا ہے کہ میں اسے بے وقوف بنانا تو نہیں چاہتا۔"

"یہ خیال اسے اس وقت آسکتا ہے جب اس سے دو لاکھ روپیا مانگا جائے۔ تم دیکھنا تو سہی کہ میں کتنی چابک دستی سے بات کرتا ہوں۔ چلو اب جلدی سے چائے پی لو! مجھے ایک جگہ جانا ہے۔"

احتشام چائے پی چکا تھا۔ شہزاد نے دو گھونٹ لے کر پیالی ایک طرف سرکادی۔ "بس۔ اس وقت چائے کو جی بھی نہیں چاہ رہا ہے۔"

احتشام نے اصرار نہیں کیا۔

بل کی ادائیگی کے بعد وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکلے۔

"یہ کار لی ہے میں نے اپنے دوست سے۔" احتشام نے ایک کار کی طرف اشارہ کیا۔

شہزاد نے کار پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی، کچھ بولا نہیں۔

"رات کو ساڑھے نو بجے میں تمہیں لینے آؤں گا۔" احتشام بولا۔

احتشام کار کی طرف بڑھ گیا۔ شہزاد نے اپنی موٹر سائیکل سنبھال لی۔

جب وہ گھر پہنچا تو فرزانہ نے اس کی طرف کچھ تعجب سے دیکھا لیکن فوری طور پر کچھ نہیں بولی۔ جب وہ کپڑے تبدیل کرکے لیٹ گیا تھا تو اس نے کہا۔

"آج تم دفتر سے بہت جلدی آگئے؟"

شہزاد نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

فرزانہ نے چند لمحے رک کر کہا "تمہارے لیے کسی جمال خان کا فون آیا تھا۔"

شہزاد چونک کر سیدھا ہوگیا "کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہ کچھ عجیب ہی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جب میں نے بتایا کہ تم دفتر گئے ہوئے ہو تو وہ طنزیہ سے انداز میں ہنس کر بولا کہ بیمار ہوتے ہوئے دفتر جانا فرض شناسی کی بہت اچھی مثال ہے۔ اتنا کہہ کر اس نے فون بند کردیا تھا۔"

شہزاد پریشان ہوگیا کہ جمال خان پر احتشام کا جھوٹ کھل گیا۔ اس نے فرزانہ سے بات بنانے کی کوشش کی "وہ میرا ایک شناسا ہے۔ اسے کچھ کام ہے مجھ سے۔ آج صبح میں نے محسوس کیا تھا کہ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ میں نے اسے فون کردیا تھا کہ آج اس سے ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ میں ایک ضروری کام کی وجہ سے دفتر گیا تھا لیکن پیٹ کی گرانی نے بے چین کیا تو میں چھٹی لے کر آگیا۔"

"کیا کھالیا تھا کل رات؟" فرزانہ نے پر تشویش لہجے میں پوچھا "کچھ دن سے تم رات کا کھانا اکثر باہر ہی کھارہے ہو۔"

"کبھی کبھی کچھ ہوجاتا ہے یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں نے دوا لے لی ہے۔ ٹھیک ہوجاؤں گا۔"

شہزاد نے جواب دیا اور لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔

کچھ دیر بعد جب فرزانہ کمرے میں نہیں تھی تو شہزاد نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور احتشام کے موبائل فون پر رابطہ کیا۔ اس نے احتشام کو جمال خان

کے فون کے بارے میں بتایا۔

"ہاں۔" جواب میں احتشام نے کہا "اس نے مجھے بھی فون کیا تھا۔ میں نے بات بتا دی کہ تمہارا دفتر جانا بہت ضروری تھا لیکن اب تم دفتر سے چھٹی لے کر واپس گھر پہنچ چکے ہو۔ ابھی میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔ اگر جمال خان دوبارہ فون کرے تو اسے یہی جواب دے دینا' جلد از جلد اس کا معاملہ نمٹانا ہی ہو گا۔ میں رات کو تمہیں لینے آؤں گا۔ بھولنا نہیں۔"

"اچھا۔" شہزاد نے گم صم انداز میں کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

✡ ✡ ✡

رات کو احتشام اور شہزاد دس بجے سے پہلے ہی ہوٹل میں پہنچ گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ باتیں کرتے رہے۔ موضوع جمال خان ہی تھا۔

سائرہ خان پروگرام ختم کر کے ان کی میز پر آئی۔ اس نے ملاقات کے ابتدائی رسمی جملوں کے بعد کہا "شہزاد صاحب! پروگرام کے دوران میں آج میں نے جب بھی آپ کی طرف دیکھا' مجھے محسوس ہوا کہ آپ پریشان ہیں۔ یہ بات میں نے کل بھی محسوس کی تھی اور کہا بھی تھا۔"

شہزاد نے کوئی بات بنانے کے لیے منہ کھولا لیکن احتشام اس سے پہلے ہی بول پڑا "اپنی پریشانی کی وجہ سے یہ آج یہاں آ بھی نہیں رہے تھے۔ میں بڑی مشکل سے لایا ہوں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟ مجھے بتائیے! شاید میں کسی کام آسکوں۔"

"دراصل۔۔۔"

"پلیز احتشام!" شہزاد نے اسے بولنے سے روکنا۔

"میں آپ سے التجا کروں گی شہزاد صاحب کہ انہیں بولنے دیجیے۔ اگر مجھے آپ کی پریشانی کا سبب معلوم نہیں ہوا تو میں بھی پریشان رہوں گی۔ شاید آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ مجھے آپ سے کتنی عقیدت ہے۔"

"ہاں شہزاد۔" احتشام بولا "یہ اتنی اپنائیت سے بات کر رہی ہیں تو انہیں بتانے میں آخر حرج کیا ہے؟"

شہزاد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ احتشام سائرہ خان سے کیا کہے گا۔

"آپ بتائیے احتشام صاحب!" سائرہ خان نے اصرار کیا اور پھر شہزاد کی طرف دیکھ کر بولی "اگر آپ نے دوبارہ انہیں روکنے کی کوشش کی تو میں سمجھوں گی کہ آپ کی نظر میں میری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔"

"غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے۔" احتشام بولا "اور پھر میں تو اسے غلطی بھی نہیں سمجھتا۔ بس اتفاق تھا ایک۔"

"آپ کچھ بتائیے تو۔" سائرہ خان نے اس طرح کہا جیسے اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا ہو۔

"میں بتا رہا ہوں آپ کو۔" احتشام نے کہا "یہ تو آپ جانتی ہی ہوں گی کہ فلیش کھیلنے کا تھوڑا بہت شوق سبھی کو ہوتا ہے۔ اگر اسے غلطی کہا جا سکتا ہے تو یہ میری غلطی تھی کہ میں شہزاد کو اپنے ساتھ جمال خان کے گھر لے جانے لگا۔ کل ایسا ہوا کہ یہ کچھ زیادہ پی گئے۔ ویسے ان کے پاس پتا بھی بہت بڑا تھا۔ وہ بازی اتنی بڑھ گئی کہ ان میں شو لینے کی سکت بھی نہ رہی۔"

احتشام نے سارا واقعہ بتا دیا اور یہ بتانے سے بھی گریز نہیں کیا کہ اس کے والد اچانک اس سے ناراض ہو گئے تھے ورنہ وہ جمال خان کو دو لاکھ روپے آسانی سے دے سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جمال خان اپنے قرض داروں سے کس طرح پیش آتا تھا۔

شہزاد اس دوران میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"یہ واقعی شہزاد صاحب کے لیے خاصی پریشانی کی بات ہے۔" سائرہ خان نے سنجیدگی سے کہا "لیکن میں ان کی یہ پریشانی بہت آسانی سے ختم کر سکتی ہوں۔ دو لاکھ روپیا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں بڑی آسانی سے ادا کر سکتی ہوں لیکن بہتر یہ ہو گا کہ جمال خان کا دماغ درست کروایا جائے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ وہ شرفا سے اس طرح پیش آئے۔"

احتشام نے ٹھنڈی سانس لی "لیکن یہ ہمارے بس

کی بات نہیں ہے۔"

"میرے بس کی بات تو ہے۔" سائرہ خان نے زور دے کر کہا "میں آج ہی اس کا دماغ درست کروا دوں گی۔ آپ مجھے اس کا فون نمبر دیجئے۔"

"فون نمبر تو میں آپ کو دیے دیتا ہوں۔" اختشام نے کہا "لیکن آپ کریں گی کیا؟"

"آپ نے موسیقی کے حوالے سے پرویز شاہ صاحب کا نام سنا ہے؟"

"میں نے تو نہیں سنا۔ تم نے سنا ہے شہزاد؟"

شہزاد نے نفی میں سر ہلایا۔

سائرہ خان بولی "ان کی شہرت واقعی نہیں ہے۔ آج کل صرف ان ہی فنکاروں کو شہرت ملتی ہے جو میڈیا والوں کی خوشامد کرنے کا فن جانتے ہیں۔ پرویز شاہ صاحب اس قسم کے آدمی نہیں۔ وہ موسیقی کے عالم اور عامل انسان ہیں۔ ان کا تعلق موسیقی کے کسی گھرانے سے نہیں ہے۔ انہیں دیکھ کر یہ اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا کہ ان کا تعلق اس شعبے سے ہوگا مگر انہوں نے اپنی ساری زندگی اسی شوق کی نذر کردی۔ اس کی خاطر ساری دنیا کو تج دیا' شادی بھی نہیں کی۔ اپنے گھر والوں اور سبھی عزیزوں کو چھوڑ دیا لیکن موسیقی سے ناتا نہیں توڑا۔ میں نے موسیقی کی تعلیم ان ہی سے حاصل کی ہے۔ اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے ان کی زندگی بڑی کسمپرسی میں گزر رہی تھی۔ میں انہیں بہت اصرار کرکے' بڑی خوشامد سے اپنے گھر لائی تھی۔ وہ ایک سال سے میرے ساتھ رہ رہے ہیں۔ اپنے اخراجات کے لیے مجھ سے کچھ نہیں لیتے۔ آسودہ حال گھرانوں کے دو ایک ٹیوشن ہیں ان کے پاس۔ یہ سب کچھ میں اس لیے بتا رہی ہوں کہ ایسے قلندر قسم کے لوگ اگر کسی کے کام آسکتے ہیں تو کبھی دریغ نہیں کرتے۔"

"آپ کا خیال ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہمارے کسی کام آسکتے ہیں؟" اختشام نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" سائرہ خان نے جواب دیا "وہ ایک ایسی لڑکی کو گانا سکھاتے ہیں جس کے والد پولیس میں ایک بڑے منصب پر فائز ہیں۔ وہ شاہ صاحب کی عزت بھی بہت کرتے ہیں۔ شاہ صاحب انہیں ایک فون کردیں گے تو وہ جمال خان کا دماغ درست کردیں گے۔"

"اگر ایسا ہوجائے تو بڑا اچھا ہے۔" اختشام نے جلدی سے کہا۔

"آپ دونوں ابھی میرے گھر آجائیں۔ میں آپ کے سامنے ہی شاہ صاحب کو سب کچھ بتاؤں گی۔ وہ فون بھی آپ کے سامنے ہی کریں گے۔ اس کا جو نتیجہ نکلے گا' وہ اسی وقت آپ کے سامنے آجائے گا۔"

"میرے لیے تو اس وقت آپ کے گھر آنا مشکل ہوگا۔" اختشام نے سوچتے ہوئے کہا "میرے موبائل فون پر ممی نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں بارہ سوا بارہ بجے گھر آؤں۔ والد صاحب اس وقت سوچکے ہوں گے۔ ممی مجھے کچھ سمجھانا چاہتی ہیں۔ شہزاد! تم چلے جاؤ ان کے گھر۔"

"میں۔۔ اکیلا؟" شہزاد کے لہجے میں تذبذب تھا۔

"اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔" سائرہ خان بول پڑی۔

"ایسا کرتا ہوں۔" اختشام نے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں تمہیں ان کے گھر چھوڑتا ہوا چلا جاؤں گا' البتہ اتنی رات کو واپسی پر تمہیں دقت ہوسکتی ہے۔"

"کوئی دقت نہیں ہوگی۔" سائرہ خان پھر بول پڑی "میں اپنی کار میں انہیں ان کے گھر چھوڑ آؤں گی۔"

"تب پھر کوئی مضائقہ ہی نہیں۔"

شہزاد کو کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں ملا اور سب کچھ طے ہوگیا۔ سائرہ خان یہ کہہ کر چلی گئی کہ وہ دونوں وہاں سے دس منٹ بعد اٹھیں۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ دونوں اس کے ساتھ ہی وہاں سے گئے تو دیکھنے والوں کی نگاہیں زیادہ معنی خیز ہوجائیں گی۔

سائرہ خان کے جانے کے بعد اختشام نے ایک طویل سانس لے کر کہا "مجھے یقین ہے کہ اب اس معاملے میں تمہاری پریشانی ختم ہوجائے گی۔"

شہزاد بڑبڑایا۔ "کیا یہ ممکن ہوگا کہ جمال خان اپنی

جیب سے نکلے ہوئے دو لاکھ روپے بھول جائے۔"

"سائرہ خان نے اتنا کچھ کہا ہے تو کسی بنیاد پر ہی کہا ہوگا۔ تم اس کے گھر جاؤ تو سہی۔"

"تم بھی ساتھ چلتے تو اچھا تھا۔"

"میں اپنی مجبوری بتا چکا ہوں۔"

"مجھے اپنے گھر لوٹنے میں خاصی دیر بھی ہو جائے گی۔"

"اتنا بڑا بوجھ تو سر سے اتر جائے گا۔ اگر جمال خان کا دماغ درست نہیں کیا جاسکا تو کل ہی اس کے بدمعاش تمہیں کہیں نہ کہیں گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ تمہارے گھر یا دفتر کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

شہزاد پریشانی کے عالم میں چپ رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں وہاں سے اٹھے۔ احتشام نے اسے سائرہ خان کے اپارٹمنٹ کے دروازے تک پہنچایا۔ دروازہ خود سائرہ خان نے کھولا تھا۔ احتشام اس سے اجازت لے کر رخصت ہوگیا۔ وہ شہزاد کو اندر لے گئی۔ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بولی "میں ابھی شاہ صاحب کو لے کر آتی ہوں۔ وہ ساڑھے بارہ بجے سے پہلے سونے کے لیے نہیں لوٹتے اور ابھی بارہ بجنے میں بھی پانچ منٹ باقی ہیں۔"

سائرہ خان چلی گئی تو شہزاد ڈرائنگ روم پر نظریں دوڑانے لگا۔ اپارٹمنٹ کی مناسبت سے وہ خاصا کشادہ کمرا تھا جسے نہایت خوب صورت اور قیمتی ساز و سامان سے سجایا گیا تھا۔

ذرا دیر بعد سائرہ خان لوٹی تو اس کے ساتھ ایک معمر شخص تھا جس کی وضع قطع سے واقعی یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ اس کا تعلق فن موسیقی سے ہوگا۔ وہ کوئی ریٹائرڈ اسکول ٹیچر معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر خاصے قدیم فیشن کی عینک تھی۔

شہزاد احتراماً کھڑا ہوگیا۔ سائرہ خان نے ان کا تعارف کرایا "یہ پرویز شاہ صاحب ہیں، میرے استاد...! اور شاہ صاحب! یہ میرے دوست شہزاد صاحب ہیں جو بہت اچھے شاعر ہیں۔ میں نے آپ کو ان کی غزل سنائی تھی۔"

پھر بیٹھنے کے بعد سائرہ خان نے پرویز شاہ کو شہزاد کی پریشانی سے آگاہ کرنے کے لیے سب کچھ تفصیل سے بیان کر ڈالا اور اپنا مدعا بتانے کے بعد پرویز شاہ کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے استاد کے احترام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتی ہو۔

پرویز شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی، پھر بولا "بعض اوقات یہ قماربازی انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ خیر! تم کہتی ہو تو میں فون کیے دیتا ہوں۔ جمال خان کی گوشمالی تو ہو جائے گی۔ اسے شرفا کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے لیکن سائرہ، یہ کوئی مناسب بات بہرحال نہیں ہوگی کہ کسی کی رقم دبالی جائے۔"

"میں یہ نہیں چاہتی شاہ صاحب!" سائرہ خان نے جلدی سے کہا "جیسے ہی ممکن ہوگا جمال خان کو رقم لوٹا دی جائے گی۔ وہ بس فوری دباؤ ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔"

"یہ تو میرا خیال ہے کہ ہو جائے گا۔ مجھے فون دو۔"

سائرہ خان نے فوراً اپنا موبائل فون اسے دے دیا۔

شہزاد کا ذہن الجھنے لگا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ رقم کیونکہ قماربازی کے سلسلے میں تھی لہٰذا وہ اب اسے لوٹانا ہی نہیں پڑے گی لیکن جو صورت حال سامنے آئی تھی۔ وہ اس کی توقع کے خلاف تھی۔ قرض اسے لوٹانا ہی پڑتا جبکہ اسے مستقبل میں بھی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔ دو لاکھ اس کے لیے خاصی بڑی رقم تھی۔ وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ اسے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نظر نہیں آئی تھی۔

پرویز شاہ نے موبائل فون پر تین چار منٹ بات کی۔ سائرہ ان نے اسے جمال خان کا فون نمبر دے دیا تھا جو اس نے موبائل فون پر کسی کو بتا دیا۔ بات ختم کرنے کے بعد اس نے موبائل فون سائرہ خان کو لوٹاتے ہوئے کہا "وہ جمال خان سے بات کر کے دس منٹ کے اندر اندر مجھے بتائیں گے، لیکن میں اب جا کر سونے کی تیاری کرنا چاہتا ہوں۔ تم ان سے بات کر لینا۔"

"کہیں وہ برا نہ مانیں کہ آپ نے انتظار نہیں

کیا۔" سائرہ خان جلدی سے بولی۔

"نہیں۔" پرویز شاہ کھڑا ہو گیا۔ "وہ میرے مزاج سے واقف ہیں اور میری بہت عزت کرتے ہیں۔"

"بہتر ہے۔" وہ چپ ہو گئی۔

پرویز شاہ ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔

"آپ تو اب بھی پریشان نظر آرہے ہیں شہزاد صاحب!" سائرہ خان بولی۔

"نہیں تو۔" شہزاد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں سمجھ سکتی ہوں کیا بات ہے۔" سائرہ خان بھی مسکرائی۔ "آپ سوچ رہے ہوں گے کہ بعد میں بھی آپ قرض کس طرح ادا کریں گے۔ میں اصرار کرتی ہوں کہ آپ یہ فکر اپنے ذہن سے جھٹک دیں۔ ابھی واضح طور پر کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہو گا لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کو قرض کی ادائیگی نہیں کرنا پڑے گی۔"

شہزاد کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ یہ کیسے ممکن ہو گا لیکن وہ کوئی سوال نہیں کر سکا۔ سائرہ خان کہہ چکی تھی ابھی واضح طور پر کچھ کہنا اس کے لیے مشکل ہو گا۔

"آیئے!" سائرہ خان اچانک کھڑی ہو گئی۔

"آپ تکلیف نہ کیجئے۔ میں ٹیکسی ڈھونڈ لوں گا۔"

سائرہ خان ہنسی "میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑنے نہیں جا رہی ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ پہلی بار میرے گھر آئیں اور میں آپ کی ذرا بھی خاطر مدارات نہ کروں۔ ویسے بھی آپ کو ابھی تھوڑی دیر تو رکنا ہے۔ وہ فون تو آجائے جس کے بارے میں شاہ صاحب کہہ رہے ہیں۔"

"آپ بات کر لیجئے گا۔ میرا رکنا کیا ضروری ہے؟"

"آپ کا رکنا اس لیے ضروری ہے کہ میں آپ کی کچھ تواضع تو کروں گی۔ پلیز! آپ آیئے نا۔"

شہزاد بے بسی سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آسکا تھا کہ سائرہ خان اس کی خاطر تواضع کے لیے اسے ڈرائنگ روم سے کہاں لے جانا چاہتی تھی۔

سائرہ خان اسے ڈرائنگ روم سے متصل جس کمرے میں لے گئی، وہ بھی ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ڈرائنگ روم کے ساتھ ساتھ آرام گاہ بھی کہا جا سکتا تھا۔ ایک گوشے میں ایک خوب صورت بیڈ لگا ہوا تھا اور ایک ایسی شیلف بھی تھی جس میں شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ پیتے ہیں۔" سائرہ خان نے مسکراتے ہوئے کہا "اور رات کو کبھی کبھی میں بھی ایک ڈیڑھ پیگ لے لیتی ہوں۔ آپ کے ساتھ بیٹھ کر پینا تو میرے لیے باعث فخر ہو گا۔ دنیا نے آپ کی قدر نہیں کی لیکن میں جانتی ہوں کہ آپ کتنے بڑے شاعر ہیں۔ آج کل تو بس وہ لوگ بڑے شاعر بن جاتے ہیں جن کے پاس اپنے خوب صورت دیوان چھپوانے کے لیے دولت ہوتی ہے۔ آپ کے پاس دولت نہیں لیکن میں آپ کے فن کو لوگوں سے روشناس کراؤں گی۔ خیر، چھوڑیں۔ پہلے یہ بتائیں کہ آپ کون سا برانڈ پینا پسند کریں گے۔"

سائرہ خان نے شہزاد کی تعریف ایسے لب و لہجے میں کی تھی کہ وہ پیئے بغیر ہی ایک عجیب سا سرور محسوس کرنے لگا۔ کسی خوب صورت لڑکی سے اتنی تعریف سن کر اپنے آپے میں رہنا شہزاد کے لیے شاید مشکل ہی تھا۔

"میرا کوئی خاص برانڈ نہیں ہے۔" شہزاد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں کچھ بھی پی لوں گا۔"

"تو پھر میں وہی برانڈ نکال لیتی ہوں جو مجھے پسند ہے۔"

سائرہ خان نے دو خوب صورت گلاسوں میں پیگ بنائے۔ وہ سیب کی ایک پلیٹ بھی اٹھا لائی تھی۔ اسی وقت موبائل فون گنگنانے لگا۔ اس نے کال ریسیو کی "ہیلو!" پھر اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں "جی نہیں۔ وہ اس وقت مصروف ہیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے، مجھ سے کہہ دیجئے۔ جی۔ جی۔ شکر ہے۔ آپ کو احساس تو ہوا کہ شرفا سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔ خیر خیر! زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کا پیغام

پہنچادوں گی۔“

شہزاد غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ سائرہ خان نے موبائل فون بند کرتے ہوئے مسکرا کر کہا ”جمال خان کا فون تھا۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔“

”تو کرادیتیں۔“

”میں نے سوچا کہ اسے رعب میں ہی رکھا جائے اس لیے میں نے کہہ دیا کہ آپ مصروف ہیں۔ وہ گھگیا رہا تھا کہ آپ اسی سے بات کرلیتے تو اچھا تھا، ایک بڑے افسر سے اس کی شکایت کرنے کی ضرورت نہیں تھی، اس کے بقول آپ کو اس کے بارے میں کچھ غلط فہمی ہوگئی ہوگی۔ ورنہ وہ آپ جیسے شریف آدمی کے ساتھ تہذیب کے دائرے ہی میں رہتا۔“ سائرہ خان ہنسی ”جب جوتا پڑتا ہے تو اس قسم کے لوگ ایسی ہی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اب آپ اسے بالکل بھول جائیں۔ گلاس اٹھائیے۔“ سائرہ خان نے خود بھی گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا ”میرا یہ جام اس شاعر کے نام ہے جسے دنیا بہت جلد پہچان لے گی۔“

☼ ☼ ☼

پیگ ختم کرتے کرتے ساڑھے بارہ بج گئے۔ سائرہ خان نے اس کے لیے فوراً دوسرا پیگ بنایا اور بولی۔ ”میں پہلا پیگ ذرا آہستہ پیتی ہوں۔ یہ ختم کرلوں تو اپنے لیے بھی بناؤں گی۔ آج میں آپ کے ساتھ زیادہ پیوں گی۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ بیٹھ کر پینے کا موقع ملا ہے۔“

شہزاد کو اپنے گھر جانے کی فکر تو تھی لیکن سائرہ خان کے والہانہ انداز کی باعث وہ مزید پینے سے انکار نہیں کرسکا۔ اسے ایک پیگ پینے کے بعد دوسرا پیگ پینے کی خواہش بھی ہوگئی تھی۔

”ان صاحب کا فون نہیں آیا جنہوں نے جمال خان سے بات کی ہوگی۔“ شہزاد بولا۔

”انہوں نے ہی جمال خان سے کہا ہوگا کہ وہ خود آپ سے بات کرے۔ میرا موبائل فون نمبر انہوں نے ہی اسے دیا ہوگا اور انہیں یقین ہوگا کہ اس نے بات کرلی ہوگی۔ غالباً“ اسی لیے انہوں نے تصدیق کی ضرورت نہیں سمجھی۔“

شہزاد نے سرہلا کر دوسرا پیگ اٹھالیا۔

دوسرے پیگ کے بعد تیسرے پیگ کی باری بھی آئی۔ شہزاد کے دماغ سے اپنے گھر جانے کا خیال نکلتا چلا گیا تھا۔ شراب کے ساتھ ساتھ سائرہ خان کی باتیں اس کے سرور میں خاصا اضافہ کررہی تھیں۔ جب وہ تیسرا پیگ ختم کررہا تھا تو سائرہ خان دوسرا پیگ ختم کرچکی تھی۔ اس کے انداز گفتگو میں دھیرے دھیرے بے تکلفی آتی جارہی تھی۔ شہزاد کو محسوس ہونے لگا جیسے وہ دبے الفاظ میں یہ اظہار کردینا چاہتی تھی کہ اسے شہزاد سے محبت ہوگئی تھی۔

شہزاد کا جسم سنسنانے لگا۔ شراب کے ساتھ ایک لڑکی کا والہانہ انداز اسے بے خود کرتا چلا جارہا تھا۔ اپنی بیوی اور اپنے گھر کا خیال اس کے دماغ سے دھوئیں کی طرح اڑ چکا تھا۔

اور پھر سبھی کچھ جیسے دھوئیں ہی کی طرح اڑ گیا۔

جب ہوش و حواس بحال ہوئے اور شہزاد کی آنکھ کھلی تو چند لمحے تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ وہ کہاں تھا پھر جب دماغ نے دھیرے دھیرے کام کرنا شروع کیا تو وہ بوکھلا گیا۔ وہ اسی کمرے کے بستر پر تھا جہاں اس نے رات کو شراب پی تھی۔ کمرے میں بجلی کی روشنی کے باوجود وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ صبح ہوئے خاصی دیر ہوچکی تھی۔ کمرے کا دیوار گیر کلاک دس بجا رہا تھا اور وہ وقت رات کے دس بجے کا نہیں ہوسکتا تھا۔

لیکن شہزاد کی بوکھلاہٹ کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ صبح ہوچکی تھی۔ بوکھلاہٹ کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ بستر پر اس کے ساتھ سائرہ خان بھی تھی۔ شہزاد اپنی اور اس کی حالت سے یہ اندازہ بھی لگا سکتا تھا کہ ان دونوں نے رات کس طرح گزاری تھی۔

سائرہ خان کا چہرہ اداس اور سنجیدہ تھا۔ وہ شہزاد سے پہلے جاگ چکی تھی لیکن ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے چند لمحے پہلے ہی جاگی ہو۔

شہزاد بوکھلائے ہوئے انداز میں اٹھ کر بیٹھا تو سائرہ خان اس کی طرف دیکھتے ہوئے آبدیدہ ہوگئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "یہ آپ کیا کر بیٹھے شہزاد!"

"مجھے۔ مجھے کچھ۔۔۔ کچھ نہیں معلوم۔" شہزاد ہکلا گیا۔

"غلطی یقیناً" مجھ سے بھی ہوئی کہ میں نے آپ کو شراب پلانے کے لیے روک لیا۔" سائرہ خان کی آواز دھیمی ہو گئی۔ "چار پیگ پی کر آپ بہت زیادہ بہکنے لگے تھے۔ میں نے آپ کو پانچویں پیگ سے روکنے کی کوشش کی تھی تو آپ نے بوتل ہی منہ سے لگا کر دو بڑے گھونٹ لے لیے تھے۔"

"پھر؟" شہزاد اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"سب کچھ ٹھیک سے تو مجھے بھی یاد نہیں۔ کل میں نے پہلی مرتبہ شاید ڈھائی پیگ سے بھی زیادہ پی لی تھی۔ مجھے بھی اپنے ہاتھ پیروں پر قابو نہیں رہا تھا۔" سائرہ خان کھوئے کھوئے سے انداز میں بول رہی تھی "مجھے ایسا یاد پڑ رہا ہے کہ آپ مجھے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر بستر کی طرف لائے تھے۔ میں نے بہت کہا کہ یہ اچھا نہیں ہوگا لیکن آپ نے میری ایک نہیں سنی۔ آپ بس یہ بڑبڑاتے رہے کہ تم میری ہو سائرہ اور میں تمہارا ہوں۔ آپ کی اس حرکت سے میرے ہاتھ پیروں کی رہی سہی جان بھی نکل گئی تھی۔ میں آپ کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔" سائرہ خان نے نظریں جھکالیں "کامیابی آپ کو ہوئی۔" اس کے گالوں پر دو آنسو ڈھلک گئے۔

"مجھے تو۔ خدا کی قسم۔ میں۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔" شہزاد کی زبان سے بے ربط الفاظ نکلے۔

"میں جانتی ہوں۔" سائرہ خان نے سسکی لی "آپ کو بہت زیادہ نشہ ہو گیا تھا۔ اتنا نشہ ہونے کے بعد کسی کو بھی کچھ یاد نہیں رہتا۔"

"میں آپ سے۔ میں آپ سے۔ معافی چاہتا ہوں۔ مجھے۔ مجھے معاف کر دیجیے۔" شہزاد کو بولنے میں دقت محسوس ہوتی رہی۔

"غلطی تو میری بھی تھی۔ میں اس کا اعتراف کر چکی ہوں لیکن اس کے بعد ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔ ہماری شادی ہو جانا چاہیے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" شہزاد گڑبڑایا ہوا تھا۔

"اور یہ شادی آج ابھی ہونا چاہیے۔"

شہزاد اتنا گڑبڑایا ہوا تھا کہ ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کچھ سوچ بھی نہیں سکا۔

"آپ اپنا حلیہ درست کر لیجیے۔ میں اپنے کمرے سے ہو کر ابھی آتی ہوں۔" سائرہ خان اپنے چہرے سے آنسو صاف کرتی ہوئی اٹھی۔ اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا "وہ باتھ روم ہے۔"

پھر وہ کمرے سے چلی گئی۔

شہزاد کا دماغ ابھی تک ٹھیک سے کام کرنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ وہ گم صم انداز میں اٹھ کر باتھ روم میں گیا۔ اسی کیفیت میں اس نے منہ ہاتھ دھویا اور جس حد تک بھی ممکن تھا' اپنا حلیہ درست کر کے کمرے میں لوٹا۔ وہ اسی صوفے پر بیٹھ گیا تھا جہاں رات کو بیٹھ کر شراب پی تھی۔

تپائی پر شراب کی بوتل اور گلاس اب بھی موجود تھے۔ ایک گلاس میں شراب بچی ہوئی تھی۔ شہزاد کے اندازے کے مطابق وہ گلاس سائرہ خان کا تھا۔ شراب کی بوتل آدھی ہو چکی تھی۔ اس سے شہزاد کو یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ اس نے رات کو کتنی پی ڈالی تھی۔

دھیرے دھیرے وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتا جا رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ اس کے رات بھر غائب ہو جانے کی وجہ سے اس کی والدہ اور اس کی بیوی خاصی پریشان ہو گئی ہوں گی۔ اس کے ساتھ دماغ میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ وہ نشے میں جو کچھ کر بیٹھا تھا' اس کے نتیجے میں اب اسے شادی بھی کرنا تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید یہ اس کے حق میں بہت اچھا ثابت ہوگا۔ سائرہ خان اس سے محبت تو کرنے لگی تھی لیکن وہ سائرہ خان کی محبت سے زیادہ اس کی دولت میں کشش محسوس کر رہا تھا۔ یہ شادی اس کی زندگی بدل کر رکھ دیتی ورنہ ملازمت کرتے کرتے اس کی ساری زندگی گزر جاتی لیکن وہ اپنی زندگی میں ایسی آسودہ حالی نہ لا پاتا جو اسے

سائرہ خان سے شادی کر کے حاصل ہو جاتی۔

شہزاد کو ان سب باتوں کے ساتھ تھوڑی سی پریشانی یہ بھی تھی کہ اس شادی کی وجہ سے فرزانہ اس کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہ کر دے۔

وہ ان خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ سائرہ خان آگئی۔ وہ اپنے کمرے سے کپڑے تبدیل کر کے آئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا "میں نے احتشام صاحب کو فون کر دیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ وہ فوراً آئیں۔"

"نہیں آپ... میرا مطلب ہے۔ کیا آپ انہیں سب کچھ بتانا چاہتی ہیں؟"

"وہ آپ کے دوست ہیں اور میرا خیال ہے کہ اچھے آدمی ہیں۔ ہمیں اس وقت کسی کو رازدار تو بنانا ہی ہوگا تاکہ وہ ہماری شادی کا فوری بندوبست کر سکے۔"

"اتنی جلدی شادی ہو گی کیسے؟"

"شادی سے میری مراد دھوم دھام سے نہیں ہے بس خاموشی سے نکاح ہو جائے۔ احتشام صاحب ہی کو یہ بندوبست کرنا ہوگا۔ شاہ صاحب تو مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ ملازم کو تو اس طرف آنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی لیکن شاہ صاحب مجھے ڈھونڈتے ہوئے ادھر آنکلے تھے۔ اس وقت تک میں بھی نہیں جاگی تھی۔ شاہ صاحب خاموشی سے لوٹ گئے تھے۔ میں جب اس کمرے سے گئی تو وہ اپنا مختصر سا سامان سمیٹ کر اس گھر سے جانے ہی والے تھے۔ میں نے ان سے بہت معافی مانگی اور ان کے قدموں پر سر رکھ دیا تو وہ رکے ہیں لیکن اب بھی ان کے چہرے سے اتنی ناراضی ظاہر ہو رہی ہے کہ میں ان سے نکاح کا بندوبست کرنے کے لیے نہیں کہہ سکتی۔ وہ نکاح میں بس شریک ہو جائیں گے۔"

"میں اپنے گھر والوں کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ کیا انہیں فون کر دوں؟"

"کر دیجیے۔ کیا کہیے گا ان سے؟"

"فی الحال تو بس اتنا ہی کہوں گا کہ رات کو ایک دوست کے گھر رک گیا تھا اور ابھی گھر لوٹنے میں مزید کچھ وقت لگے گا۔"

سائرہ خان نے مزید کوئی سوال کیے بغیر موبائل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

✡ ✡ ✡

فرزانہ کی وہ رات بہت بے چینی میں گزری تھی۔ آدھی رات تک تو اس نے انتظار ہی کیا تھا لیکن ایک بجے کے بعد اس کی بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ گزرتی ہوئی رات کے ساتھ اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور پھر رات گزر گئی تھی۔ وہ سوتی تو کیا' پلکیں بھی نہیں جھپکا سکی تھی۔

صبح ہوئی تو اماں بیگم کو بھی شہزاد کی عدم موجودگی کا علم ہو گیا۔

"مجھے یہ ڈر تو تھا کہ بات بڑھتی ہی چلی جائے گی۔" اماں بیگم نے متفکر لہجے میں کہا "جب سے اس کی دوستی احتشام سے ہوئی ہے' اس کے لچھن بگڑتے جا رہے ہیں۔ وہ بہت سنبھل سنبھلا کر گھر آتا ہے لیکن مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے شراب پینا شروع کر دی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ تم بیوی ہو تم ہی اسے سنبھالنے کی کوشش کرو گی اس لیے میں چپ رہی تھی۔"

"وہ تو مجھ سے ناراض رہنے لگے تھے اماں بیگم!" فرزانہ کی آواز رندھ گئی۔

"یہ بھی تم نے مجھے نہیں بتایا۔"

"آپ بڑی ہیں اماں بیگم مجھے کوئی مشورہ دیجیے۔ آخر کس طرح معلوم کیا جائے کہ وہ کہاں ہیں۔"

"ہوگا کہیں اسی لفنگے احتشام کے ساتھ۔" اماں بیگم نے کچھ غصے سے کہا "پی کر لڑھک گیا ہوگا اسی کے ساتھ کہیں۔"

"مجھے احتشام کا فون نمبر معلوم ہے نہ اس کا پتا۔"

"دو تین روز سے عارفین بھی نہیں آیا۔ وہی ایک اچھا دوست ہے شہزاد کا۔ اگر مناسب سمجھو تو اسی کو فون کرو۔ وہ تمہارے ساتھ بھی پڑھ چکا ہے۔"

فرزانہ نے انہیں عارفین اور شہزاد کے جھگڑے سے بے خبر رکھا تھا۔

"کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" وہ بولی "معلوم تو ہو جائے کہ وہ خیریت سے ہیں۔"

"خیریت سے ہی ہو گا۔" اماں بیگم کچھ دل برداشتہ سی نظر آنے لگی تھیں۔

"میں عارفین کو فون کرتی ہوں۔" فرزانہ اٹھی۔

ان دونوں میں یہ گفتگو نشست کے کمرے میں ہوئی تھی۔ فرزانہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی۔ ٹیلی فون وہیں تھا۔ وہ ریسیور اٹھا کر عارفین کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس وقت اس کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ یہ احساس مٹ جانا ممکن ہی نہیں تھا کہ عارفین اس سے محبت کرتا تھا۔

دوسری طرف سے تین گھنٹیاں بجنے کی آوازیں آئیں، پھر ریسیور اٹھایا گیا اور عارفین کی غنودہ سی آواز سنائی دی۔ "ہیلو!" شاید وہ ٹیلی فون کی گھنٹیوں ہی سے جاگا تھا۔

"میں فرزانہ بول رہی ہوں۔" فرزانہ آہستہ سے بولی۔

"اوہ! ارے۔ اتنی صبح؟ خیریت ہے نا؟"

"شہزاد گھر سے غائب ہیں۔ رات کو گئے تھے، ابھی تک نہیں لوٹے۔"

"ارے!"

"میں بہت پریشان ہوں عارفین۔ کچھ پتا لگاؤ۔ کئی دن سے شام کے بعد احتشام انہیں لینے آرہا تھا۔ کل بھی وہ اسی کے ساتھ گئے تھے۔"

عارفین فوراً کچھ نہیں بولا۔ وہ کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"ہیلو۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں۔" عارفین نے ایک طویل سانس لی۔

"میں بہت پریشان ہوں عارفین۔"

"مجھے اندازہ ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ میں پتا لگانے کی کوشش کروں گا۔ جلد از جلد تمہیں فون کر کے بتاؤں گا۔"

"فون نہیں، گھر آ کے بتانا۔"

"لیکن۔۔۔"

"تمہارا جھگڑا شہزاد سے ہوا تھا، مجھ سے نہیں۔ آخر میں بھی تمہاری دوست ہوں اور یہ گھر میرا بھی ہے۔" فرزانہ جذباتی ہو گئی "اماں بیگم بھی تمہیں شہزاد ہی کی طرح بیٹا کہتی ہیں۔ اس گھر پر صرف شہزاد ہی کا حق نہیں ہے۔ میں بحث نہیں کرنا چاہتی۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔" فرزانہ نے کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلانے لگی تھیں۔

پھر اس کا اور اماں بیگم کا ڈیڑھ گھنٹا پریشانی ہی میں گزرا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد کال بیل بجی۔ فرزانہ اٹھ کر جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ اماں بیگم بھی اس وقت نشست ہی کے کمرے میں تھیں۔

فرزانہ نے دروازہ کھولا۔ اماں بیگم بھی بے چینی سے دروازے کی طرف آنے لگی تھیں۔

آنے والا عارفین تھا۔ اس کی نظر اماں بیگم پر پڑی تو اس نے فوراً سلام کیا اور بولا "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ شہزاد خیریت سے ہے۔"

فرزانہ نے محسوس کیا کہ عارفین کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور تمتمائے ہوئے چہرے پر پسینہ چمک رہا تھا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" فرزانہ نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں ٹھیک۔۔۔" عارفین جواب دیتے دیتے اس طرح ڈگمگا گیا جیسے اسے چکر آ گیا ہو۔

فرزانہ کے ساتھ ہی اماں بیگم نے بھی اسے سنبھالنے کی کوشش کی اور پھر اماں بیگم چونک کر بولیں "تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔"

"کچھ نہیں اماں بیگم! میں ٹھیک۔۔۔" عارفین نے کہنا چاہا لیکن اس کے قدم ایک بار پھر ڈگمگا گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا پھیل جاتا ہو۔

اماں بیگم نے تقریباً زبردستی اسے اپنے کمرے میں لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ وہ اور فرزانہ اس سے شہزاد کے بارے میں مزید کچھ پوچھنا بھول گئی تھیں یا ان کے

لیے اتنا جان لینا کافی ہوا تھا کہ شہزاد خیریت سے تھا۔

اماں بیگم نے چاہا کہ قریب کے ایک ڈاکٹر کو فرزانہ سے فون کر کے بلوالیں لیکن عارفین نے انہیں روک دیا۔ دوائیں اس کی جیب میں موجود تھیں۔ اس نے بتایا کہ اسے اسی دن شام سے بخار تھا جب وہ شہزاد سے مل کر گیا تھا۔ جھگڑے کی بات وہ بھی زبان پر نہیں لایا۔

فرزانہ سمجھ گئی کہ اس کی خاطر وہ بخار کی حالت میں گھر سے نکلا تھا اس لیے اس کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی تھی۔

اماں بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے عارفین نے بتایا کہ اس نے کسی طرح احتشام کا پتا لگالیا تھا اور اس کے گھر پہنچا تھا۔ گھر پر احتشام نہیں ملا لیکن گھر والوں سے اس کا موبائل فون نمبر معلوم ہو گیا تھا۔ عارفین نے اس سے فون پر رابطہ کیا تو احتشام نے بتایا کہ رات کو کسی دوست کے گھر پر پارٹی تھی جو زیادہ دیر تک چلی تھی اور شہزاد کو وہیں سو جانا پڑا تھا۔ اب وہ سو کر دیر سے اٹھا ہے لیکن دوپہر تک گھر پہنچ جائے گا۔

"اب وہ رات کی پارٹیوں میں بھی جانے لگا۔" اماں بیگم سنجیدگی سے بولیں "وہاں سے وہ فون بھی نہیں کر سکتا تھا۔" پھر وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولیں "فون کیا کرتا' وہیں کہیں لڑھک گیا ہو گا۔" پھر وہ کھڑی ہوئیں "میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" انہوں نے عارفین سے کہا اور فرزانہ کو وہیں بیٹھنے کی تاکید کر کے کمرے سے چلی گئیں۔

"اس کا کیا مطلب ہوا۔" عارفین نے فرزانہ سے کہا "اماں بیگم نے یہ کیا کہا کہ وہ وہیں کہیں لڑھک گیا ہو گا۔"

"شہزاد نے ان دنوں شراب بھی پینا شروع کر دی ہے۔" فرزانہ نے نظریں جھکا کر جواب دیا "اماں بیگم بھی اس سے واقف ہو چکی ہیں۔"

عارفین اس کا منہ تکتا رہ گیا۔

"سچ بتاؤ' احتشام سے تمہیں کیا معلوم ہوا ہے؟؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"میں نے جھوٹ نہیں بولا فرزانہ!" عارفین نے جواب دیا "احتشام نے مجھے یہی بتایا تھا لیکن اس وقت میرے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی کہ رات کی پارٹیوں میں شرکت کا مطلب تو ایک ہی ہوتا ہے۔"

"تمہاری طبیعت خراب ہوئی تو تم نے اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"تم اس کا سبب جانتی ہو۔"

"میں بھی تو تمہاری کچھ ہوں۔" فرزانہ ایک بار پھر جذباتی ہو گئی۔ "کبھی تم نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ میرے لیے تمہارے دوستانہ جذبات کبھی ختم نہیں ہوں گے۔"

عارفین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

فرزانہ کو ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔

"میں جا کے دیکھتی ہوں شاید شہزاد ہی کا فون ہو۔" فرزانہ یہ کہتی ہوئی دروازے کی طرف مڑ گئی۔ عارفین اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ نہ دیکھ سکا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر فرزانہ نے ریسیور اٹھایا "ہیلو!"

"میں شہزاد بول رہا ہوں۔ رات کو میں ایک دوست کے گھر رک گیا تھا دیر سے آنکھ کھلی۔ میں دوپہر تک گھر آجاؤں گا۔ اماں بیگم کو بتا دینا۔"

"اچھا۔" فرزانہ نے آہستہ سے کہا۔

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

فرزانہ اپنی آنکھیں خشک کر کے عارفین کے پاس لوٹی۔

"شہزاد ہی کا فون تھا۔" فرزانہ نے بتایا۔

عارفین اسے غور سے دیکھتا رہا۔

"انسان اکیلا زندگی نہیں گزار سکتا۔" فرزانہ نظریں جھکا کر کہنے لگی "دکھ' پریشانی' بیماری' سبھی کچھ انسان کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ انسان کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارا یہ فیصلہ غلط ہے کہ تم زندگی بھر شادی نہیں کرو گے۔ ابھی اماں بیگم آجائیں گی۔ میں زیادہ بات نہیں کر سکوں گی۔ میں تم سے وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ اب تم شادی کر لو گے۔ تمہارے لیے

میں خود کوئی بہت اچھی لڑکی تلاش کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اصرار کو تم نظرانداز نہیں کر سکو گے لیکن میں وعدہ لینا چاہتی ہوں۔"

عارفین اسے بدستور غور سے دیکھتا رہا تھا۔ فرزانہ خاموش ہوئی تو وہ بولا۔ "مجھے ایک بات یاد آ رہی ہے۔ اپنی شادی سے پہلے تم ایک مرتبہ تنہا میرے فلیٹ میں آئی تھیں۔ شہزاد نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے چابی تمہیں دے دی تھی۔ دو دن بعد میں نے اپنی شلف میں سے کچھ سامان نکالا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ سب کچھ ویسا ہی نہیں تھا جیسا میں نے رکھا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ سب کچھ کسی نے وہاں سے نکال کر دیکھا تھا' لیکن یہ صرف شبہ ہی تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ مجھے غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے لیکن آج مجھے تمہاری باتوں سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میرا شبہ غلط نہیں تھا۔"

"ہاں۔" فرزانہ نے اپنے جذبات دبانے کے لیے اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "میں نے تمہاری تحریریں پڑھ لی تھیں۔ میں نے کبھی اس کا اظہار اس لیے نہیں ہونے دیا کہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اس کے برخلاف کوئی پیچیدگی پیدا ہو سکتی تھی۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ شہزاد کی محبت اپنے دل سے نکال دیتی۔ ان تحریروں کو پڑھ کر یہ ضرور ہوا کہ میں تم میں موجود ایک بڑے انسان کو بہت اچھی طرح جان گئی تھی۔ اس کے بعد میرے دل میں تمہاری دوستی کے جذبات بہت شدید ہو گئے تھے اور اب بھی ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ تمہاری زندگی یوں ویران نہ رہے۔ اب اچانک بات سامنے آ ہی گئی ہے تو میں تم سے وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ تم اس طرح اپنی زندگی برباد نہیں کرو گے اور شادی کر لو گے۔ اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو تم اپنے لیے نہ سہی' میری خوشی کے لیے شادی کر لو۔"

عارفین کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"مجھ سے وعدہ کرو!" فرزانہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے زور دے کر کہا۔

لیکن اس سے پہلے کہ عارفین کچھ کہتا' اماں بیگم ٹرے لیے ہوئے کمرے میں آئیں۔ انہیں کچھ دیر اس لیے لگ گئی تھی کہ انہوں نے صرف چائے نہیں بنائی تھی۔ وہ ناشتا بنا کر لائی تھیں۔ شہزاد کی طرف سے پریشانی لاحق ہو جانے کے باعث انہوں نے اور فرزانہ نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سائرہ خان اور شہزاد کا نکاح اتنی سادگی سے ہوا تھا کہ اس میں قاضی کے علاوہ صرف تین افراد شریک ہوئے تھے۔ پرویز شاہ' احتشام اور اس کا کوئی شناسا جسے وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

نکاح کے بعد احتشام' شہزاد کو ڈرائنگ روم سے متصل کمرے میں لے گیا۔ اس نے سائرہ خان سے اجازت بھی لی تھی کہ اپنے دوست سے چند باتیں کر لے۔ دوسرے کمرے میں اس نے بڑی گرم جوشی سے شہزاد کا ہاتھ دبایا۔ "اب تمہاری زندگی بن جائے گی میری جان!"

"لیکن میرا یہ مسئلہ تم جانتے ہو کہ میں شادی شدہ ہوں۔ مجھے اپنی زندگی دو حصوں میں تقسیم ہو کر گزارنا ہو گی۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ دو شادیاں کرنے والے بہت سے لوگ اسی طرح زندگی گزارتے ہیں اور ان پر دوہری ذمے داریاں بھی ہوتی ہیں۔ تم پر کوئی اضافی ذمے داری نہیں آئی ہے۔ اس کے برعکس سائرہ خان ہی تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہے بلکہ کرے گی۔"

"فرزانہ ذہنی طور پر بڑی مشکل سے آمادہ ہو سکے گی کہ میری دوسری شادی قبول کر لے۔"

"اس قسم کے معاملات میں شروع شروع ایسا ہی لگتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ سب کچھ خود بخود ٹھیک ہوتا چلا جاتا ہے۔"

احتشام کی کچھ اور باتوں سے شہزاد کی نہ صرف پریشانی ختم ہوئی بلکہ اس میں خود اعتمادی بھی پیدا ہوئی۔ پھر احتشام اپنے شناسا کے ساتھ چلا گیا تو سائرہ خان

نے شہزاد کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا "کل رات کتنا خوب صورت حادثہ ہو گیا شہزاد! میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا لوں گی۔"

"لیکن میں صرف تمہارا بن کر نہیں رہ سکوں گا۔" شہزاد نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میرے کچھ مسائل ہیں۔"

"نکاح سے پہلے احتشام صاحب مجھ سے بات کر چکے ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہاری بیوی کے بارے میں بتا دیا ہے۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ جب کسی سے محبت ہو تو اس کی پہلی بیوی کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے اور مجھے تم سے محبت ہے۔"

"میں فرزانہ کو دھیرے دھیرے ہی راہ پر لا سکوں گا۔"

"میں تمہارے لیے کسی پریشانی کا سبب نہیں بنوں گی۔"

"تو پھر مجھے اجازت دو کہ میں گھر کا چکر لگا لوں۔ میرے رات بھر غائب ہو جانے کے باعث میری والدہ بھی بہت پریشان ہوں گی۔"

"تم جب چاہو' میرے پاس آؤ۔ جب چاہو وہاں جاؤ۔ میں نے کہا نا کہ میں تمہارے لیے کسی پریشانی کا سبب نہیں بنوں گی۔ کیا میں تمہیں چھوڑ آؤں؟"

"نہیں۔" شہزاد نے جلدی سے کہا "فی الحال یہ مناسب نہیں رہے گا کہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا جائے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں' دھیرے دھیرے ہی سب ٹھیک ہو گا۔"

"تمہیں ڈرائیونگ تو آتی ہو گی؟"

"ہاں آتی ہے۔ کیوں؟"

"میری کار لے جاؤ۔"

"ارے نہیں۔ میں۔۔۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ میں تمہاری ہو چکی ہوں لہٰذا میری ہر چیز تمہاری ہے۔"

شہزاد نے ایک عجیب سا سرور محسوس کیا۔

"لیکن تم کیا کرو گی؟" اس نے پوچھا۔

"میں دن میں عموماً" کہیں نہیں جاتی۔ رات کو ہوٹل ہی جانا ہوتا ہے۔"

"اس وقت تک تو میں آجاؤں گا۔" شہزاد کا یہ جواب کار لے جانے پر آمادگی کا اظہار تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا تو سائرہ خان کی کار کا اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک قیمتی کار ڈرائیو کرتے ہوئے بڑے خوش گوار موڈ میں سوچنے لگا کہ اس کی زندگی میں انقلاب آچکا ہے۔

اپنے گھر پہنچ کر جب اس نے کال بیل کا بٹن دبایا تو تھوڑا سا متذبذب۔ بہرحال تھا۔

فرزانہ نے دروازہ کھولا۔

"معاف کرنا فرزانہ!" اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش کی "میں رات کو گھر سے غائب نہیں رہنا چاہتا تھا لیکن بس' پھنس گیا۔ اماں بیگم کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہیں۔ عارفین بھی ہے۔" فرزانہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"عارفین؟" شہزاد چونکا۔

"ہاں۔" فرزانہ نے جواب دیا اور پھر اس کی موجودگی کا سبب بھی بتایا' پھر بولی "اماں بیگم نے اس سے کہا ہے کہ جب تک اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو جاتی' اسے یہیں رہنا ہو گا۔ آپ سے جھگڑے کے صدمے نے اسے بیمار ڈال دیا ہے۔"

"میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔" شہزاد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا' پھر پوچھا "اماں بیگم تو خاصے غصے میں ہوں گی۔"

"اگر ہوں گی بھی تو اس کا اظہار نہیں کریں گی۔"

فرزانہ دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے اماں بیگم کے کمرے میں پہنچی۔

شہزاد نے اماں بیگم کو سلام کیا اور جھپٹ کر عارفین کے قریب گیا۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے عارفین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا' پھر بولا "فرزانہ نے بتایا تھا کہ تمہیں بہت تیز بخار ہے لیکن اب تو زیادہ تیز نہیں ہے۔"

"اس گھر میں مجھے محبت کی دوا بھی مل جاتی ہے۔"

عارفین مسکرایا "ممکن ہے کہ میں شام تک بالکل ٹھیک ہوجاؤں۔"

اماں بیگم اٹھ کر کمرے سے جانے لگیں۔ اس سے شہزاد کو ان کے غصے کا اندازہ ہوگیا لیکن اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اس موضوع پر بات کرنے کے بجائے خاموشی ہی اختیار کی جائے۔ عارفین سے بھی وہ اپنے اور اس کے جھگڑے پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بڑی محبت سے کہا۔ "طبیعت ٹھیک ہوجانے کے بعد بھی تم یہیں رہو۔ پہلے بھی ایک بار کہہ چکا ہوں کہ اکیلے گھر میں پڑے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس وقت شہزاد کے دماغ میں یہ خیال چکرا رہا تھا کہ وہ جس مسئلے سے دوچار ہے' اسے ختم کرنے میں عارفین اس کے لیے بہترین مددگار ثابت ہوسکتا تھا۔ وہ تنہائی میں کسی وقت عارفین کو سمجھالیتا۔ جو کچھ ہوگیا تھا' وہ ختم تو ہو نہیں سکتا تھا۔ جو کچھ ہوجائے اس سے سمجھوتا تو کرنا ہی پڑتا ہے اور شہزاد کے خیال کے مطابق یہ بات عارفین کی سمجھ میں آسانی سے آجاتی جس کے بعد وہ اماں بیگم اور فرزانہ کو بھی سمجھالیتا۔

عارفین سے تھوڑی دیر باتیں کرکے وہ فرزانہ کے ساتھ اپنے کمرے میں آگیا۔

"کھانا کھائیں گے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"ہاں بھئی۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" شہزاد ماحول کو خوش گوار رکھنا چاہتا تھا۔

فرزانہ کھانا لینے چلی گئی۔

شہزاد لیٹ کر گزری ہوئی رات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ آج بھی سائرہ خان کے ساتھ کچھ وقت گزارے' لیکن وہ یہ بھی مناسب نہیں سمجھ رہا تھا کہ آج رات بھی گھر سے غائب رہے۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ وہ تین چار بجے تک کا وقت گھر پر گزارنے کے بعد سائرہ خان کے پاس چلا جاتا اور رات کو جب وہ ہوٹل جاتی تو اپنے گھر لوٹ آتا۔

فرزانہ کھانا لے کر آگئی۔

"اماں بیگم نہیں کھائیں گی؟" شہزاد نے پوچھا۔

"وہ ہمارے ساتھ نہیں کھائیں گی۔ وہ غصے میں ہیں۔ دھیرے دھیرے ہی ان کا غصہ ٹھنڈا ہوگا۔ ابھی ان سے بات نہ کرنا ورنہ وہ برس ہی پڑیں گی۔"

"تم نے خفگی کا اظہار بالکل نہیں کیا۔"

"میں تم سے خفا ہوکر کہاں جاؤں گی۔" فرزانہ کی آواز بھرا گئی۔ "تمہارے رات بھر غائب رہنے سے میں بہت پریشان تھی لیکن میں نے اپنے گھر والوں کو فون کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اب صرف تم ہی میرے لیے سب کچھ ہو شہزاد!"

مجھے معاف کردو فرزانہ! مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ مجھے یہاں فون تو کردینا چاہیے تھا۔ خیر! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری یہ پریشانی رایگاں نہیں جائے گی۔ رات کی پارٹی بڑی فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔ مستقبل میں ہم مالی طور پر بہت آسودہ ہوجائیں گے۔"

فرزانہ کو مستقبل کی آسودگی سے شاید کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کہا "آج آپ دفتر بھی نہیں گئے۔"

"ہاں۔" شہزاد کو موقع مل گیا "حالانکہ آج چار بجے دفتر میں بہت اہم میٹنگ بھی ہے۔ میں نے فون پر بات کی تھی۔ دفتر والے چاہتے ہیں کہ میں کم از کم اس میٹنگ میں ضرور شریک ہوجاؤں۔ میں ساڑھے تین بجے تک چلا جاؤں گا۔ میٹنگ شاید چار گھنٹے تک چلے۔ میں بہرحال نو بجے سے پہلے گھر لوٹ آؤں گا۔"

✲ ✲ ✲

اس گفتگو کے باعث شہزاد کو ساڑھے تین بجے گھر سے نکلنے کا موقع مل گیا۔

چار بجے وہ سائرہ خان کے گھر کے دروازے پر تھا۔

سائرہ خان نے حیرت سے کہا "اتنی جلدی لوٹ آئے۔ میں نے کہا تو تھا کہ مجھے کار کی ضرورت شام کو پڑے گی۔"

"دراصل آج میں رات کو یہاں نہیں رک سکوں گا لیکن مجھے خواہش ہوئی تھی کہ آج بھی تمہارے ساتھ کچھ وقت گزاروں۔ کل رات تو نشے میں کچھ

سدھ بدھ ہی نہیں رہی تھی۔" شہزاد نے مسکرا کر کہا۔
"تم بہت اچھے ہو شہزاد!" سائرہ خان نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم مجھے مل گئے۔ آؤ' آج اس کمرے کے بجائے اپنے بیڈ روم میں چلو۔"
"آج کچھ سناٹا محسوس کر رہا ہوں۔"
"میں اکیلی ہوں۔"
"کیوں؟"
"ملازم لڑکا ایک ہفتے کی چھٹی لے گیا ہے۔ کھانا پکانے والی صبح دو گھنٹے کے لیے آتی ہے۔" سائرہ خان نے جواب دیا "شاہ صاحب اس وقت ٹیوشنز کے لیے نکل جاتے ہیں اور نو دس بجے تک آتے ہیں۔"
باتیں کرتے ہوئے سائرہ خان اسے بیڈ روم میں لے گئی۔
"کیا آج بالکل نہیں پیو گے؟" اس نے پوچھا۔
"تھوڑی سی تو پینا ہی چاہیے۔" شہزاد دھیرے سے ہنسا۔
"شراب اسی کمرے میں ہوتی ہے۔ تم بیٹھو' میں لے کر آتی ہوں۔"
شہزاد بیٹھ گیا۔ سائرہ خان شراب کی بوتل اور دو گلاس لے آئی۔ پانی کی بوتل اس نے روم فریج میں سے نکال لی۔ دونوں پیگ اس نے خود ہی بنائے' پھر بولی "اس وقت میں کبھی نہیں پیتی لیکن تمہارا ساتھ دینے کے لیے ایک پیگ پی لوں گی۔"
"میں بھی دو سے زیادہ نہیں پیوں گا۔" شہزاد اٹھ کر سائرہ خان کے برابر میں بیٹھ گیا۔ "ہمیں اب دور دور نہیں رہنا چاہیے۔"
"میں نے تو تمہیں اپنے دل میں بسا لیا ہے۔" سائرہ خان نے بڑی محبت سے کہا "لیکن تم نے شاید یہ مجبوری ہی مجھے اپنایا ہو۔"
"بظاہر تو ایسا ہی ہوا ہے مگر اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میرے دل میں تمہاری محبت نے پہلے ہی جگہ بنالی تھی۔ شاید میں اظہار محبت کرتے ہوئے ہمیشہ ہی ہچکچاتا رہتا لیکن شراب نوشی نے یہ مشکل آسان کردی۔"
سائرہ خان کچھ سوچتی ہوئی بولی "سنا ہے کہ جس سے محبت ہو' انسان اس کی ایک آدھ غلطی آسانی سے معاف کر دیتا ہے۔"
"تمہیں یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟"
"زندگی میں ایک غلطی مجھ سے بھی ہو چکی ہے۔"
"وہ کیا؟"
"کسی وقت تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔"
"تم مجھے الجھن میں ڈال رہی ہو۔"
"لو یہ پیو۔" سائرہ خان نے اس کا گلاس اٹھایا "میرے ہاتھ سے پیو۔"
شہزاد نے دو گھونٹ لینے کے بعد کہا "الجھن تو اب رہے گی۔"
"نہیں رہے گی۔ تم اتنی پیو کہ میرے علاوہ سب کچھ بھول جاؤ۔"
"میں اس وقت زیادہ تو نہیں پیوں گا۔ تم میری الجھن ختم کر دیتیں تو اچھا تھا۔"
"پلیز شہزاد!" سائرہ خان نے پھر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
"اچھا!" شہزاد ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔
اس نے دو پیگ پیے۔ سائرہ خان ایک ہی پیگ سے اس کا ساتھ دیتی رہی۔
اس دوران میں شراب کے اثر سے سائرہ خان کا قرب شہزاد کے جذباتی ہیجان میں اضافہ کرتا رہا تھا۔ دوسرا پیگ ختم کرنے کے بعد وہ سرکش ہو گیا۔ سائرہ خان ابتدا ہی سے ہمہ تن سپردگی کے عالم میں رہی تھی۔
ہیجان نے اپنا کھیل شروع کر دیا۔ اس کھیل میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب شہزاد کو ایک بات کچھ عجیب سی لگی لیکن اس وقت ہیجان اپنے عروج کی طرف بڑھ رہا تھا۔
جب تلاطم ختم ہو گیا تو شہزاد تھکا تھکا سا صوفے پر جا بیٹھا اور خود ہی اپنے لیے پیگ بنانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی یا اس کا اندازہ

درست تھا۔ اس لیے دماغ میں سائرہ خان کی آواز بھی گونجنے لگی تھی "سنا ہے کہ جس سے محبت ہو' انسان اس کی ایک آدھ غلطی آسانی سے معاف کر دیتا ہے۔"

تو کیا یہی وہ غلطی ہے؟ شہزاد نے شراب کے کئی گھونٹ لے ڈالے۔

اس وقت سائرہ خان بھی اس کے برابر میں آبیٹھی۔

"تم اچانک بہت سنجیدہ ہو گئے شہزاد!" وہ خود بھی سنجیدہ تھی۔

"کل رات۔" شہزاد سوچتا ہوا بولا "جیسا کہ تم جانتی ہو' میں بہت زیادہ نشے میں تھا لیکن اس وقت مجھے ایک شبہ ہوا ہے۔"

"تمہارا شبہ درست ہے۔" سائرہ خان نظریں جھکا کر بولی۔

شہزاد اپنا ہونٹ کاٹنے لگا "تم کسی لیڈی ڈاکٹر سے مل کر اسے ختم بھی کروا سکتی تھیں۔"

"میں خوف زدہ تھی۔" سائرہ خان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میری دو سگی بہنوں کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ انہوں نے چاہا تھا کہ شادی کے بعد جلدی ماں نہ بنیں' مگر ان کے کیس پیچیدہ ہو گئے۔ ان کی زندگی...."

"جہنم میں گئی ان کی زندگی۔" شہزاد ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ شراب کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا جس پر اس کے ہاتھ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

"شہزاد!" سائرہ خان لجاجت سے بولی "میں نے کہا تھا ناکہ جس سے محبت ہو انسان اس کی ایک آدھ غلطی معاف کر دیتا ہے۔"

"کیا یہ اتنی معمولی غلطی ہے؟" شہزاد نے اسے گھور کر دیکھا۔

"یہ غلطی تم سے بھی ہوئی تھی" سائرہ خان نے دبے لہجے میں کہا "کیا صرف مرد ہی کی ایسی غلطی قابل معافی ہوتی ہے؟"

"مجھ سے غلطی ہوئی تھی تو میں نے شادی بھی کر لی۔"

"پلیز شہزاد!"

"نہیں" شہزاد صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور دوسرا پیگ بناتا ہوا بولا "تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتاؤ۔ وہ کون تھا۔ اگر میں پرمطمئن ہو سکا' تبھی تمہاری یہ غلطی معاف کر سکوں گا لیکن اس صورت میں بھی تمہیں اپنی اس غلطی کا نام و نشان تو مٹانا ہی ہو گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا شہزاد! میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ میں اپنی بہنوں کی وجہ سے بہت خوف زدہ ہوں۔"

"میں دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"ہم کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر چلے جائیں گے۔ کسی کو اس بچے کی پیدائش کا وقت نہیں معلوم ہو سکے گا۔"

"لیکن میرے دماغ پر تو بوجھ رہے گا۔ میں ساری زندگی اس بچے کا باپ بن کر نہیں رہ سکتا جو میرا بچہ نہیں ہو گا۔" شہزاد نے دوسرا پیگ اٹھا کر ایک بڑا گھونٹ لیا۔

سائرہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

"جواب دو!" شہزاد اسے گھورنے لگا۔

"میں کچھ نہیں بتا سکتی شہزاد!"

"تو پھر آج ہی ہمارا تعلق ختم ہو جائے گا۔"

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" اچانک سائرہ کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔

"ہاں۔"

"تو پھر میں تمہارے دوست کو ابھی یہاں بلاتی ہوں۔" سائرہ خان نے قریب رکھا ہوا موبائل فون اٹھایا۔ "فیصلہ اپنے دوست کے سامنے ہی کرنا۔"

"دوست!" شہزاد کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ "تم احتشام کی بات کر رہی ہو؟"

"ہاں۔" سائرہ خان نے کہا۔

شہزاد کا دماغ جھنجھنانے لگا۔ اسے جو خیال آیا تھا' وہ خاصا مشتعل کر دینے والا تھا۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

سائرہ خان نے موبائل فون پر مختصر سی بات کر کے

فون بند کر دیا۔

شہزاد ٹہلتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ غالباً" اسے باقاعدہ جال میں پھانسا گیا تھا۔ اختشام نے اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شراب اور جوئے کی طرف مائل کیا تھا۔ جوئے میں اس کی ہار بھی "ایماندارانہ" نہیں تھی۔ اختشام ہی کے ایما پر کسی "پتے باز" نے ایسے پتے بانٹے تھے کہ وہ اپنا سب ہی کچھ داؤ پر لگا دے۔

پھر جمال خان کا ہوا کھڑا کیا گیا اور اسی دوران میں سائرہ خان سے اس کا تعارف ہو چکا تھا۔

سارا کھیل شہزاد کی سمجھ میں آنے لگا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ سائرہ خان کے ہونے والے بچے کا باپ اختشام ہی ہو سکتا ہے' لیکن یہ بات شہزاد کی سمجھ میں نہیں آئی کہ اختشام نے خود ہی سائرہ خان سے شادی کیوں نہیں کی؟ اسے سائرہ خان کے ساتھ کیوں پھنسایا؟

"کیا..." شہزاد نے سائرہ خان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کرنا چاہا۔

"ابھی کچھ نہیں۔" سائرہ خان نے اس کی بات کاٹی۔ "جو کچھ کہنا ہے' اب اپنے دوست کے سامنے ہی کہنا۔" شہزاد نے ہونٹ بھینچ لیے۔

اختشام نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ کال بیل کی آواز سن کر سائرہ خان دروازہ کھولنے گئی۔ شہزاد وہیں بیٹھا رہا۔ دوسرا پیگ اس نے ختم کر لیا تھا۔ اس نے تیسرا پیگ نہیں بنایا۔ اسے خاصا نشہ ہو چکا تھا۔ دو پیگ تو اس نے اپارٹمنٹ میں آتے ہی پیے تھے۔

سائرہ خان اختشام کے ساتھ ہی وہاں آئی' لیکن پانچ منٹ بعد۔ پانچ منٹ تک وہ دونوں ڈرائنگ روم میں ہی باتیں کرتے رہے ہوں گے۔

اختشام نے شہزاد کے قریب بیٹھ کر سنجیدگی سے کہا۔ "سائرہ خان نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم غصہ تھوک دو۔ سائرہ خان کی رفاقت تمہارے لیے ایک بہتر مستقبل کی ضمانت ہے۔"

"تو تم ہی اس کے بچے کے باپ ہو؟" شہزاد اسے خوں خوار نظروں سے دیکھنے لگا۔

اختشام نظریں جھکائے کچھ سوچتا رہا' پھر سر اٹھا کر مضبوط لہجے میں بولا۔ "ہاں... میرا خیال ہے کہ میں تم سے کوئی جھوٹ بولنے کے بجائے صاف صاف باتیں کر لوں۔"

"کیا صاف صاف باتیں کرو گے؟" شہزاد نے تلخی سے کہا۔ "تم نے دوست ہو کر مجھ سے دغا بازی کی ہے۔"

"ہم کبھی ایک دوسرے کے دوست نہیں تھے۔" اختشام نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے مجھ سے تعلقات بڑھانا اس لیے پسند کیا کہ میں دولت مند ہوں اور میں چاہتا تھا کہ سائرہ خان سے کسی کی شادی کرا دوں۔"

"جبکہ اس کے بچے کے باپ تم ہو۔"

"ہاں..." اختشام سنجیدہ ہی رہا۔ "میں سائرہ سے شادی نہیں کر سکتا تھا' لیکن اسے بے سہارا چھوڑ دینا بھی میرے لیے ممکن نہیں۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔"

"محبت یا ہوس؟" شہزاد کا لہجہ زہریلا تھا۔ "اگر تمہیں اس سے محبت ہوتی تو تم اس سے شادی کرتے' اس سے میری شادی نہ کرتے۔"

"میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ میں اب تم سے بہت صاف صاف بات کروں گا۔ سائرہ کے بارے میں میں نے تمہیں غلط بتایا تھا کہ یہ کسی بڑے گھرانے کی لڑکی ہے۔ دو سال پہلے یہ امریکہ میں تھی۔ وہاں اس نے ماڈلنگ کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ یہ مجھے پسند آئی اور میں اسے یہاں لے آیا۔ اس کا یہ اپارٹمنٹ' اس کی یہ کار' اس کا سارا ٹھاٹ باٹ میری دولت کی وجہ سے ہے۔ اس سے شادی کر کے میں خاندانی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتا' لیکن میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ میں اسے بھول جاؤں یا اسے چھوڑ دوں۔ میں نے ان دو برسوں میں پوری کوشش کی تھی کہ یہ ماں نہ بننے پائے' لیکن بعض اوقات ساری احتیاطیں دھری رہ جاتی ہیں۔ میں تو چاہتا تھا کہ کسی لیڈی ڈاکٹر کے ذریعے معاملہ ختم کروا دیا جائے۔ لیکن سائرہ کے دماغ میں

ایک خوف بیٹھا ہوا ہے۔ اپنی دو بہنوں کے بارے میں اس نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ وہ سب کچھ حقیقت ہے۔ ایسی صورت میں یہی ایک راستہ تھا کہ کسی سے سائرہ کی شادی کرادی جائے۔"

"اور اس کے لیے تم نے مجھے شکار کرلیا؟"

"اگر میں نے تمہیں شکار کیا ہے تو اس میں تمہیں کوئی گھاٹا نہیں ہے۔ میں آئندہ بھی سائرہ کو اتنا کچھ دیتا رہوں گا کہ تمہیں بھی اس سے ملتا رہے گا۔"

"گویا اس سے تمہارا تعلق بدستور قائم رہے گا؟"

"ظاہر ہے۔"

"اس کے باوجود کہ وہ میرے نکاح میں آچکی ہے؟"

"نکاح!" احتشام نے منہ بنایا۔ "سوسائٹی کی اس شعبدہ بازی کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں۔ نکاح نامہ کیا ہوتا ہے؟ کاغذ کا ایک معمولی سا ٹکڑا جسے لڑکے اور لڑکی کے تعلق کے لیے قانون سمجھ لیا جاتا ہے۔ میں سوسائٹی کی ان فرسودہ باتوں کو بالکل نہیں مانتا اور ایک صدی گزرنے کی بات ہے، پھر کوئی بھی نہیں مانے گا۔ تم مجھے مستقبل کا آدمی سمجھ سکتے ہو۔ میری طرح تم بھی کاغذ کے اس ٹکڑے کو نظرانداز کردو۔ مجھے سائرہ سے محبت ہے' اس لیے تم میرے اور اس کے تعلق پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کرنا۔ تم سائرہ کے ساتھ وقت گزارو گے جس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہ ایک سیدھا سادہ شریفانہ سودا ہے' جس سے تمہیں تو مالی فائدہ بھی پہنچتا رہے گا۔"

"شریفانہ سودا!" شہزاد نے غصے سے کہا۔ "اتنا کچھ جان لینے کے بعد میں یہی کرسکتا ہوں کہ سائرہ کو طلاق دے دوں۔"

"یہ تمہارے لیے گھاٹے کا سودا ہوگا۔ اگر تم اپنے بہتر مستقبل کو نظرانداز کردو تو بھی جمال خان کے دو لاکھ کہاں سے دوگے؟"

"تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟" شہزاد نے دانت پیسے۔

"میں بس یہ چاہتا ہوں کہ میری اب تک کی محنت رائیگاں نہ جائے۔"

"تم بہت کمینے ہو؟" شہزاد کا غصہ بڑھ رہا تھا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو شہزاد!" احتشام کا چہرہ بھی تمتما گیا۔ "تم کو اپنی حیثیت یاد رکھنا چاہیے۔"

"کیا ہے میری حیثیت۔" شہزاد اس طرح کھڑا ہوا جیسے لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگیا ہو۔

سائرہ خان جو سپاٹ چہرے کے ساتھ خاموش بیٹھی رہی تھی' اب گھبرائی ہوئی نظر آنے لگی۔

"تمہاری حیثیت یہ ہے کہ میں نے تمہیں خریدا ہے۔" احتشام بھی کھڑا ہوگیا۔ "میرے پاس پیسا ہے' تم جیسے کسی بھی شخص کو خرید سکتا ہوں۔"

"تم ابھی مجھے لکھ کردو گے کہ میں نے جمال خان کا قرض تمہیں لوٹا دیا ہے۔"

"تمہیں زیادہ چڑھ گئی ہے۔" احتشام نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ "اتنی زیادہ نہ پیا کرو۔"

"میں جو کہہ رہا ہوں' وہ تمہیں کرنا پڑے گا۔" شہزاد نے جھک کر چاقو اٹھالیا۔

سیب کی پلیٹ میں چاقو بھی رکھا ہوا تھا۔ سیب کی پلیٹ سائرہ خان نے گزشتہ رات ہی اس تپائی پر اس وقت لاکر رکھی تھی جب وہ گلاسوں میں شراب بنا رہی تھی۔

سائرہ خان اچھل کر کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرا سفید پڑ گیا تھا' لیکن احتشام نے شہزاد کے ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کو اہمیت نہیں دی۔ وہ حقارت سے بولا۔

"تم جیسے لالچی اور ریکا ولوگ اتنے مرد نہیں ہوتے۔"

اس قسم کی باتیں کرنا احتشام کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اسے سوچنا چاہیے تھا کہ شہزاد اس وقت صرف غصے میں نہیں' نشے میں بھی تھا۔ احتشام کو اپنی اس غلطی کا خوف ناک خمیازہ بھگتنا پڑا۔ شہزاد نے دانت پیستے ہوئے چاقو اس کے سینے میں گھونپ دیا۔

"نہیں۔" سائرہ خان کی چیخ نکل گئی۔

احتشام کی آنکھیں پھیل گئیں اور منہ کھل گیا۔

شہزاد نے چاقو اس کے سینے سے کھینچ لیا۔ چاقو باہر آتے ہی احتشام کے سینے سے خون کا فوارہ سا چھوٹا۔

خاصی چھینٹیں شہزاد کے لباس پر بھی آئیں۔ احتشام ڈگمگا کر گرنے لگا۔ اسی وقت شہزاد نے اس کے سینے پر دوسرا وار کیا۔ اس وقت اس کے دماغ میں سرخ بگولے سے چکرا رہے تھے۔

سائرہ خان، ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی دروازے کی طرف بھاگی۔

"تو کہاں جارہی ہے؟" شہزاد اس کی طرف جھپٹا۔ "میں تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا' فریبی عورت۔"

اس سے پہلے کہ سائرہ خان دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی' شہزاد نے چاقو اس کے پہلو میں پیوست کردیا۔ اس پر جنون طاری تھا۔ اس نے سائرہ خان پر پے در پے کئی وار کیے۔ سائرہ خان گر کر تڑپنے لگی۔ اس کی آنکھیں اذیت سے پھیل گئی تھیں۔

شہزاد نے مڑ کر احتشام کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے خوف میں ڈوبا ساکت پڑا ہوا تھا۔ اس پر ہونے والا کوئی وار اتنا کاری تھا کہ زندگی نے اسے چند لمحوں کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔

شہزاد نے لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے سائرہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی زیادہ دیر نہیں تڑپی تھی اور ساکت ہوگئی تھی۔

شہزاد کا دماغ سائیں سائیں کررہا تھا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے ایک طرف گر پڑا۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے چلتا' صوفوں کے قریب گیا۔ وہ ایک صوفے پر اس طرح بیٹھا تھا جیسے گر پڑا ہو۔

کمرے کے خوف ناک ماحول پر مکمل سکوت طاری تھا۔

شہزاد کو دھیرے دھیرے احساس ہونے لگا کہ وہ ایک سنگین صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کے ہاتھوں دو قتل ہوچکے تھے۔ وہ یہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لباس پر خون کے چھینٹے تھے۔ وہ کچھ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا وحشت سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

جس وقت گھنٹی بجی' فرزانہ اپنے کمرے میں ٹیلی فون کے قریب ہی تھی۔ اس نے فوراً ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو!"

"فرزانہ!" شہزاد کی گھٹی گھٹی سی آواز آئی۔ "عارفین کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"کیا بات ہے؟" فرزانہ پریشان ہوگئی۔ "تم ٹھیک تو ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ تم مجھے عارفین کے بارے میں بتاؤ۔"

"اس کی طبیعت اب خاصی ٹھیک ہے' لیکن تم۔۔۔"

"باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ عارفین کو فون پر بلاؤ۔"

"بلا دیتی ہوں' لیکن مجھے تو کچھ بتاؤ۔" فرزانہ روہانسی ہونے لگی۔

"تمہیں بھی سب کچھ بتادوں گا' لیکن ابھی وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً" عارفین کو بلاؤ۔ اس سے بے حد ضروری مشورہ کرنا ہے۔"

فرزانہ نے ریسیور رکھا اور بوکھلائے ہوئے انداز میں کمرے سے نکلی۔

دو منٹ بعد ہی عارفین اس کمرے میں موجود تھا۔ ریسیور کان سے لگا کر وہ شہزاد کی باتیں سننے لگا۔ فرزانہ اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ فوری طور پر عارفین کچھ حواس باختہ نظر آیا تھا' لیکن پھر اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا۔ وہ شہزاد کی باتیں سن کر صرف "ہوں۔۔۔ ہوں۔" کرتا رہا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے پریشانی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ آخر اس نے اپنی جیب سے بال پوائنٹ نکال کر کچھ لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "پتا بتاؤ۔"

فرزانہ مضطربانہ انداز میں جھک کر وہ پتا دیکھنے لگی جو عارفین لکھ رہا تھا۔ وہ پتا کسی ایسی جگہ کا تھا جس سے وہ ناواقف تھی۔ عارفین نے وہ پتا سامنے پڑے ہوئے اخبار کے ایک کونے پر لکھا تھا۔ اخبار سے وہ حصہ پھاڑ کر اس نے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے شہزاد سے کہا۔ "میں جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کروں گا۔" پھر اس

نے شہزاد کا جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔
"کیا بات ہے؟" فرزانہ نے بے تابی سے پوچھا۔
"میں جھوٹ نہیں بولوں گا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" عارفین نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "شہزاد ایک گمبھیر صورت حال سے دوچار ہو گیا ہے لیکن اس نے ان حالات میں مجھ پر بھروسا کیا ہے تو میں اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچنے دوں گا۔"
"آخر ہوا کیا ہے؟" فرزانہ تیزی سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ "خود تمہاری طبیعت بھی تو....."
"میری طبیعت اب اتنی خراب نہیں ہے کہ میں شہزاد کی اس پریشانی سے واقف ہونے کے بعد بستر پر پڑا رہوں۔"
"میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"
"نہیں۔" عارفین کے لہجے میں سختی تھی۔ "وہاں تمہارا جانا بالکل مناسب نہیں۔"
بیرونی کمرے میں اماں بیگم موجود تھیں۔ انہوں نے عارفین کو تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہو بیٹا؟"
"ایک بہت ضروری کام ہے۔ فرزانہ سے آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"
عارفین نے خود ہی دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔
فرزانہ کا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ زیر لب خیر و عافیت کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ وہ جتنا کچھ جانتی تھی، اس نے اماں بیگم کو بتا دیا اور وہ بھی بہت پریشان ہو گئیں۔
فرزانہ پریشانی میں ٹہلنے لگی۔ ایک بار وہ ٹہلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ٹیلی فون کے قریب اس نے ایک چابی رکھی ہوئی دیکھی۔ اسے خیال آیا کہ جب عارفین نے بال پوائنٹ نکالا تھا تو شاید چابی بھی جیب سے نکل آئی ہوگی جو اس نے بے خیالی میں وہیں رکھ دی ہوگی۔
لیکن..... فرزانہ نے فوراً ہی سوچا، بال پوائنٹ کے ساتھ چابی تو جیب سے نہیں نکل سکتی۔
فرزانہ کا ذہن الجھ گیا۔ اس نے چابی اٹھا کر دیکھی۔ اسے خیال آیا کہ وہ عارفین کے فلیٹ ہی کی چابی ہو سکتی تھی۔ شادی سے قبل ایک مرتبہ شہزاد نے اسے بالکل ایسی ہی چابی دی تھی۔
فرزانہ نے چابی احتیاط سے رکھ لی۔ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ چابی وہاں کیوں تھی؟
وقت گزرتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ اماں بیگم اور فرزانہ کی پریشانی میں اضافہ ہوتا رہا۔ لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ قیامت کی طرح گزرا اور پھر کال بیل کی آواز سن کر فرزانہ دروازے کی طرف جھپٹی۔
دروازہ کھولتے ہی اس نے شہزاد کو دیکھا۔ "تم؟" اس کے منہ سے نکلا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئی تھی کہ شہزاد کے جسم پر اس وقت عارفین کا لباس تھا۔
شہزاد اندر آ گیا۔ فرزانہ نے دروازہ بند کر لیا۔
"کیا بات ہے؟ عارفین کہاں ہے؟" اماں بیگم نے پوچھا۔
"وہ بھی آ جائے گا، آپ پریشان نہ ہوں۔"
"کیسے پریشان نہ ہوں۔" اماں بیگم جھنجلا گئیں۔
"اچھا آپ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جائیں۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں آپ کو اپنی زبان سے نہیں بتا سکتا۔ میں ابھی فرزانہ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ فرزانہ سے آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"
اماں بیگم اس کا منہ تکنے لگیں۔ وہ فرزانہ کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گیا اور بولا۔ "مجھے کپڑے نکال دو۔" اس نے اسی وقت عارفین کے کپڑے اتار کر اپنے کپڑے پہن لیے۔
"اب کچھ بتاؤ گے بھی۔" فرزانہ جیسے رو دے رہی تھی۔
"میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ ایک بہت بڑی ٹھوکر کھا کر آج مجھے عقل آ گئی ہے فرزانہ!" شہزاد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ عارفین یہ معاملہ کس طرح سنبھالے گا، لیکن اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ مجھ پر آنچ نہیں آنے دے گا۔"
پھر جو کچھ شہزاد نے بتایا اسے سن کر فرزانہ کو سکتہ سا

ہو گیا۔

"ان دونوں کو قتل کرنے کے بعد۔" شہزاد آہستہ آہستہ کہتا رہا۔ "کچھ دیر تک تو میرا دماغ ٹھیک سے کام ہی نہیں کرسکا۔ پھر مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں اپنے لیے ایک ایسا راستہ بنالیا ہے جو شاید مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچا دے۔ اس وقت مجھے عارفین کا خیال آیا۔ میں اعتراف کروں گا کہ وہ بہت ذہین ہے جس نے مجھے احتشام سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی' لیکن میں اس کے ہاتھوں بے وقوف بن گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں کسی طرح اس مشکل سے نکل سکتا ہوں تو اس کی تدبیر صرف عارفین ہی کرسکتا ہے۔ اسی خیال سے میں نے یہاں فون کیا۔ میں نے فون پر ہی عارفین کو ساری بات بتادی تھی۔ وہ فوراً وہاں پہنچ گیا۔ اس نے اپنے کپڑے اتار کر بستر کی چادر لپیٹ لی اور مجھ سے کہا کہ میں اپنے خون آلود کپڑے اتار کر اس کے کپڑے پہن لوں۔ مجھ پر ایسی بوکھلاہٹ طاری تھی کہ اس نے جو کچھ کہا' میں کرتا چلا گیا۔ اس نے مجھ سے نکاح نامہ مانگا۔ وہ میں نے اسے دے دیا۔ اس نے نکاح نامہ دیکھتے ہی مجھے بتادیا کہ وہ جعلی ہے۔ سائرہ سے میری شادی محض ڈراما تھی۔ وہ قاضی جعلی ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ احتشام نے وہ سارا بندوبست کس طرح کیا ہوگا۔ بہرحال اس کے بعد عارفین نے مجھ سے کہا کہ میں وہاں سے چلا جاؤں' وہ کسی نہ کسی طرح اس معاملے کو سنبھال لے گا۔"

"وہ کس طرح سنبھالے گا؟" فرزانہ نے سرگوشی سی کی۔

"وہ بہت ذہین ہے۔" اس نے ضرور کچھ سوچ لیا ہوگا۔

فرزانہ سکتے ہی کی سی حالت میں بیٹھی رہی۔ اس وقت اس کا دل رو رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ عارفین نے کیا سوچا ہوگا۔

☼ ☼ ☼

اسی دن سہ پہر کو فرزانہ نے حوالات میں عارفین سے ملاقات کی۔ رو' رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔

"یہ تم نے کیا کردیا عارفین!" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"دوست کے لیے انسان کچھ بھی کرسکتا ہے فرزانہ۔"

"نہیں۔" فرزانہ نفی میں سرہلانے لگی۔ "یہ تم نے دوست کے لیے نہیں کیا' تم مجھ سے تو جھوٹ نہیں بول سکتے۔ میں تمہارے جذبات سے ناواقف نہیں ہوں۔"

"ایک کام کرنا۔" عارفین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ میرے ان جذبات سے کوئی اور واقف نہ ہوسکے۔ تم میرے فلیٹ جاکر میرے وہ سب خطوط ضائع کردینا۔ میں فلیٹ کی چابی تمہارے گھر چھوڑ آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں مل گئی ہوگی۔"

"تو تم نے وہ چابی وہاں جان بوجھ کر چھوڑی تھی؟"

"ہاں۔" عارفین نے جواب دیا۔ "فون پر شہزاد سے ساری صورت حال جاننے کے بعد میں نے سمجھ لیا تھا کہ شہزاد کو بچانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور میں نے اس راستے پر چلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔"

"میں تمہیں اس راستے پر نہیں جانے دوں گی۔ میں شہزاد کو مجبور کروں گی کہ وہ پولیس کو حقیقت بتا دے اور اگر وہ نہیں بتائے گا تو پھر میں بتاؤں گی۔"

"اس سے کچھ نہیں ہوگا فرزانہ۔" عارفین نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے خود کو جن حالات میں گرفتار کرایا ہے' اس کے بعد پولیس شہزاد کے بیان سے یہی سمجھے گی کہ وہ ایک دوست کی خاطر یہ جرم اپنے سر لینا چاہتا ہے اور اگر یہ بات تم نے پولیس کو بتائی تو اس سے وہ محبت بدنام ہوجائے گی جسے میں نے ہمیشہ ایک مقدس راز کی طرح اپنے دل میں چھپا کر رکھا ہے۔ وہ تو ایک اتفاق تھا کہ تم اس سے واقف ہوگئیں۔ ورنہ میں یہ راز اپنے سینے ہی میں لے جاتا۔ اب اگر تم نے بھی پولیس کو حقیقت بتائی تو بھی یہ مقدمہ شہزاد کے خلاف نہیں بن سکے گا اور پولیس اس

نتیجے پر پہنچے گی کہ میں سائرہ خان سے محبت کرتا تھا اور تم مجھ سے محبت کرتی ہو' اس لیے مجھے بچانے کے لیے اپنے شوہر کی زندگی داؤ پر لگا دینا چاہتی ہو۔ تمہیں ایسا کوئی قدم اٹھا کر بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ بے وقوفی نہ کرنا۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جگہ بن گئی ہے تو میں تم سے التجا کروں گا کہ میری محبت کو ایک مقدس راز کی طرح محفوظ رہنے دو۔"

فرزانہ نے وہ باتیں سن کر کچھ بے بسی محسوس کی تو اپنا سر حوالات کی سلاخوں سے ٹکرا دینا چاہا' لیکن عارفین نے جلدی سے اپنا ہاتھ باہر نکال کر سلاخوں پر رکھ دیا۔ فرزانہ کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو اس کے ہاتھ کو بھگونے لگے۔

"یہ آنسو میرے لیے موتیوں سے زیادہ قیمتی ہیں فرزانہ۔" عارفین نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "تم انہیں یوں ضائع کرو گی تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔"

فرزانہ نے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ روتی ہوئی حوالات سے لوٹ آئی۔

☼ ☼ ☼

چند دن بعد ہی مقدمہ عدالت میں آگیا اور زیادہ عرصہ تک نہیں چلا۔ وہ دن آ ہی گیا جب عارفین کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔

فرزانہ اخبار میں اس خبر کو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔ پوری خبر پڑھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے وہ یہ نہیں جان سکی کہ عدالت نے عارفین سے یہ رعایت کیوں برتی تھی کہ اسے پھانسی کی سزا نہیں سنائی تھی۔

اسی دن فرزانہ نے شہزاد کا گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ شہزاد سے طلاق لینا چاہتی ہے۔ یہ ایسی بات تھی کہ گھر میں ہلچل مچ گئی۔ جس نے پوچھا کہ وہ شہزاد سے طلاق کیوں لینا چاہتی ہے' لیکن اس نے کسی کو سبب نہیں بتایا۔

"میری وجہ سے کوئی پریشان نہ ہو۔" اس نے اپنے گھر والوں سے کہا۔ "کوئی یہ بھی نہ سمجھے کہ میں شہزاد سے طلاق لے کر فوراً" کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں کسی پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ میں پڑھی لکھی ہوں' ملازمت کر کے اپنی زندگی گزار سکتی ہوں۔"

گھر والے اس کا منہ تکتے رہ گئے۔

اسی وقت فرزانہ نے کمرے میں جا کر ایک مختصر خط لکھا۔

"شہزاد! میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ ہماری زندگی میں کوئی ایسا موڑ بھی آسکتا ہے۔ میں بہت سوچ سمجھ کر ایک فیصلے تک پہنچی ہوں۔ میں بہت صاف صاف کہنا چاہتی ہوں کہ تم بہت ہی "چھوٹے انسان" ہو۔ میرے لیے اب ممکن نہیں کہ میں اپنی باقی زندگی تمہارے ساتھ گزار سکوں۔ اگر تم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو گے تو تمہیں میرے اس بیان کی سچائی ضرور نظر آئے گی اور اس کے بعد تم مجھ سے رابطے کی کوشش نہیں کرو گے۔ میں نہیں چاہتی کہ اب ہم آمنے سامنے بیٹھ کر کوئی بات کریں۔ اسی لیے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ میں تم سے طلاق چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم بات نہیں بڑھاؤ گے اور میرا مطالبہ تسلیم کرلو گے۔ فقط فرزانہ!"

وہ خط شہزاد کو بھجوانے کے بعد فرزانہ نے اپنے پرس سے عارفین کے خطوط نکالے جو وہ اسی دن عارفین کے فلیٹ جا کر وہاں سے نکال لائی تھی۔

خطوط ایک جگہ جمع کر کے فرزانہ نے ماچس نکالی اور پھر ماچس کی ایک تیلی نے ان خطوط کو ایک چھوٹا سا الاؤ بنا دیا۔

"عارفین!" فرزانہ زیر لب بڑبڑائی۔ "تمہارے مقدس راز میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ اب میں خاموشی سے وقت کے دھارے پر بہتی رہوں گی۔ تم جب بھی رہا ہوئے' میں اگر اس وقت زندہ ہوئی تو تم مجھے اپنا منتظر پاؤ گے۔"

☼ ☼